جرمِ ظریفی

عطاء الحق قاسمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش کردہ
اندر کمار گجرال
سابق وزیر اعظم (ہند)

جرمِ ظریفی

عطاء الحق قاسمی

سنگِ میل پبلی کیشنز، چوک اردو بازار، لاہور

ضابطہ

۱۹۸۸ء

پبلشر ـــــ نیاز احمد

سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور

پرنٹرز ـــــ آر-آر پرنٹرز۔ لاہور

قیمت ـــــ ۹۰/۰۰ روپے

یاسرؔ، عمرؔ اور علیؔ کے نام

فہرست

عطائے خداوندی	سید ضمیر جعفری	۹
بھاگٹانوالہ ائرپورٹ		۱۲
بتیس سوالات		۱۶
بول میری مچھلی		۱۹
خوف		۲۲
ماسی مختیار		۲۶
دو محبِ وطن		۲۹
بھلے مانس		۳۱
ہدایت نامہ		۳۳
اصلی مصافحہ		۳۵
نارجہنم		۳۷
مولانا مودودی		۴۰
مہردین مالشیا		۴۳
بلاتمیز		۴۵
ایک ہوائی کالم		۴۷
مولوی صاحب		۵۱
علی سردار جعفری		۵۴
ہاتھ دکھانے والا		۵۶
پہچان		۵۸
رات کے گیارہ بجے		۶۰
نظر بدور		۶۲
احمد فراز سے چند ملاقاتیں		۶۴
ناشکری		۶۷
اشفاق نقوی		۶۹
غمگین سلیمان کا خط		۷۲
مارکس صاحب		۷۶
گم گشتہ		۷۸
اپنے جیسا امیدوار		۸۰
اخباری زنان خانے		۸۲
عیادت کرنا منع ہے!		۸۴
آپ کو کیا تکلیف ہے؟		۸۷
بے تکلفان شہر!		۹۰
سیٹ لیس ڈے		۹۲
ریاض خر دماغ		۹۴
ڈکار		۹۷
چوہدری اللہ وسایا		۹۹
اختر ممونکا		۱۰۲
داستان سرائے میں		۱۰۵
حورجنت میں کانپ جاتی ہے		۱۰۷
امریکہ کی غلامی		۱۱۰
چوتھے مارشل لا کی پہلی تقریر		۱۱۲
فیض صاحب		۱۱۵
حق دوستی		۱۱۸
شاہی دنگل		۱۲۱
چندے آفتاب		۱۲۳
مسافر نواز بہتیرے		۱۲۵
سفر آسان نہیں ہے		۱۲۸
خواتین		۱۳۰

عزیزی جارج فورمین ۱۳۳
صاحب کار اور صاحب اقتدار ۱۳۵
ڈاکٹر سلیم اختر ۱۳۷
ان ہاتھوں سے ۱۴۱
بیمار محبت ۱۴۴
خطرناک آدمی ۱۴۸
معصوم اجمیری ۱۵۲
رائٹرز گلڈ کنو اور انشائیہ ۱۵۷
باہمی دلچسپی ۱۵۹
زیر تربیت خوشامدی ۱۶۲
ایڈونچر ۱۶۴
ٹنڈا اور ٹھونگے ۱۶۸
حافظہ ۱۷۰
حاتم دوراں ۱۷۲
بچارا ۱۷۴
ظاہری آنکھ ۱۷۷
باگڑ بلا میاؤں پوری ۱۷۹
وکٹری اسٹینڈ ۱۸۱
ایک کیلنڈر ۱۸۳
خالد احمد ۱۸۶
منیر احمد شیخ ۱۹۰
بیجنگ میں دوسرا دن ۱۹۴
ماؤ کیپ ۱۹۷
چین کی سیاحی اور "سیاہی" ۲۰۰
پھنگیو۔ پھنگیو ۲۰۳
چینی قاعدہ ۲۰۶
خوشگوار ازدواجی زندگی ۲۰۹
عالمی طنز و مزاح کانفرنس ۲۱۲
طبیب اور مریض ۲۱۵
لو بلڈ پریشر ۲۱۷
پھوپھی امیر علی ۲۲۰
مجلس شوریٰ ۲۲۲
نکاح نامہ اور پستول ۲۲۴
جنگل کا بادشاہ ۲۲۷
قتل کرنے صحیح طریقہ ۲۳۰
تعزیتی شذرے ۲۳۳
غیر مطبوعہ خبریں ۲۳۵
"کفر" سے "اسلام" تک ۲۳۸
دوڑ دھوپ ۲۴۰
نفس امارہ ۲۴۲
مثالی بیوروکریٹ ۲۴۴
بودی پہلوان ۲۴۶
سو فیصد مفت ۲۴۹
پسپائی ۲۵۲
بھلے مانس اور وضع دار ۲۵۵
جامہ تلاشی ۲۵۸
مایوس مریض ۲۶۱
ایک داخلے کا سوال ۲۶۳
سارتر اور قیوم نظر ۲۶۵
درجہ بدرجہ دعا ۲۶۷
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو؟ ۲۶۹
نئے "ترقیاتی ادارے" ۲۷۱
چھینکنا کھانسنا کھو نہ گیا! ۲۷۴
چاچا منہ اڈ اور بھولا ڈنگر ۲۷۶
بیمار کا حال اچھا ہے؟ ۲۸۰
منادی ۲۸۳
شریف خواتین اور غزل ۲۸۵
"سودیشی" ٹیلی فون ۲۸۸
ہنسنے پر پابندی ۲۹۰
ڈوری سے بندھا شاہین ۲۹۳
ضمیر کی تلاش ۲۹۶
ہوئے تم دوست جس کے ۲۹۹
بخدمت جناب لیڈر صاحب ۳۰۱

عطائے خُداوندی

—— سید ضمیر جعفری ——

اب کچھ یاد نہیں آرہا کہ عطاء الحق قاسمی سے پہلی مرتبہ کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی البتہ ایک بات یاد ہے کہ اس کی ذات میں ظرافت کا چشمہ ابلتا محسوس ہوتا تھا۔ اس کی گفتگو اتنی چمکدار تھی کہ وہ دوزخ میں سے بھی خلد کا راستہ ڈھونڈ لیتا۔ اس کا کوئی جملہ ایسا نہ تھا جو غم ایام کے سر پر دو ٹوکرے مٹی نہ ڈال جاتا ہو۔ بعد کی ملاقاتوں میں یہ تاثر مزید گہرا، تہرا ہوتا چلا گیا۔ اس میں ایک ایسا شخص ملا جس سے محبت واجب ہو جاتی ہے۔

میں اخبارات کے مزاحیہ کالموں کو اردو کے مزاحیہ ادب کا دست و بازو بلکہ بازوئے شمشیر زن سمجھتا ہوں۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ اچھی غزل کی طرح اچھا کالم بھی کم کم لکھا جاتا ہے۔ بہر حال میرے نزدیک ان کالموں نے ہمارے مزاحیہ ادب کی آبیاری اور طرحداری میں بڑا نمک آفریں حصہ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس حقیقت کے بغیر اردو مزاح نگاری نہ اتنی "بچل سرمست" ہوتی اور نہ وہ انسان اور زندگی کے اتنی قریب ہوتی جتنی کہ اب ہے۔ اخبارات کے شگفتہ کالموں کے بغیر میرا اعتقاد ہے، بے شمار مسکراہٹیں، اجنبی کبوتروں کی طرح بستی سے باہر شہتوتوں اور بیریوں کے درختوں پر ہی جھومتی رہتیں اور ان گنت مسرتیں مکانوں کی اونچی منڈیروں سے گھروں کے آنگنوں میں بھی اترنے نہ پاتیں۔

دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح کرنا اور سب سے آسان کام دوسروں پر تنقید کرنا ہے۔ بعض لوگ اتنی سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں کہ ادب پری چہرہ لوگوں کی اتنی مورچھل برداری کیوں کرتا ہے۔ ادب محبوب کے رخساروں کی ٹوٹ ٹوٹ کر بلائیں لے یا والہانہ سرمستی میں اس کے گیسوؤں میں کنگھی کرے، حسینوں کی روٹی پکائے یا ان کا بستر بچھائے، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن ادب کا یہی ایک وظیفہ تو نہیں کہ وہ بارہ مہینے گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے حقہ پیتا رہے۔ اس میں ظالم کی کلائی مروڑنے کی کچھ ہمت بھی ہونی چاہئے۔ اس "ہلاشیری" میں صحافتی کالموں کی آواز سب سے بلند سنائی دیتی ہے۔ زندگی کی خوبیاں اور خامیاں ادب کا مواد ہیں۔

حسین چیزوں کی طرح حسین کالموں کی بھی اتنی مختلف صورتیں ہیں کہ ہر صورت پہ دم نکلے۔ عملاً دم کس پر نکلتا ہے، اس کا فیصلہ اپنی اپنی پسند پر منحصر ہے۔ کسی کو نرگسی آنکھ پسند، کسی کو نرگسی کوفتہ۔ میں ذاتی طور پر خوش خلق، ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے کالم کو پسند کرتا ہوں جو زخموں کی نشاندہی کرے، زخموں کی نمائش نہ لگائے۔ گلی کوچوں میں مچھر مارے یا جمہوریت کی لالٹین اٹھائے ہوئے پھرے۔ اس کا اپنا سراپا اور پبلک

سے اس کا "ورتارا" شریفانہ و شگفتہ ہونا چاہئے۔ کالم آرائی میں اگر عالم آرائی نہیں..... تیشے سے بربط کو ہسار بجانے کی لنک نہیں..... اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں..... تو وہ اداریہ ہے۔ شذرہ ہے، جواب مضمون ہے۔ انشائیہ ہے۔ اونٹ کے منہ میں زیرہ ہے، مگر کالم نہیں ہے، کالم "ثقہ" مگر "پھکّا" نہ ہو۔ باوقار کے ساتھ ساتھ دل بہار۔ جس طرح کوئی اجل عالم۔ اپنی دستار اور کتابوں کا تھیلا میدان کے کنارے رکھ کر محلے کے چھوکروں کے ساتھ فٹ بال یا گلی ڈنڈا کھیلنے لگ جائے۔ قلم بے شک ٹہلتا ٹہلتا چلے۔ دائیں بائیں گھومے۔ ادھر ادھر ڈھلکے، لڑھکے۔ جھانکتا پھانکتا جائے مگر کسی منزل کی طرف چلے۔ اگرچہ ہم اس منزل کو بھی قابل التفات نہیں سمجھتے کہ جس کی کھجوریں اور خیمے پہلی سطر ہی میں سامنے کھڑے نظر آ جائیں۔

کالم کو جرنیلی سڑک پر نہیں، پگڈنڈیوں پر چلنا چاہئے۔ وہ گرجے کم، برسے زیادہ۔ ان توقعات پر وہی کالم پورا اترتا ہے، جو توقعات سے بے نیاز ہو کر لکھا جاتا ہے اور عطاء الحق قاسمی کا یہی وہ بے نیازانہ انداز ہے، جس کی صحت اور زندگی کی دعا دوست دشمن دونوں مانگتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی معاشرتی، معاشی، سیاسی کوتاہیوں اور ناہمواریوں کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہے۔ ظالم اور مظلوم کی نشاندہی، اس کے کالموں میں جا بجا نظر آتی ہے بعض اوقات تو وہ آستینیں چڑھائے، ڈنڈا اٹھائے، برے کو اس کے گھر تک چھوڑ آتا ہے لیکن اس ساری کارروائی میں وہ اپنے قاری کو بدمزہ یا ماحول کو افسردہ نہیں ہونے دیتا۔ اس کا غصہ ایک ایماندار شخص کا غصہ ہے، جو آتا بھی جلد ہے اور جاتا بھی جلد ہے۔ وہ جہاد کرتا ہے، فساد نہیں کرتا۔ طنز کو وہ عینک کی طرح نہیں پہنتا کہ اپنے چہرے کے سوائے سب کچھ نظر آئے۔ اس کا دھاوا دفاعی اور رفاہی ہوتا ہے۔ اس کے کالموں کی مقبولیت کا راز اس کے "سوادلے" طرز تحریر میں مضمر ہے، جس کا مزاج طبیبانہ نہیں حبیبانہ ہے۔ اور ہاں اس کی نثر میں کارفرما جز آتی کا وہ طلسم بھی موجود ہے، جو نثر کے ایک عام ٹکڑے کو ادب کی پرت عطا کر دیتا ہے، جس کو میر تقی میر نے شعور سے، جنوں کرنا کہا ہے۔

میری دانست میں کالموں کو چار قومیتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بنجر، بارانی، چاہی اور نہری۔ بنجر کالم محض رقبہ گھیرتا اور وقت ضائع کرتا ہے۔ بارانی کالم میں ہریالی کم اور خشکی زیادہ ہوتی ہے۔ مینہ کا چھینٹا پڑ گیا تو کوئی شگوفہ نکل آیا۔ ورنہ موعظ و پند کی حدت۔ لو جھکڑ بجھے ہوئے کھیت، اڑتی ہوئی ریت۔ ان کی گرمی سے چٹانیں اور ان کی خشکی سے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔

کالموں کی بہترین صورت چاہی اور نہری کالموں میں نظر آتی ہے۔ البتہ چاہی میں بہاؤ کم اور کھنچاؤ زیادہ ہوتا ہے۔ مطالب باریک نکات؟ سوئی کے ناکے میں سے اونٹ اور رجب علی بیگ سرور دونوں کو اکٹھے گزرتا دیکھ لو۔ علم گہرا، فلسفہ گھنا، محاورہ بیسن میں تلا ہوا۔ شگفتگی کبھی آئی ہوئی، کبھی لائی ہوئی، کپڑا معمولی۔ سلائی چست، بٹن روشن، زبان کھلی ہوئی کم دھلی ہوئی زیادہ۔ حرف جلیل، ظرف قلیل۔

جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا

نہری کالم..... لبالب بھری ہوئی کشادہ نہر کی طرح رواں دواں چلتا ہے۔ گاتا، گنگناتا، شادابی پھیلاتا،

گرد و پیش کو آئینہ دکھاتا...... انگنا کم، چھلکتا زیادہ، اپنے پہاڑوں اپنے دریاؤں کا پانی۔ روانی میں جوانی۔ حقائق بلبلے، پتھر پانی۔ افسانہ و حقیقت ہم آغوش۔ بچے کم، خوشحال گھرانہ۔

عطاء الحق قاسمی کے اکثر و بیشتر کالم نہری ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جہاں پانی ہو گا، اتار چڑھاؤ بھی ہو گا۔ بالائی منطقوں میں اگر برف پگھل جائے گی تو لہروں میں شکن بھی آ جائے گی۔ سیاست کا کوئی گلیشیر ٹوٹ گیا تو کنارے بھی ٹوٹ جائیں گے۔ مگر یہ عجیب نہر ہے کہ اس کا پانی برسات میں بھی گدلا نہیں ہوتا۔ اس نوع کے کالم جاگتے دل اور اونگھتی آنکھوں سے لکھے جاتے ہیں۔

جن لوگوں نے اردو کے عظیم اور امر کالم نویس مولانا چراغ حسرت کو دیکھا ہے انہوں نے مولانا کو عموماً اونگھتے ہی دیکھا۔

اردو کے منفرد کالم نگاروں کی فہرست بڑے بڑے پہاڑ ناموں سے بھری ہوئی ہے۔ ان پہاڑوں کے بیچوں بیچ اپنی کوئی الگ روش تراشنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر "روزن دیوار سے" ہم جمیل بادلوں کے ایک ایسے جھرمٹ کو بڑی تیزی سے اشکال پذیر ہوتا دیکھ رہے ہیں، جو کسی تحریر کی مخصوص چھاپ کہلاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی تحریر باریک چنائی کی تحریر ہے۔ اس میں کوئی دراڑ، کائی یا "بھوبھل پن" نہیں ہے۔ اس کے جملے، رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، فوج کے جوانوں کی طرح قدم ملا کر چلتے ہیں اور حیرت اس بات پر ہے کہ اس عمل میں فاصلہ زیادہ طے کرتے ہیں اور گرد کم اڑاتے ہیں۔ اس کی سوچ بشاشت میں گھلی اور صداقت میں تلی ہوتی ہے۔ اس کی طبیعت کی بے اندازہ شگفتگی کالم کی ایک دن کی زندگی کو شیر کی زندگی بنا دیتی ہے اور اس کی روایتی "دقیقیت" میں عصری تاریخ کی ایک تصویر متحرک ہو جاتی ہے۔

آرٹ اپنی سرشت میں خاصی بدلحاظ، بے مقصد اور بے لگام چیز ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے جس کمال قدرت سے اس وحشی کو رام کیا ہے، اس پر وہ داد کا مستحق ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ کالموں کے پرانے کھدے ہوئے مورچوں میں جا کر کالم لکھتا وہ کالموں کو کھینچ کر اپنی پسند کے محاذ پر لے آیا ہے۔ جس سے کالم کی چھب کے علاوہ، اس کی نشست و برخاست کا انداز بھی بدلا بدلا نظر آتا ہے یہ "اجنبیت" کے مقابلے میں "اپنائیت" کا عمل ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ عطاء کے کالموں میں اردو کالم نگاری نے پہلی مرتبہ انگرکھا اتار کر گلے میں پٹکا اوڑھنا سیکھا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اردو میں اس قسم کا "بودیاں والا" اور "توندڑاں والا" "بلھتے شاہیاں" کرتا ہوا گھبرو کالم، جو پاکستان کی مٹی میں "ملاولا" رہتا ہے اور ہمارے کھیتوں میں اگنے والی کپاس کے پھولوں کی طرح ہنستا ہے، شاید کسی نے نہیں لکھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میرے دوست انتظار حسین ساہیوال یا جہلم میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کا کالم بھی یہی بولی بولتا۔

تحریر میں سمت کی اہمیت کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ عطاء الحق پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں پر غیر متزلزل ایمان رکھتا ہے۔ اس محاذ پر اس کے کالم "عسکری کالموں" کی طرح نبرد آزما رہتے ہیں اس اعتبار سے عطاء کے کالم اردو ادب میں "بی آر بی نہر" کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ، جو بہ جو!

بھاگٹانوالہ ائیرپورٹ

سرگودھا جانے کے لئے میں نے بریفنگ ہال میں کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی خاتون کو اپنا ٹکٹ تھماتے ہوئے کہا "سیٹ، سموکنگ ایریا میں دیجئے!" خاتون نے بورڈنگ کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میں نے سیٹ کا نمبر نہیں لکھا، جس جہاز میں آپ جا رہے ہیں، اس میں توازن برقرار رکھنے کے لئے پی آئی اے کا عملہ مسافروں کو خود "موقع" پر بٹھاتا ہے!"

میرے ہاتھ سے بورڈنگ کارڈ گرتے گرتے بچا۔ یا خدا! یہ کون سا جہاز ہے، جس میں توازن برقرار رکھنے کے لئے اتنی احتیاطی تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں؟

اور جب رن وے پر کھڑے دیوہیکل جہازوں کے پاس سے گزرتے ہوئے پی آئی اے کی بس نے ایک جہاز نما چیز کے پاس اتارا تو اسے دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے جہاز کے بچے نکلوائے گئے ہوں۔ یہ جہاز ویگن سے بڑا نہیں تھا اور بھیگی بلی کی مانند یوں سر جھکائے کھڑا تھا جیسے اپنی جسامت پر خود بھی شرمندہ ہو۔ اس مخلوق کے دھان پان ہونے کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں داخل ہونے کے لئے علیحدہ سیڑھی لگانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، اس کے دروازے ہی میں چار والی سیڑھی رفٹ تھی، یہ دروازہ کھول کر زمین سے لگا دیا گیا تھا، جسے مسافروں کے اندر داخل ہو جانے کے بعد واپس اوپر اٹھا کر اسی طرح بند ہو جانا تھا!

میں جہاز میں داخل ہوا تو ایک بار پھر اندازہ ہوا کہ میں ویگن میں ہوں، چودہ چھوٹی چھوٹی سیٹیں اور نیچی چھت، جس سے میرا سر ٹکرا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا بریف کیس نیچے رکھا اور ایک خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ جہاز کے "کلینز" نے جو مرغابنا مسافروں کو ان کی نشست پر بٹھا رہا تھا، مجھے گھور کر دیکھا اور ایک دوسری نشست کی طرف اشارہ کر کے کہا "آپ یہاں بیٹھ جائیں! توازن کا مسئلہ ہے!" میں چپ چاپ اپنی جگہ سے اٹھا اور "کلینز" کی بتائی ہوئی نشست پر بیٹھ گیا مگر صورتحال۔

اڑنے سے پیشتر ہی میرا رنگ زرد تھا

والی تھی! یا اللہ اپنا کرم کر!

"کلینز" نے مسافروں کو ان کی نشستوں پر بٹھانے کے بعد ایک دفعہ ان کی گنتی کی اور جہاز سے باہر نکل آیا، اس نے دروازہ (جو سیڑھی کا کام دے رہا تھا) اٹھا کر بند کیا، جہاز کی باڈی پر "چلو" کہہ کر زور سے ہاتھ مارا اور ہمیں خدا کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا!

اب یہ "جہاز" ایک زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ رن وے پر دوڑ رہا تھا' اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر جی چاہا کہ "ڈرائیور" سے کہوں "بھائی ڈرائیور ہولی چلا" مگر میں نے خود کو سنبھالا اور آیات مقدسہ کے ورد میں مشغول ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ یہ جہاز رن وے پر اسی طرح کچھ دیر دوڑنے کے بعد ہانپتا کانپتا دوبارہ واپس اپنی جگہ پر آن کھڑا ہو گا مگر میرا یہ واہمہ درست ثابت نہ ہوا کہ کچھ دیر بعد یہ فضا میں تھا!

میں جہاز میں حفاظتی پیٹی باندھنے میں عموماً سستی سے کام لیتا ہوں' مگر یہاں میں نے یہ پیٹی اتنی کس کر باندھی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ اب میں ذہنی طور پر خوفناک جھٹکوں حتیٰ کہ کسی بڑے حادثے کے لئے بھی تیار ہو چکا تھا۔ سرگودہا کا سفر مجھے ویسے بھی راس نہیں آتا۔ ایک دفعہ ویگن میں سرگودہا جاتے ہوئے ہماری ویگن سامنے سے آنے والی ایک بس سے جا ٹکرائی۔ دوسری دفعہ کار میں سرگودھے سے واپس آتے ہوئے ایک خوفناک حادثے سے بال بال بچے اور اب یہ تیسرا موقع تھا! اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنے "سرگودھوی دوستوں" کو معاف نہیں کرتا۔

اس جہاز کا نام "ٹوئن ٹوٹر" تھا جو اس وقت لاہور شہر پر بہت نیچی پرواز کر رہا تھا۔ میں نے پہلی دفعہ لاہور کو اتنے قریب سے دیکھا اور اتنی محویت سے دیکھا جیسے آخری دفعہ دیکھ رہا ہوں' مجھ پر رقت سی طاری ہو گئی۔

"یہ وہی جہاز ہے!" میرے برابر میں بیٹھے ہوئے مسافر نے مہمل سا جملہ کہا۔ وہ چہرے سے خالص پنجابی لگ رہا تھا اور پان چباتے ہوئے ویسے ہی لگ رہا تھا جیسے کوئی پنجابی پان چباتے ہوئے لگتا ہے!

"وہی جہاز سے آپ کی کیا مراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ نہیں جانتے؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"نہیں!"

"جناب! یہ ایک دن رن وے پر کھڑا تھا کہ تیز آندھی چلنا شروع ہو گئی اور پھر آپ کو پتہ ہے کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

"یہ جناب اپنی جگہ سے اٹھا اور کافی پرے کھڑے ڈی سی ٹین کے اوپر جا گرا!!" اس پان خور نے ہنستے ہوئے کہا۔

"واقعی؟" میں نے سہم کر کہا۔

"ہاں جی..... ڈیڑھ مہینے تک اس کی پروازیں معطل رہی ہیں' یہ تو پی آئی اے والوں کا "کمال" ہے کہ انہوں نے اسے اب دوبارہ چلا دیا ہے کسی اور ملک میں ہوتا تو کوڑ کباڑ والوں کے سپرد کر دیا جاتا۔"

میں نے ایک بار پھر آیات مقدسہ کا ورد شروع کر دیا

"آپ کو ایک اور بات بتاؤں!"

"کیا کوئی بہت ضروری بات ہے؟"

"ہاں جی!"

"چلیں پھر بتائیں!" میں نے اپنی سانس روک کر کہا۔

"جس کمپنی نے یہ جہاز بنایا تھا نا!"

ہاں"

"وہ کمپنی کب کی بند ہو چکی ہے، وہ یہ بزنس ہی چھوڑ گئی ہے!"

میرا جی چاہا کہ میں اس مسافر کے پاس سے اٹھ جاؤں اور کسی دوسری نشست پر جا بیٹھوں، مگر پھر جہاز کے توازن بگڑنے کے خیال سے اپنی نشست پر دبکا رہا! اور پھر میرے ساتھ میرا بریف کیس بھی تھا جسے اٹھانے سے بھی اس کا توازن بگڑ سکتا تھا۔

"اور کوئی بات؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

وہ میری بات سن کر ہنسا اور اس نے کہا "جہاز کے باہر آپ نے پی آئی اے لکھا ہوا دیکھا تھا؟"

"ہاں دیکھا تھا، مگر وہ تو سارے جہازوں پر لکھا ہوتا ہے اور اس کا مطلب پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز ہے!"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" مسافر نے کہا "مگر اس جہاز پر جو پی آئی اے لکھا ہے، اس کا مطلب "پلیز انفارم اللہ" ہے!"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پیشتر اس کے کہ میں اسے اس بے موقع ہنسی پر ٹوکتا، جہاز ایک جھٹکے کے ساتھ سینکڑوں فٹ نیچے چلا گیا!

"یا اللہ خیر!" میں نے بے ساختگی سے کہا۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں، انشاءاللہ کچھ نہیں ہو گا!" مسافر نے کہا "ایسے چھوٹے موٹے جھٹکے تو لگتے ہی رہتے ہیں، مگر آج تک اس جہاز کو کوئی بڑا حادثہ پیش نہیں آیا! اس کا اللہ تعالیٰ سے براہِ راست رابطہ ہے"۔

تھوڑی دیر بعد پرواز ہموار ہو گئی اور میں نے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

"مجھے یہ جہاز بہت عزیز ہے" مسافر نے کہا۔

"وہ کیوں؟" میں نے اس بے تکے مسافر سے پوچھا۔

"ایک تو یہ چھوٹا سا ہے، چند مسافر ہیں، یوں لگتا ہے ایک خاندان کے افراد اپنے گھر کے لاؤنج میں بیٹھے ہیں"۔ یہ کہہ کر اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر کہا "دوسرے اس میں ایئر ہوسٹس بھی نہیں ہے۔ آپ نے پی آئی اے کی ہوسٹسز دیکھی ہیں نا!"

اس دفعہ میں بھی اس کی ہنسی میں شریک تھا۔

"اس جہاز کو پسند کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے" اب کے وہ سنجیدہ تھا "اس کی پرواز دوسرے جہازوں کی نسبت بہت نیچی ہے۔ آپ نے دیکھا لاہور پر سے گزرتے ہوئے سارے منظر کتنے صاف تھے۔ گھروں کی چمنیوں سے نکلنے والا دھواں بھی نظر آ رہا تھا۔ بادشاہی مسجد کے صحن میں لوگ چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے، مینار

پاکستان اپنی پوری سربلندی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ دریائے راوی کے پل پر چلتی ہوئی کاریں ڈِنکیوں کی بجائے کاریں ہی دکھائی دے رہی تھیں ' یہ وہ جہاز ہے جو فضا میں پرواز کرتے ہوئے بھی زمین سے اپنا رشتہ برقرار رکھتا ہے! "

یہ شخص اچھی باتیں کر رہا تھا' سو اب مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ "اور اب دیکھیں ' سرگودہا آنے والا ہے ' ایئرپورٹ شہر سے ۲۵ کلومیٹر دور چک بیس میں ہے جو ایک قصبے بھاگٹانوالہ کے قریب واقع ہے ' چنانچہ ایئرپورٹ کا نام اسی قصبے پر ہے۔ آپ کھڑکی سے باہر دیکھیں ' کس قدر خوبصورت نظارہ ہے! "

اور باہر منظر واقعی بہت خوبصورت تھا ' جہاز گھنے باغات اور کھیتوں پر سے گزرتا ہوا لینڈ کرنے کے لئے نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں بہت دیر تک یہ منظر دیکھتا رہوں ' چنانچہ میں نے اپنی نظریں اس وقت تک زمین کے خوبصورت نظاروں پر جمائی رکھیں جب تک جہاز لینڈ نہ کر گیا۔

جہاز کھیتوں سے چند گز کے فاصلے پر پکی اینٹوں کے فرش پر کھڑا تھا دروازے کو کھول کر دوبارہ سیڑھی بنادیا گیا۔ ہم ایک چک میں کھڑے تھے جہاں ایئرپورٹ کی چھوٹی سی عمارت تھی۔ اس پر "بھاگٹانوالہ ایئرپورٹ" لکھا تھا۔ بالکل سامنے لوہے کا ایک جنگلہ تھا اور جنگلے کے پار ایک سنسان سڑک نظر آ رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف دو کاریں کھڑی تھیں جن میں سے ایک میری منتظر تھی ' جس نے مجھے پھلروان لے جانا تھا!

" آپ سے مل کر مجھے حقیقتاً بہت خوشی ہوئی " میں نے اپنے ہم سفر سے رخصت ہونے کے لئے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا " اگر آپ نہ ہوتے تو میرا سارا سفر سہمے ہوئے گزرتا کیونکہ جہاز کی حالت بہت ڈرا دینے والی تھی "۔

" ڈرا دینے والی حالت تو ہمارے ملک کی بھی ہے " مسافر نے الوداع ہوتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ " اسی جہاز کی طرح چھوٹا سا خدشات سے بھرا ہوا اور محدود وسائل کا حامل ہمارا ملک! مگر آپ اس کے مستقبل سے مایوس نہ ہوں بس حفاظتی اقدامات ملحوظ رکھیں اور ہاں یہ واحد پرواز ہے جس کا رشتہ آسمان اور زمین دونوں سے برقرار ہے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو! "

۱۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء

بتیس سوالات

ذیل میں ہم صدر پاکستان ' وزیر اعظم پاکستان ' گورنر صاحبان وزرائے اعلیٰ وفاقی و صوبائی وزرائے کرام سینٹرز ایم این اے اور ایم پی اے حضرات کیلئے سوالنامہ درج کر رہے ہیں ' ان سے درخواست ہے کہ وہ براہ کرم ان سوالات کا ہاں یا نہ میں جواب دیں ' سوالنامہ حسب ذیل ہے!

(۱) ...... ☆ کیا آپ نے اپنی زندگی کے کسی دور میں ویگن میں سفر کیا ہے اور کیا اگر آپ کو ان دنوں ایک ماہ ویگن پر سفر کرنا پڑے تو آپ یہ گوارا کر لیں گے؟

(۲) ...... ☆ آپ کبھی سائیکل پر سوار ہوئے ہیں اور کیا آپ کے کتے کبھی فیل ہوئے ہیں؟

(۳) ...... ☆ اگر آپ گاؤں میں پڑھے ہیں تو کیا آپ کو بھی چلچلاتی دوپہر میں کئی میل پیدل چل کر سکول جانا پڑتا تھا اور پھر اسی طرح پیدل واپس آتے تھے؟

(۴) ...... ☆ کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ کے گھر میں چولہا نہ جلا ہو اور یوں آپ کو فاقہ کرنا پڑا ہو؟

(۵) ...... ☆ کیا بچپن میں آپ کو کسی ورکشاپ وغیرہ میں ننھے منے ہاتھوں سے کام کرنا پڑا؟

(۶) ...... ☆ آپ کو اپنی ابتدائی زندگی میں نوکری کے حصول کیلئے کتنے دروازوں پر دستک دینا پڑی ' دوسرے لفظوں میں کیا طویل عرصے تک آپ نے بے روزگاری کا زہر چکھا ہے؟

(۷) ...... ☆ کیا آپ کے عزیز و اقارب میں سے کسی نے محض دوا کیلئے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے کبھی انتقال تو نہیں کیا؟

(۸) ...... ☆ کیا آپ رمضان کے مہینے میں سحری کے وقت گلیوں میں نعتیں پڑھتے ہوئے لوگوں کو جگانے کیلئے نکلتے رہے ہیں؟

(۹) ...... ☆ کیا عید میلاد النبی کے جلوس میں آپ بھی کبھی عربی لباس پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر جلوس کے آگے آگے چلے ہیں؟

(۱۰) ...... ☆ آپ نے کبھی تندور پر بیٹھ کر روٹی کھائی ہے؟

(۱۱) ...... ☆ آپ کبھی تندور پر روٹیاں لگوانے گئے ہیں؟

(۱۲) ...... ☆ کیا آپ کبھی چوپال میں گئے ہیں اور آیا آپ بھی اس تجربے سے دوچار ہوئے ہیں کہ چودھری چارپائی پر بیٹھا ہو اور آپ کو زمین پر جگہ ملی ہو؟

(۱۳) ...... ☆ کیا آپ نے کبھی بازار میں کھڑے ہو کر ایک روپے کی حلیم اور آٹھ آنے کا نان لے کر کھایا ہے

(١٤) ...... ☆ خشک میووں اور مٹھائیوں میں سے لوک اور نگدی وغیرہ کے ذائقے سے واقف ہیں؟

(١٥) ...... ☆ کیا کبھی میلہ چراغاں میں بھنگڑا ڈالا ہے اور بولیاں گائی ہیں؟

(١٦) ...... ☆ سینما میں ٹکٹ لینے کیلئے قمیص اتار کر اور لوگوں کے کاندھوں پر سے ہوتے ہوئے آپ کبھی کھڑکی تک پہنچے ہیں؟

(١٧) ...... ☆ حضوری باغ میں کبھی "کن ٹٹوں" کا مشاعرہ سنا ہے؟

(١٨) ...... ☆ بچپن میں "بالو کڑیو پھلیاں ونڈی دیاں لے جاؤ" کی آواز پر کبھی آپ بھی بھاگے گئے ہیں اور "بھائی میٹوں دے" ۔ بھائی میٹوں دے" کی آوازیں لگائی ہیں؟

(١٩) ...... ☆ بچپن میں کسی آئس کریم کی دکان پر تو ملازمت نہیں کی اور یہ تجربہ تو نہیں ہوا کہ کار کے ہارن پر دوڑے دوڑے جائیں اور کار میں بیٹھے ہوئے بچوں کیلئے آئس کریم لے کر آئیں اور اپنے آنسو آنکھوں سے باہر نہ آنے دیں؟

(٢٠) ...... ☆ کیا آپ کا بڑا بھائی یا بہن آپ کو گود میں اٹھا کر مسجد کے باہر کھڑے ہوتے تھے تاکہ مسجد سے نکلتے ہوئے نمازیوں سے دم کرائیں؟

(٢١) ...... ☆ کبھی کسی جلسے یا مسجد میں دریاں بچھائی ہیں؟

(٢٢) ...... ☆ کبھی تانگے میں بیٹھ کہ 'پورے شہر میں لاؤڈ سپیکر سے جلسے کا اعلان کرتے رہے ہیں؟

(٢٣) ...... ☆ کیا کبھی کسی لیڈر کو کاندھوں پر بٹھا کر میل دو میل کا فاصلہ طے کیا ہے؟

(٢٤) ...... ☆ کسی ایک کمرے کے مکان میں دس افراد کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے؟

(٢٥) ...... ☆ کبھی گرمیوں میں بنیان اتار کر گلی میں سونے کا تجربہ ہوا؟

(٢٦) ...... ☆ بکرے کو مہندی لگا کر داتا دربار سلام کروانے گئے ہیں؟

(٢٧) ...... ☆ کیا آپ کبھی ڈھانگری اٹھا کر پتنگ کے پیچھے بھاگے ہیں، کبھی اس میں ترانویں ڈالی ہیں یا اسے کنی دی ہے؟

(٢٨) ...... ☆ کبھی پانی کے حصول کیلئے میلوں پیدل تو نہیں جانا پڑا؟

(٢٩) ...... ☆ کوئی بچی محض جہیز ہونے کی وجہ سے گھر میں تو نہیں بیٹھی رہی"

(٣٠) ...... ☆ روٹی کمانے کیلئے بیوی بچوں کو اللہ کے سپرد کر کے "دوبئی" تو نہیں جانا پڑا؟

(٣١) ...... ☆ بازار کے چوک میں کُوچی اور سفیدی والا ڈبہ پکڑ کر پنجوں کے بل بیٹھ کر روزی کا انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟

(٣٢) ...... ☆ کبھی ایسا تو نہیں ہوا کہ بازار سے گزرتے ہوئے بچوں کیلئے موسم کا پھل خریدنے کو جی چاہئے اور خرید نہ سکے ہوں؟

سوالات کی فہرست ابھی بہت طویل ہے، مگر فی الحال بتیس ہی کافی ہیں، ان سوالات میں نوے فیصد

پاکستانی عوام کے مسائل اور ان کے مشاغل پوشیدہ ہیں' اگر پاکستانی عوام کے مسائل حل کرنے اور ان کی نمائندگی کرنے والے حضرات بھی ان مسائل اور مشاغل کے سلسل میں ہاں کہتے ہیں تو انہیں حکومت کا حق ہے او ر اگر یہ سوالات ان کے ذہن میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تو پھر پاکستان بھی دوسرا جنوبی افریقہ ہے' جہاں "سیاہ فام" اکثریت' پر سفید فام اقلیت حکومت کر رہی ہے۔

۱۸/ اکتوبر/۱۹۸۶ء

بول میری مچھلی!

میں نے مچھلیاں پکڑنے کے لئے دریا میں کنڈی ڈالی اور پھر مچھلی کے انتظار میں سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد کنڈی میں حرکت ہوئی' میں نے فوراً ایک جھٹکے سے اسے اوپر کی طرف کھینچا' مگر میں نے دیکھا کہ نہ صرف یہ کہ کوئی مچھلی پھنسی نہیں بلکہ کنڈی کے ساتھ لگا گنڈویا بھی غائب تھا۔ میں نے ایک اور گنڈویا کنڈی میں پھنسایا اور ڈوری دریا میں پھینک دی اور ایک دفعہ پھر بگلا بھگت بن کر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے "اُباسیاں" آنے لگی تھیں' مگر مچھلی تھی کہ پھنسنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ اتنے میں امید کی ایک ہلکی سی کرن نمودار ہوئی یعنی ڈوری میں ایک بار پھر حرکت پیدا ہوئی' میں نے فوراً اسے اپنی طرف کھینچا مگر اس دفعہ بھی نہ صرف یہ کہ اس میں مچھلی کوئی نہیں تھی بلکہ وہ گنڈویا بھی غائب تھا' جو میں نے کنڈی کے ساتھ اس غرض سے پھنسایا تھا کہ یہ مچھلی کی خوراک بنے گا اور اس کے ذریعے مچھلی میری خوراک بنے گی' اب مجھ پر جھنجھلاہٹ سی طاری ہونے لگی تھی' ایک تو اس خیال سے کہ اتنی دیر میں کوئی مچھلی نہیں پھنسی تھی اور دوسرے یہ سوچ کر کہ مچھلیاں مجھے بے وقوف بنا رہی تھیں۔ وہ اس صفائی سے گنڈوئے پر ہاتھ صاف کرتی تھیں کہ خود کنڈی کی زد میں آنے سے بچ جاتی تھیں' بلکہ تیسری دفعہ جب ڈوری میں حرکت ہوئی اور میں نے اسے اپنی طرف کھینچا تو مجھے مچھلیوں کے ہنسنے کی آواز بھی آئی۔ مجھے ان کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ سب مل کر میری توہین کر رہی ہوں۔ مگر میں نے ایک بار پھر اپنے غصے پر قابو پایا' میں دراصل جان گیا تھا کہ غصے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا چنانچہ میں نے اس کا سیاسی حل تلاش کرنا شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد میں یہ حل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے ڈوری دریا میں سے نکالی' اسے اپنے تھیلے میں بند کیا اور مترنم آواز میں گانا شروع کر دیا۔

ہرا سمندر گوپی چندر

بول میری مچھلی کتنا پانی

مجھے یوں لگا جیسے یہ گیت میرے علاوہ کسی نے نہیں سنا حتیٰ کہ اس جنگل میں مجھے اس کی بازگشت بھی سنائی نہ دی۔ میں نے ایک بار پھر اپنا سارا ترنم یکجا کیا اور آواز میں سوز پیدا کرتے ہوئے کہا۔

ہرا سمندر گوپی چندر

بول میری مچھلی کتنا پانی

مگر اس بار بھی دریا میں مکمل خاموشی تھی' تیسری بار میری آواز میں واقعی غم کا عنصر پیدا ہو گیا اور یہ غم احساس

شکست کی وجہ سے پیدا ہوا تھا چنانچہ جب میں نے اس دفعہ

ہرا سمندر گوپی چندر
بول میری مچھلی کتنا پانی

کہا تو میری آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک ساتھ بہت سی مچھلیاں دریا کی سطح پر نمودار ہوئیں۔ انہوں نے کچھ دیر کے لئے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر انہوں نے "کھڑ کلیاں" مار کر ہنسنا شروع کر دیا۔ جب وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کھل کر ہنس چکیں تو ان میں سے ایک مچھلی نے پھدک کر ساحل کے قریب آتے ہوئے کہا "یہ تم کیا بے معنی سا گیت گا رہے ہو' تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ سمندر نہیں دریا ہے اور دوسری بات یہ کہ یہ ہرا نہیں ہے...... تم اس قسم کے رجعت پسندانہ سلوگنز سے اب ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتے" اس کے ساتھ ہی اس مچھلی نے حلق کی پوری قوت سے

سرخ ہے سرخ ہے ایشیاء سرخ ہے

کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ میں نے اس مچھلی سے کہا "میں نے تمہاری بات سن لی ہے' لیکن اگر تم میری بات بھی سن لو' تو شاید ہم کسی نتیجے پر پہنچ جائیں" بیشتر اس کے کہ یہ مچھلی کوئی جواب دیتی' ایک اور مچھلی نے پھدک کر پانی سے اپنا سر باہر نکالا اور کہا "تمہارے قول اور فعل میں تضاد ہے ایک طرف تم "ہرا سمندر" کہہ کر ہمیں امن اور سلامتی کا تصور دے رہے ہو' مگر دوسری طرف تم ہمیں شکار کرنے کے لئے کنڈی بھی دریا میں ڈالتے ہو" اور پھر اس کے ساتھ ہی اس نے

المدد المدد یا خدا خدا

کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اس مچھلی سے کہا "میں نے تمہاری بات سن لی ہے لیکن اگر تم میری بات بھی سن لو' تو شاید ہم کسی نتیجے پر پہنچ جائیں" مگر اس نے پانی میں غوطہ لگایا اور دریا کی تہہ میں چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی دوسری مچھلیاں بھی غوطہ مار کر نظروں سے غائب ہو گئیں۔

اب میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ میں ان نافرمان مچھلیوں کو ان کے کئے کی پوری سزا دیتا۔ چنانچہ میں نے کنڈی تو تھیلے ہی میں رہنے دی' اور اس کی جگہ ایک بڑا سا جال نکال کر دریا میں پھینک دیا اور ایک دفعہ پھر سگریٹ لگا کر مچھلیوں کے پھنسنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ دریا میں سے کھسر پھسر کی آوازیں آ رہی ہیں اور پھر یہ آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں۔ مگر پھر رفتہ رفتہ یہ آوازیں مدہم ہونا شروع ہوئیں' حتیٰ کہ دریا میں مکمل خاموشی چھا گئی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہر طرف سناٹوں کا راج ہے۔ حتیٰ کہ مجھے ان سناٹوں سے خوف آنے لگا اتنے میں جال میں حرکت ہوئی' میرا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا' میں نے فوراً پوری قوت سے جال کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی مگر میں نے محسوس کیا کہ جال کے دوسری طرف کوئی مجھے کھینچ رہا ہے۔ میں نے ایک دفعہ پھر اپنی ساری قوتیں مجتمع کیں' مگر میرے پاؤں زمین پر سے اکھڑ رہے تھے۔ پیشتر اس کے کہ میں ایک جھٹکے کے ساتھ دریا میں الٹا گرتا' لاکھوں مچھلیاں سطح آب پر نمودار ہوئیں اور انہوں نے بیک آواز کہا "تم اگر اپنی

اور ہم سب کی سلامتی چاہتے ہو تو جال کا یہ سرا جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ فوراً چھوڑ دو! ‘‘ میں نے اپنی انا کو مجروح ہونے سے بچانے کے لئے اپنے لہجے میں خود اعتمادی پیدا کرتے ہوئے کہا ’’ یہ نہیں ہو سکتا ‘‘ ان بے شمار مچھلیوں میں سے ایک مچھلی پانی پر سے پھدک کر ساحل کے قریب پہنچی اور کہا ’’ میں ان لاکھوں مچھلیوں کی طرف سے جو اس وقت سطح آب پر میرے ساتھ ہیں ‘ تم سے ہاتھ جوڑ کر التماس کرتی ہوں کہ تم جال کا یہ سرا جو تمہارے ہاتھ میں ہے فوراً چھوڑ دو کہ اس میں تمہاری اور ہم سب کی سلامتی ہے! ‘‘ مجھے اس مچھلی کے لہجے میں ایک عجیب سا اضطراب نظر آیا ‘ میں نے پوری قوت سے زمین میں اپنے قدم گاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ’’ یہ تم بار بار میری اور اپنی سلامتی کا مشترکہ ذکر کیوں کر رہی ہو؟ ‘‘ اس پر اس مچھلی نے مزید مضطرب انداز میں کہا ’’ باتوں کے لئے وقت بہت کم رہ گیا ہے ‘ تم وہی کرو جو میں کہہ رہی ہوں کیونکہ جال کے اس طرف تم اور جال کے دوسری طرف اس دریا کا سب سے بڑا مگرمچھ ہے۔ ہم میں سے کچھ نادان مچھلیوں نے اس کی مدد طلب کی ہے ‘ مگر یہ نہیں جانتیں کہ یہ مگرمچھ جوان کا غم خوار بن کر انہیں اپنے قریب لانے میں کامیاب ہوا ہے تم سے نجات دلانے کے بعد یہ ہم سب کو کھا جائے گا۔ دریا کے دوسرے کنارے کی مچھلیوں کو اس مگرمچھ کا تجربہ ہو چکا ہے اور ہم نہیں چاہتیں کہ یہ تجربہ اس کنارے پر بھی دہرایا جائے ‘‘ یہ سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جال پر میری گرفت کمزور ہو رہی ہے۔ اور پھر میں نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ ایک بار یوں لگا جیسے دریا میں زلزلہ آ گیا ہو۔ پانی کی تند و تیز موجیں ساحل سے اپنا سر ٹکرانے لگیں اور پانی ساحل سے باہر بہنے لگا۔ دریا میں طوفان سا آ گیا تھا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد اس طوفان میں کمی آ گئی۔ لہریں پر سکون ہونا شروع ہوئیں اور پھر دریا پوری نغمگی کے ساتھ بہنے لگا۔ میں نے مچھلیاں شکار کرنے والا تھیلا دریا میں پھینکا اور پھر واپس مڑتے ہوئے ایک دفعہ ہولے سے کہا۔

ہرا سمندر گوپی چندر

بول میری مچھلی کتنا پانی

اس پر لاکھوں کروڑوں مچھلیاں ایک بار پھر سطح آب پر نمودار ہوئیں اور انہوں نے خوشی سے بھری ہوئی آواز میں اپنے ہاتھوں کو پھیلاتے ہوئے کہا ’’ اتنا پانی ‘‘

۴ ر جون ۱۹۸۵ء

خوف

"ملک صاحب! اس وقت آپ کی عمر کتنی ہے؟" میں نے اپنے پڑھے لکھے بزرگ دوست ملک خورشید احمد سے پوچھا!

"ایک سو دس برس" ملک صاحب نے کہا

"آج آپ اپنی طوالت عمر کا راز بتا ہی دیں!"

"اب یہ راز بتانے کا کیا فائدہ کیونکہ اب تو گنتی کے چند سانس رہ گئے ہیں۔ آج نہیں تو کل اللہ کو پیارا ہو جاؤں گا"

"چھوڑیں ملک صاحب، یہ "لارا" تو آپ ہمیں کب سے دے رہے ہیں آپ یہ بتائیں کہ اتنی طویل عمر کا راز کیا ہے؟

"کیا تم واقعی راز جاننا چاہتے ہو؟"

"تو گویا میں مذاق کر رہا ہوں"

"تو پھر سن لو..... میری طوالتِ عمر کا راز شدید خوف کے عالم میں زندگی بسر کرنے میں ہے" ملک صاحب نے خوف سے کپکپاتی آواز میں کہا

"کیا مطلب؟"

"مطلب وہی جو تم سمجھے ہو۔ جب میں پیدا ہوا تو میرا وزن ساڑھے چار پاؤنڈ تھا، ڈاکٹروں نے کہا اس کا زندہ بچنا مشکل ہے۔ مگر میں نہ صرف یہ کہ بچ نکلا بلکہ مہینوں ہی میں خاصا صحت مند بھی ہو گیا"

"یہ تو آپ کے ہوش سے پہلے کا واقعہ ہے"

"ہاں مگر ذہن پر اس کا اثر تو رہتا ہے۔ جب ذرا بڑا ہوا تو والدہ نے گھریلو حالات سے تنگ آ کر مٹی کے تیل کی بوتل پی لی، جس سے ان کا کلیجہ چھلنی ہو گیا اور وہ میرے سامنے سسک سسک کر مر گئیں"

"پھر؟"

"پھر اس کے بعد تو ذہن پر خوف اس قدر سوار ہوا کہ آج تک اسی خوف کے سہارے زندہ ہوں"

"میں کچھ سمجھا نہیں"

"میں تمہیں سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا۔ میں تو تمہاری فرمائش پر کچھ حقائق بیان کر رہا ہوں۔ یہ باہر کھڑاک کیسا ہوا ہے؟"

"آپ تو ایسے ہی ڈر جاتے ہیں کوئی بلی وِلی ہو گی"

"کوئی بھلا شگوف والی بلی نہ ہو۔ ذرا ہمت کرو' اٹھ کر دیکھ ہی لو" ملک صاحب نے سہمی ہوئی آواز میں کہا

باہر کوئی بھی نہیں تھا' چنانچہ میں دوبارہ ملک صاحب کے پاس آ کر بیٹھ گیا

"عین عالم شباب میں ایک اور خوف دامن گیر ہوا" ملک صاحب نے بتایا "عالم شباب کا یہ خوف عالم شباب ہی کے حوالے سے تھا۔ حکیموں اور سنیاسی بابوں کے اشتہاروں نے میری راتوں کی نیند اڑا دی"

"پھر کیا ہوا" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا

"پھر کیا ہونا تھا' بچے ہوئے' ان کی شادیاں ہوئیں"

"پھر؟"

"پھر ان بچوں کے بارے میں تفکرات شروع ہو گئے اب ان تفکرات کے سارے زندہ ہوں' اللہ کے فضل سے کوئی نہ کوئی مسئلہ سامنے آتا ہی رہتا ہے"۔

"مگر ان تفکرات اور خوف کا طوالت عمر سے کیا تعلق ہے؟"

"اس مسئلے پر بھی بات ہو گی۔ پہلے میں تمہیں یہ تو بتالوں کہ اشیائے خورد و نوش میں ملاوٹ' زندگی بچانے والی جعلی ادویات' دن دہاڑے ڈکیتی کی وارداتیں' بچوں کے خرکار کیمپ' ہتھوڑا گروپ کی وارداتیں اور اس طرح کے دوسرے بے شمار خوف مجھے زندہ اور صحت مند رکھے ہوئے ہیں!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں صحیح کہہ رہا ہوں' مختلف بیماریوں کی اخبارات اور ٹیلی ویژن کلینک میں تشہیر بھی اس سلسلے میں بہت مفید ثابت ہو رہی ہے"

"وہ کیسے"

"وہ اس طرح کہ اخبارات میں شائع ہونے والے ڈاکٹروں کے کالموں اور ٹیلی ویژن کے طبی پروگراموں میں بیماری کی جو علامات بیان کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر مجھ میں پائی جاتی ہیں۔ اور یوں میں ۲۴ گھنٹے شدید خوف میں مبتلا رہتا ہوں مثلاً کینسر کی ایک علامت یہ ہے کہ منہ میں لعاب زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ کچھ دنوں سے میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ لعاب دہن زیادہ پیدا ہو رہا ہے اس طرح ذیابیطس میں پیشاب زیادہ آتے ہیں۔ مجھے بھی دن میں کئی دفعہ باتھ روم جانا پڑتا ہے۔ دل کی تکلیف میں بازو درد کرتا ہے۔ میرا بازو بھی اکثر درد کرتا رہتا ہے۔ اخبارات میں ایڈز کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ انسان کی قوت مدافعت ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ نزلہ زکام کھانسی وغیرہ بھی لاحق ہو جائیں تو ٹھیک ہونے میں نہیں آتیں اور میں نے محسوس کیا ہے کہ کئی مہینوں سے میری کھانسی ٹھیک نہیں ہو رہی۔ بلڈ پریشر میں چکر بہت آتے ہیں اور میرا یہ حال ہے کہ ان چکروں کی وجہ سے کئی دفعہ اپنی جگہ پر کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ چنانچہ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ میں بلڈ پریشر' ہارٹ ٹربل'

ذیابیطس، کینسر اور ایڈز جیسی مہلک امراض کے جنگل میں پھنسا ہوا ہوں، اس خوف نے میری راتوں کی نیندیں حرام کی ہوئی ہیں"

ایڈز کے لفظ پر میں نے بمشکل اپنی ہنسی روکی

"ایک خوف ان کے علاوہ بھی ہے" ملک صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "وہ نت نئے ایٹمی ہتھیاروں اور عالمی جنگ کے حوالے سے ہے اس کے علاوہ اتنی بڑی کائنات میں انسان کی حیثیت کے بارے میں میں جو سائنسی انکشافات ہوئے ہیں، وہ بہت خوفزدہ کرنے والے ہیں، اس پوری کائنات میں ہمارے کرہ ارض کی کوئی حیثیت نہیں، تو انسان کی کیا حیثیت ہے اور اگر بنی نوع انسان کی کوئی حیثیت نہیں تو پھر میری ذاتی حیثیت تو زمین پر رینگنے والے ایک کیڑے سے بھی کم ہے۔ کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر حیثیت میں زندہ رہنے کا احساس بہت جان لیوا ہے"

مجھے اب ملک صاحب کی باتوں سے وحشت ہی آنے لگی تھی چنانچہ میں نے سلسلہ کلام مختصر کرتے ہوئے کہا "خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آپ اپنی طوالت عمر اور عمدہ صحت کا راز بتائیں؟"

"تو اتنی دیر سے اور میں کیا بتا رہا ہوں" ملک صاحب نے ناراضگی سے کہا "میں تمہیں یہی تو بتا رہا ہوں کہ یہ سارے خوف مجھے زندہ اور توانا رکھے ہوئے ہیں مثلاً ان دنوں پاکستان کے بارے میں غفار خان، جی ایم سید، ولی خان اور ممتاز بھٹو وغیرہ جس طرح کے بیانات دے رہے ہیں اور ان لوگوں کے جلسوں میں پاکستان توڑنے کے جو نعرے لگ رہے ہیں، یہ سب صورتحال میرے خوف میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔ بلکہ ان لوگوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے محب وطن قوتیں جس طرح ایک دوسرے کے لئے تیغ بے نیام بنی ہوئی ہیں، فرقہ پرست مولوی جس طرح دشمنوں کے ساتھ مل کر پاکستان سے محبت کرنے والوں کے خلاف محاذ آرا ہیں اور ایسے معاملات میں سچ کا ساتھ دینے کی بجائے میں اور تم جس طرح مصلحتاً خاموش ہیں، یہ سب چیزیں مجھے اندر سے شدید بے چین رکھتی ہیں چنانچہ میں اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں اپنے ملک کے بارے میں اور بنی نوع انسان کے مستقبل کے بارے میں سخت متفکر ہوں، لیکن میرے عزیز یہی خوف مجھے میرے ملک کو اور بنی نوع انسان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں"

"مگر وہ کیسے؟" میں نے اس دفعہ چڑ کر سخت جھنجلاہٹ کے عالم میں کہا

"وہ ایسے کہ خوف کمزور سے کمزور اور بزدل سے بزدل انسان کو بھی خطرات کے مقابلے کے لئے تیار کرتا ہے"۔ ملک صاحب نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "یا کم از کم اس میں تیار کرنے کی صلاحیت ضرور ہوتی ہے جسے استعمال میں لا کر بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے"

"اور اپنے کان ادھر لاؤ ملک صاحب نے بات جاری رکھتے ہوئے کپکپاتی آواز میں کہا" میں تمہیں آخر میں ایک راز کی بات بتاتا ہوں...... یہ جو بلّی ہے نا...... یہ سنسان اور ویران جنگلوں میں بالکل اکیلی رہا کرتی تھی ایک روز یہ جنگل کی ویرانیوں اور ہولناک سناٹوں سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ مارے خوف کے شیر بن گئی"

میں ملک صاحب کی بات سے متاثر ہوا مگر میں نے پوچھا اور یہ جو بلیاں شہروں میں چوہوں کا شکار کرتی اور انسانوں کے پاؤں چاٹتی نظر آتی ہیں، یہ کون ہیں؟ "

" یہ وہ بلیاں ہیں جو جنگل کی ہولناک سفاکیوں سے فرار حاصل کرنے کے لئے شہروں میں آ گئیں اور یوں پُرخطرات زندگی کے ثمر سے محروم ہو گئیں چنانچہ شیر بننے کی بجائے یہ شہروں میں چوہوں کا شکار کرتی ہیں اور انسان کے پاؤں چاٹتی ہیں۔ میرے عزیز! یہ بھگوڑی بلیاں ہیں جو مارے خوف کے شیر بن سکتی تھیں مگر پرسکون زندگی کی خواہش نے انہیں پاؤں چاٹنے والی مخلوق بنا دیا! "

۲۳ مارچ ۱۹۸۶ء

ماسی مختیار

وفاقی وزیر خزانہ جناب یلیین خان وٹو کی بجٹ تقریر ہم نے بہت دل لگا کر سنی بلکہ ان کی بعض باتیں ہمارے دل کو ایسی لگی ہیں کہ خوشی سے ہمارے پاؤں زمین پر ٹک نہیں رہے۔ مثلاً انہوں نے پٹرول کی قیمتوں میں جس کمی کا اعلان کیا اس سے ہمیں ذاتی طور پر سولہ روپے ماہوار کا فائدہ ہوا ہے اور اس فائدے میں مزید اضافہ محض ہماری نالائقی کی وجہ سے ممکن نہیں، کیونکہ اگر ہمارے پاس ایک کار کی بجائے چار کاریں ہوتیں تو اس فائدے کی شرح ۶۴ روپے ماہوار تک پہنچ سکتی تھی، چنانچہ اب ہمیں پیسے جوڑ کر تین کاریں مزید خریدنا پڑیں گی تاکہ پٹرول کے نرخوں میں معقول کمی کا خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔ وزیر خزانہ نے اپنی بجٹ تقریر میں ایک بہت عمدہ سکیم کا بھی اعلان فرمایا جس کے مطابق آئندہ ہر برسر روزگار شخص کو حادثاتی موت کی صورت میں دس ہزار روپے نقد ملیں گے۔ یہ سکیم تو یوں بھی بہت عمدہ ہے مگر اس میں "برسر روزگار" کی شرط شامل کر کے حکومت نے اس کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے کیونکہ حادثاتی موت کی صورت میں بے روزگار افراد کو بھی اگر یہی سہولت مہیا کی جاتی تو اس سے ملک میں بیروزگاری کی حوصلہ افزائی ہوتی، موجودہ صورت میں بیروزگاری ہی نہیں، بیروزگاروں کا قلع قمع کرنے کے لئے میدان ہموار ہو گیا ہے جہاں تک ہماری اپنی ذات کا تعلق ہے، ہم ماشاءاللہ "برسر روزگار نوجوان" ہیں اور یوں اس سکیم سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کی پوزیشن میں ہیں، یعنی اگر ہم اس "دوروزہ زندگی" میں سے ایک دن گھٹانے کے لئے تیار ہو جائیں یعنی آج مرنے پر رضامند ہو جائیں تو کل ہمارے ورثا کو بیٹھے بٹھائے مفت میں دس ہزار روپے مل سکتے ہیں جس میں ایک وی سی آر باسانی خریدا جاسکتا ہے، کیونکہ موجودہ بجٹ کے نتیجے میں وی سی آر بھی انسانوں کی طرح ارزاں ہو گیا ہے لیکن اس سکیم میں موت کے لئے "حادثاتی" ہونا ضرور قرار دیا گیا ہے، یعنی بیمار ہو کر مرنے کی صورت میں ورثا کے ہاتھ "کچھ" نہیں آتا، بلکہ الٹا انہیں دوا دارو اور تجہیز تکفین کے اخراجات کی "ذز" سہنا پڑتی ہے تاہم شرط عائد کرنے سے بھی خلق خدا کو بہت فائدہ ہوا ہے کہ اب وہ بے خوف ہو کر رکشے، ٹیکسی اور بس وغیرہ میں سفر کر سکتے ہیں کہ حادثاتی موت کی صورت میں ان کا کیا جاتا ہے "نقصان" تو حکومت کا ہو گا جسے دس ہزار روپے ادا کرنے پڑیں گے۔ دوسرے لفظوں میں حکومت نے برسر روزگار افراد کے دلوں سے حادثاتی موت کا خوف نکال دیا ہے اور کہہ دیا ہے

"آپ تسلی سے مرجائیں باقی کام ہمارا ہے"

سو اب اس "صلائے عام" کے باوجود اگر یاران نکتہ داں موت سے خوفزدہ رہیں تو یہ ان کی اپنی کم ہمتی ہے ورنہ اس سے پہلے تو سفر حیات کا بے حد طویل تھا۔

۸۷۔ ۱۹۸۶ء کے بجٹ میں ایک قابل قدر اقدام ان امور کے علاوہ بھی ہے۔ جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں' یہ اقدام عوام کو اخلاقی بے راہروی سے بچانے کے لئے ڈاک کے لفافوں اور ٹیلیفون کالز کے نرخوں میں اضافہ سے متعلق ہے۔ ایک دفعہ ہمارے ایک دوست نے ایک ہونہار کا ایف اے کا پرچہ ہمیں دکھایا تھا' جس میں اس نے ۲۵ نمبروں کا حامل مضمون لکھتے ہوئے اس امر پر خصوصی طور پر زور دیا تھا کہ لڑکیوں کو جغرافیہ نہیں پڑھانا چاہئے کیونکہ اس سے انہیں شہر کے رستوں کا پتہ چل جاتا ہے اور وہ موقع ملتے ہی گھر سے بھاگ جاتی ہیں۔ اسی طرح ڈاک کے لفافے اور ٹیلیفون کالز جس طرح قوم کا اخلاق بگاڑ رہے ہیں' وہ اظہر من الشمس ہے چنانچہ ہمیں یقین ہے کہ ان کے نرخوں میں اضافے سے اخلاق بگاڑ رجحانات کی حوصلہ شکنی ہوگی اور یوں معاشرہ صالح بنیادوں پر استوار ہو سکے گا!

وزیر خزانہ یسین خان وٹو کی بجٹ تقریر ہم نے صرف اخباروں ہی میں نہیں پڑھی' بلکہ براہ راست ٹیلی ویژن سے بھی دیکھی اور سنی ہے' ہم اوپر بیان کئے گئے نکات کے علاوہ اس کا تفصیلی آنکھوں دیکھا احوال بھی بیان کرتے' مگر ماسی مختیار نے ہمیں یہ تقریر پوری طرح سننے نہیں دی یعنی جب وٹو صاحب کھربوں اور اربوں روپے کی بات کر رہے تھے' عین اس وقت ماسی مختیار اپنے بیمار بچے کو گود میں اٹھائے گھر میں داخل ہوئی اور کہا کہ تنخواہ میں سے پچاس روپے ایڈوانس دے دیں' گھر میں کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے' بچہ بھی بیمار ہے اس کے لئے دوا دارو بھی کرنا ہے' لیکن ہمیں ماسی مختیار کی یہ بے وقت راگنی اچھی نہیں لگی چنانچہ ہم نے ٹیلی ویژن سے نظر ہٹائے بغیر کہا "ماسی بجٹ تقریر سنو' دیکھو تم لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت بڑی بڑی رقمیں مختص کر رہی ہے۔ انشاءاللہ آئندہ چند برسوں میں تمہاری سب پریشانیاں دور ہو جائیں گی" مگر یہ ان پڑھ لوگ ایسی باریک باتیں کب سمجھتے ہیں' چنانچہ چند برس انتظار کرنے کی بجائے وہ گھگھیا گھگھیا کر یہی کہتی رہی کہ اس کے گھر میں آج ہی چولہا جلنا چاہئے اور اس کے بیمار بچے کو دوا اور اس کے ساتھ اچھی خوراک ملنی چاہئے تاکہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے۔ اس پر ہم نے ماسی مختیار سے کہا کہ دیکھو ماسی تم بھوک اور بیماری کی بات کر رہی ہو' ہمارے وزیر خزانہ کو بھی اس کا تجربہ ہے' زندگی میں وہ بھی کبھی نہ کبھی بیمار ہوئے ہوں گے اور بھوکے تو وہ اس وقت بھی ہیں کیونکہ رمضان المبارک کا مہینہ ہے اور کم از کم گذشتہ دو گھنٹوں سے تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ روٹی کا ایک لقمہ تو کیا' پانی کا ایک گھونٹ بھی ان کے حلق میں نہیں گیا۔ چنانچہ جس شخص کو بھوک پیاس کا اتنا تجربہ ہو' وہ تم لوگوں کے مسائل سے یقیناً باخبر ہو گا! لہٰذا گھبراؤ نہیں' بجٹ تقریر سنو' مگر جب اس کے باوجود اس نے اپنی پرانی رٹ لگائے رکھی تو اچانک ایک روشنی کا کوندا سا ہمارے ذہن میں لپکا' ہم نے ماسی سے پوچھا "تمہارا خاوند کیا کرتا ہے؟" اس نے کہا "ایک دفتر میں چپڑاسی ہے' مگر تین مہینے سے وہ بیمار پڑا ہے' ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے" ہم اس پر بہت ایکسائیٹڈ ہوئے چنانچہ ہم نے جلدی سے پوچھا "اسے نوکری سے جواب تو نہیں ملا؟" کہنے لگی "نہیں!" ہم نے کہا "ماسی مبارک ہو' تمہارا مسئلہ حل ہو گیا" ماسی مختیار کے چہرے پر روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی اور اس نے پوچھا "بابو جی وہ کیسے؟" ہم نے کہا "تمہارا خاوند برسر روزگار ہے' بس اسے بستر پر نہ

مرنے دیتا اگر ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے تو اس کی موت سڑک پر ہونی چاہیے' تمہیں بیٹھے بٹھائے دس ہزار روپے مل جائیں گے۔ اتنے پیسوں کا تم کیا کرو گی پچاس روپے مانگنے والی ماسی مختیار؟"

یکم جون ۱۹۸۶ء

دو محبِ وطن

گذشتہ روز ایک محب وطن پاکستانی افسر سے ملاقات ہوئی' اس نے اپنے آفس میں ٹیلی ویژن سیٹ رکھا ہوا تھا۔ اور پاک بھارت کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہم سے پوچھا" جناب! سندھ کے حالات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" ہم نے کہا۔

" خاصے تشویشناک ہیں!" بولا " وہ کیسے؟" ہم نے عرض کی " وہاں انسانی جانیں ضائع ہو رہی ہیں اور قومی املاک کو نقصان پہنچ رہا ہے!" وہ ایک دم سے اپنی سیٹ سے اچھل پڑا' اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں تھے' اس نے غصے سے کہا۔

" یہ پاکستانی کھلاڑیوں کو کیا ہو گیا ہے' ایک چوکا اور پڑا ہے' آپ یہ بتائیں کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟"

" کون سے مسئلے کا؟"

" یہ جو سندھ میں انسانی جانیں ضائع ہو رہی ہیں اور قومی املاک کو نقصان پہنچ رہا ہے؟ کیا ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں' یہ دیکھیں اب کے چھکا پڑا ہے۔ آخر بنے گا کیا؟"

" آپ کس بارے میں پوچھ رہے ہیں؟"

" میں نے عرض کیا نا' کہ جو کچھ سندھ میں ہو رہا ہے آخر بنے گا کیا؟"

" بنتا کیا ہے' ہم لوگوں کو عقل سے کام لینا چاہئے' نہ گولی کسی مسئلے کا حل ہے' نہ پٹڑیاں اکھاڑنے سے جمہوریت آسکتی ہے!"

" یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں' لیکن کیا آپ نور خاں کو نہیں سمجھا سکتے؟"

" مگر برادرم' نور خان صاحب کا سندھ کے حالات سے کیا تعلق ہے؟"

" جناب! نہایت گہرا تعلق ہے' موجودہ ٹیم کی سلیکشن کے وہی ذمہ دار ہیں۔ آخر ہم لوگ ذاتی تعلقات کو قومی مفادات پر کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ یہ دیکھیں ایک چوکا اور پڑا ہے' مگر آپ یہ بتائیں کہ یہ کہیں سندھو دیش کی تحریک تو نہیں؟"

" نہیں' ایسی کوئی بات نہیں' سندھ کے عوام سرحد' پنجاب اور بلوچستان کے عوام سے کم محب الوطن نہیں ہیں' البتہ وہاں ایک گروہ ایسا ضرور موجود ہے۔ جو موجودہ صورت حال کو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے! اور اسے ہمارے دشمن ملکوں کی حمایت حاصل ہے!"

" یہ تو بہت بری بات ہے' ہمارے کھلاڑیوں نے یہ تیسری مرتبہ کیچ چھوڑا ہے۔ ویسے آپ کا کیا خیال

ہے ، الیکشن سے صورت حال بہتر ہو سکتی ہے ؟ ''

'' میں سیاسی تجزیہ نگار نہیں ہوں ' مگر جو لوگ ان معاملات کو سمجھتے ہیں ان میں سے بیشتر کا خیال یہی ہے کہ فوری انتخابات سے صورت حال بہتر ہو سکتی ہے اور یوں اس تحریک کو ملک دشمنوں کے ہاتھ میں جانے سے روکا جاسکتا ہے ! ''

'' میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں میں قومی غیرت ختم ہوتی جارہی ہے ' اب دیکھیں نا ہمارے کھلاڑیوں نے بڑی عید کو بھی میچ کھیلا ' کیا ہمیں انڈیا پر یہ واضح نہیں کرنا چاہئے تھا کہ یہ ہمارا دینی اور ملی تہوار ہے، ہم اس روز میچ شیڈول نہیں کر سکتے ''

'' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ' عید کے روز میچ کھیل کر ہم لوگوں نے ملی بے حسی کا ثبوت دیا ہے اچھا اب آپ مجھے اجازت دیں ' آپ کے سامنے فائلوں کا ڈھیر لگا ہے ' میں خواہ مخواہ آپ کا قیمتی وقت ضائع کر رہا ہوں ! ''

'' میں تو جناب ملکی حالات کی وجہ سے سخت پریشان ہوں ' اس عالم میں بھلا کام کہاں ہو سکتا ہے ' ان فائلوں پر میں نے دستخط ہی کرنے میں ہیں ' وہ کل ہو جائیں گے ' آپ یہ بتائیں کہ موجودہ صورت حال میں پاکستان کے محب الوطن عوام کو کیا کرنا چاہئے ؟ ''

'' پہلے تو ہمیں ٹھنڈے دل سے یہ سوچنا چاہئے کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے ۔ اس کے بعد ہمیں نفع ونقصان کی پرواہ کئے بغیر جہاں حکومت غلط ہے وہاں حکومت کو ٹوکنا چاہئے اور جہاں ہم میں خرابی ہے وہاں اپنی اصلاح کرنی چاہئے ! ''

'' مگر جناب ! یہ تو بہت مشکل کام ہے ان سے تو فیلڈنگ تک صحیح نہیں ہو رہی ' آپ نور خان کے خلاف کالم نہیں لکھ سکتے ؟ ''

میں نے جواب میں اس محب وطن پاکستانی کو ایک نظر دیکھا ' جس کے چہرے پر تشویش تھی اور آنکھیں ٹیلی ویژن پر جمی ہوئی تھی ۔ اور پھر اس سے ہاتھ ملا کر اٹھ آیا ۔ ایک محب وطن پاکستانی کے طور پر میں نے بھی ملکی حالات پر تشویش کا کوٹہ پورا کر لیا تھا ' اب مجھے اور بھی کام کرنے تھے !

بھلے مانس!

لاہور کارپوریشن والے ان دنوں آوارہ کتے مارنے کی مہم پر نکلے ہوئے ہیں' چنانچہ ابھی تک تین ہزار کتے اس "کارپوریشن مقابلے" میں مارے جاچکے آوارہ 'کتوں کو مارنے کیلئے انہیں کچلا کھلانا پڑتا ہے' بہرحال اس کام کیلئے جو طریق کار بھی برتا جاتا ہو ہمیں اس سے غرض نہیں ہم نے تو یہ خبر اخبار میں پڑھی ہے' جس میں یہ بھی درج تھا کہ کارپوریشن کے اس "آپریشن" کے دوران کچھ کتے تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے لیکن کچھ کتے ایسے بھی تھے جنہوں نے شہر سے باہر جاکر دم توڑا۔ گویا کارپوریشن کا مقابلہ دو قسم کے کتوں سے تھا' ایک تو وہ تھے جو شہر میں قیام کے دوران شہریت کے اصولوں سے واقف ہو گئے تھے' سو انہوں نے شہر میں مرنا حفظان صحت کے اصولوں کے منافی جانا اور دوسرے کتے وہ تھے جو یا تو ایک عرصہ تک شہر میں رہنے کے باوجود شہریت کے اصولوں سے بے خبر ہے اور یا پھر انہوں نے سوچا کہ اگر مرنا ہے تو کیوں نہ کارپوریشن کے اہلکاروں کو بھی شرمسار کیا جائے' سو انہوں نے کچلا نوش جاں کیا دو "پلٹیاں" کھائیں اور پھر ان اہلکاروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی جان دبیہ جانِ آفریں کے سپرد کردی!

لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہمیں ان ہر دو قسم کے کتوں کے تلف ہونے پر دلی افسوس ہے کیونکہ آوارہ کتے خاصی بے ضرر قسم کی مخلوق ہیں اور ہم نے تو انہیں خاصا شریف النفس پایا ہے۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ یہ مخلوق قسائی کی دکان کے گرد جمع ہے۔ قسائی انہیں ہڈی یا چھچھڑے ڈال دیتا ہے تو یہ صبر شکر کر کے کھالیتے ہیں۔ ورنہ چپ پڑے رہتے ہیں ان میں سے بیشتر تو دن اور رات کا زیادہ عرصہ کسی دکان کے پھٹے کے نیچے لیٹ کر بسر کرتے ہیں چنانچہ شہریوں کو ان سے بہت کم شکائت پیدا ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا ہے کہ یہ سائیکل سواروں کے پیچھے تھوڑی دور تک بھاگتے ہیں ان پر تھوڑا بہت بھونکتے بھی ہیں یا بہت زیادتی کریں تو ان کی شلوار کا پائنچا پکڑ لیتے ہیں' لیکن یہ کوئی ایسا جرم نہیں جس کی پاداش میں کسی کو کچلا کھلا دیا جائے۔ اس سے زیادہ زیادتیاں تو خود انسان 'انسانوں سے کرتے ہیں یا یہ کہ خود کتے 'کتوں سے کرتے ہیں خطرناک کتے تو وہ ہیں جنہیں ان کے ولایتی صاحبوں نے اپنی حفاظت کے لئے پالا ہوا ہے اور ایک طویل عرصے تک ان کے ناز نخرے اٹھائے ہیں۔ چوڑے جبڑوں اور نوکیلے دانتوں والے یہ کتے بھونکتے کم اور کاٹتے زیادہ ہیں۔ کارپوریشن کو چاہئے کہ وہ آوارہ کتوں کی بجائے ان کی طرف توجہ دے اگر ان کے دانت نکلو کر "بوڑا" کر دیا جائے تو انہیں کچلا دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوگی کہ کتے کے منہ میں اگر دانت نہ ہوں تو وہ مثلِ بکری کے ہوتا ہے' بس اتنا ہے کہ اس "بکری" سے دودھ کی توقع بہر صورت نہیں کرنا چاہئے!

اور یہ نرا دودھ دینا بھی کوئی ایسی کوالیفکیشن نہیں کہ محض اس کی وجہ سے دودھ دینے والے جانوروں کے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں مثلاً یہ گائے ہی کو لیجئے جس کی طرف کارپوریشن کے اہلکاروں نے آج تک کوئی توجہ نہیں دی، ہم جب صبح گھر سے نکلتے ہیں توشام تک کا عرصہ ان گاؤں مجوّں ہی کے ساتھ گزارتے ہیں۔ - یہ مخلوق جب سڑک پر سے گزرتی ہے تو یوں لگتا ہے کسی ملکہ کی سواری جا رہی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اکثر ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔ گائے کو خاصا بھلے مانس جانور تصور کیا جاتا ہے۔ اور اس کی شرافت کی بہت دھومیں ہیں، لیکن سڑکوں پر آوارہ پھرنے اور دوسروں کی محنت پر پلنے والی یہ مخلوق شریف شہریوں کے ساتھ "کھے" کر گزرتی ہے غریب دکان داروں کے پھلوں اور سبزیوں کے ٹوکروں میں منہ مارتی پھرتی ہے اس کے ساتھ ساتھ دھواں "دھار" حرکت بھی کرتی چلی جاتی ہے۔ جس سے پیچھے آنے والے شرفا کو پائنچے اوپر اٹھانا پڑتے ہیں لیکن اس سے چنداں فائدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسے مواقع پر وہ "پونچھل" بھی ہلاتی ہے۔ سو کارپوریشن والوں کو چاہئے کہ وہ کچھ فکر ان آوارہ گائے بھینسوں کی بھی کریں، اگر وہ دودھ دیتی ہیں تو کیا ہوا، عام شہریوں کے حصے میں تو گوبر اور چھینٹیں ہی آتی ہیں!

ان سطور سے ہمارا مقصد جانوروں کا باہمی موازنہ نہیں کہ جانور بہرحال جانور ہے، مقصد انسانوں کو اس طرف متوجہ کرنا ہے سو کارپوریشن والے اگر واقعی شہریوں کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں تو انہیں خوفناک جبڑوں والے کتوں کے دانت بھی کھٹے کرنا ہوں گے اور دوسروں کی محنت پر پلنے والی ان "بھلے مانس" گائے بھینسوں کی فکر بھی کرنا ہوگی کہ شہری ان دونوں کے بہت ستائے ہوئے ہیں!۔

ہدایت نامہ

برسات کے موسم میں بجلی کے حادثات اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں ' کھمبے کو ہاتھ لگائیں تو اس میں کرنٹ دوڑ رہا ہوتا ہے 'افسوس کہ اس بات کا پتہ کھمبے کو ہاتھ لگانے والے کو نہیں اس کے "لواحقین" ہی کو چلتا ہے اسی طرح برسات کے موسم میں دیوار کو ہاتھ لگائیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے کان ہوں یا نہ ہوں اس میں کرنٹ ضرور ہے۔ یہ موسم برسات کے رومانی اثرات نہیں ہیں کہ جس چیز کو بھی ہاتھ لگایا جائے کرنٹ محسوس ہوتا ہے' بلکہ یہ سب واپڈا کے کمالات ہیں' تاہم اس ادارے نے کمال مہربانی سے کام لیتے ہوئے ان دنوں اخبارات میں ایک اشتہار شائع کروایا ہے جس میں عوام کیلئے کچھ ہدایات ہیں اس اشتہار کا عنوان "برسات کے موسم میں بجلی کے حادثات سے بچنے کی تدابیر" ہے اور ان میں سے کچھ تدابیر درج ذیل ہیں۔

- ...... کپڑے پھیلانے کیلئے لوہے کے تار استعمال نہ کریں۔
- ...... پنکھوں اور دوسرے برقی آلات کو سوئچ نکالنے کے بعد ہاتھ لگائیں۔
- ...... استری کرتے وقت پاؤں کے نیچے خشک کپڑا' قالین 'لکڑی کا تختہ' پرانا کمبل دری یا کاغذ ضرور رکھیں۔ بہتر ہے کہ ربڑ کے سلیپر پہن لیں اس دوران دیوار کو ہاتھ نہ لگائیں۔
- ...... مویشیوں کو کھمبوں یا ان سے لگے ہوئے لوہے کے تار سے نہ باندھیں۔
- ...... راستہ چلتے وقت کھمبوں کو ہاتھ نہ لگائیں۔

درج بالا "ہدایت نامہ" اخباروں میں شائع کرانے کے بعد ظاہر ہے' یہ قومی ادارہ عوام اور مویشیوں کی جانوں کا ذمہ دار نہیں رہا کہ اس کا کام اپنی تلوار کو نیام میں ڈالنا نہیں بلکہ ایک بہادر دشمن کی طرح اپنے "حریفوں" کو خبردار کرنا تھا اب یہ ذمہ داری عوام اور مویشیوں کی ہے کہ وہ خود کو واپڈا سے کس طرح محفوظ رکھتے ہیں۔ بہرحال واپڈا نے یہ ایک اچھی روایت ڈالی ہے اور ہماری خواہش ہے کہ اس کی تقلید میں دوسرے ادارے بھی اس روایت کی پاسداری کریں کہ اس کیلئے انہیں کسی لمبے چوڑے چکر میں نہیں پڑنا پڑے گا۔ بلکہ محض اخباروں میں اسی طرح کا ایک ہدایت نامہ شائع کروانا ہو گا مختلف محکموں اداروں اور افراد کی سہولت کیلئے ہم ذیل میں کچھ اشتہاروں کے نمونے درج کر رہے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

مین ہول سے محفوظ رہنے کی تدابیر

- ...... عوام اور مویشیوں کو چاہئے کہ وہ سر اور نظریں جھکا کر چلنے کی عادت ڈالیں اس سے دیگر فوائد کے ساتھ

ساتھ ایک فائدہ انہیں یہ حاصل ہو گا کہ وہ کسی کھلے مین ہول میں گرنے سے محفوظ ہو جائیں گے۔

○...... عوام اور مویشیوں کو چاہئے کہ وہ تیراکی اور سانس روکنے کی مشق کریں تاکہ اگر وہ سڑک کے ایک کنارے پر واقع کسی مین ہول میں گریں تو سڑک کے دوسرے کنارے پر واقع کسی دوسرے مین ہول میں سے بخیرو عافیت بر آمد ہو سکیں۔

○...... بعض لوگ سڑک کے عین درمیان میں کسی کھلے منہ والے والے مین ہول پر اچانک نظر پڑ جانے کی صورت میں گھبرا جاتے ہیں اور اپنی گاڑی کو اس میں گرنے سے بچانے کی کوشش میں لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال دیتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ خود غرضی سے کام نہ لیں اور اپنی گاڑی کو اس مین ہول میں اتار دیں کہ اس صورت میں ہلاکت کے امکانات کسی صورت میں بھی نوے فیصد سے زیادہ نہیں ہوتے!

بحفاظت سفر کرنے کی تدابیر

○...... اگر آپ کا بازو یا ٹانگ کسی دوسرے بازو یا کسی دوسری ٹانگ کے ساتھ الجھ گئی ہے اور اس پر بہت سے دوسرے مسافروں کے بازؤں اور ٹانگوں کا پریشر بھی ہے تو اسے آزاد کرانے کی کوشش نہ کریں اس صورت میں یہ ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ اس کی بجائے منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے جب یہ بہت سے بازو اور بہت سی ٹانگیں ایک ایک کر کے ایک دوسرے سے جدا ہوتی جائیں تو آپ آخر میں آرام سے اپنے بازو یا ٹانگ کو واگزار کرالیں

○...... ویگن کے پائدان پر لٹک کر سفر کرنے کے دوران اپنی سائیڈ کی گاڑیوں سے خود کو محفوظ رکھیں کیونکہ آپ کی ویگن کے ڈرائیور کے ذمے اپنی سائڈ کی حفاظت ہے۔

○...... ڈرائیور کو گاڑی تیز چلانے پر مجبور نہ کریں ستراسی میل کی سپیڈ سے زیادہ شہر کی سڑکوں پر گاڑی چلانا کسی حادثے کا باعث بن سکتا ہے۔

سمندر خان ٹرک ڈرائیور سے بچنے کی تدابیر

○...... ٹرک کی مخالف سمت میں سفر کرنے سے گریز کریں۔

○...... ہارن دے کر پاس کریں مگر ٹرک پر لدا کئی فٹ دائیں بائیں اور باہر کو نکلا ہوا سریا ہارن سن کر رستہ نہیں دیتا لہٰذا پاس نہ کریں

○...... رات کے وقت مخالف سمت سے اگر کوئی ایک بتی والی سواری نظر آئے تو اسے موٹر سائیکل نہ سمجھیں ٹرک سمجھ کر ہی اس کی عزت و تکریم کریں کیونکہ ٹرک کو موٹر سائیکل سمجھنے کے خطرناک نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں۔

اصلی مصافحہ

بچوں کی تربیت کی طرف ہم آپ تو پتہ نہیں، اتنی توجہ دیتے ہیں کہ نہیں، مگر ہم نے کچھ لوگوں کو اس معاملے میں بہت جان مارتے دیکھا ہے، مثلاً اگر وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو بچوں کو انگریزی میں گفتگو کی تلقین کرتے ہیں۔ بلکہ گھر میں انگریزی بول کر ان کی انگریزی کو سان پر لگاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ہم ایسے سفید پوش ہیں اور انگریزی افورڈ نہیں کر سکتے، تو گھر میں بچوں سے اردو بولتے ہیں۔ اور انہیں بھی اردو بولنے کی تلقین کرتے ہیں۔ چنانچہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ہم اس طرح کے کسی سفید پوش کے مہمان ہوئے تو اس کا بچہ بیٹھک میں داخل ہوا اور اپنے چھوٹے بھائی کی شکایت کرتے ہوئے کہا ابا! وہ میرا آکھا "نہیں مانتا" اس پر "ابّے" نے ڈانٹ کر اس کی اردو کی اصلاح کی اور کہا اوئے! آکھا نہیں مانتا، نہیں کہتے "کہنا" نہیں مانتا کہتے ہیں" بلکہ کئی "ابے" تو ایسے بھی ہیں، جو اگر ذرا سی انگریزی افورڈ کرنے لگیں، تو ڈیڈی" ہو جاتے ہیں اور اگر اس ضمن میں ان کے درجات مزید بلند ہو جائیں تو ڈیڈ" کہلانے لگتے ہیں اسی طرح "بے بے" پہلے "ممی" اور پھر مام" ہو جاتی ہے اور بچے فاروق، یاسر اور خالد سے جونی، کٹو اور ٹونی کی جُون میں آجاتے ہیں۔

لیکن اس وقت جو لوگ بطور خاص ہمارا موضوع ہیں وہ اپنے بچوں کی لسانی تربیت سے زیادہ تہذیبی تربیت پر توجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بچہ محفل میں اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے، سیکھے، تاکہ کل کلاں ان پر یہ الزام نہ آئے کہ انہوں نے اپنے بچے کی تربیت صحیح نہیں کی۔ چنانچہ ابھی گذشتہ روز ہماری ملاقات ایک ایسے ہی بزرگ سے ہوئی۔ جو غالباً اپنے پوتے کے ساتھ ہمارے دفتر میں تشریف لائے۔ کمرے میں میزوں کے ساتھ میزیں جڑی ہوئی تھیں اور مہمان بھی اس وقت کثیر تعداد میں وہاں موجود تھے اس بچے نے لوگوں سے بھرے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہی اسلام علیکم کہا اور ایک کونے میں لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس پر بزرگ نے اسے سرزش کرتے ہوئے کہا "بڑوں سے اس طرح ملتے ہیں، چل اٹھ مصافحہ کر!" چنانچہ بچے نے اپنے "کوچ" کی ہدایات پر ایک سرے سے مصافحہ کرنا شروع کیا اور پھر آخری سرے تک مصافحہ کرتا چلا گیا۔ اور بالاخر واپس آکر کھڑا ہو گیا۔ بزرگ نے ایک بار پھر اس کی سرزنش کی اور کہا! تم اس کونے کے لوگوں کو چھوڑ گئے ہو"۔ اس نے کہا "آگے میز ہے گزرنے کا راستہ نہیں ہے"۔ اس پر بزرگ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا "میز ہے کوئی دریا نہیں ہے۔ چل اٹھ مصافحہ کر!" چنانچہ وہ تعمیل ارشاد میں ٹھوکریں کھاتا، کسی کا پاؤں کچلتا، گرتا اور سنبھلتا ہوا باقی ماندہ مصافحے کرتا ایک بار پھر واپس اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ بزرگ نے دریں اثناء اپنی آمد کا مدعا

بیان کیا اور کام سے فراغت کے بعد جب وہ واپس جانے کیلئے مڑے تو بچہ بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ اچانک بزرگ کی نظر اس پر پڑی تو اسے ایک بار پھر ڈانٹا اور کہا "اس طرح واپس جاتے ہیں۔ چل واپس مصافحہ کر!"

اب آپ خود ہی بتائیں کہ جس بچے کی تربیت میں اتنی جزائیات کا خیال رکھا گیا ہو وہ صبح دفتر جانے کیلئے وقت پر گھر سے نکلے گا۔ اور رستے میں راہگیروں سے مصافحہ کرتے کرتے دفتر پہنچے گا تو لیٹ ہو گا افسر کی جھاڑیں سنے گا۔ اور آخری جھاڑ کے بعد اس سے مصافحہ کر کے واپس اپنے کمرے میں آجائے گا، مگر اپنے اس معاشرتی فریضے سے کبھی منہ نہیں موڑے گا۔ فریدہ حفیظ بتاتی ہیں کہ بچپن میں جب کبھی ریڈیو سے بابا فرید کا کلام "اٹھ فرید اُستیا" نشر ہوتا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں مصافحے والا معاملہ بھی یہی ہے۔ یہ اپنی جگہ پر اچھی چیز ہے۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

تو اس نے بھی صحیح کہا ہے۔ اب دیکھ لیں کچھ عرب ملکوں سے روس مصافحہ کرتا ہے اور کچھ عرب ملکوں سے امریکہ مصافحہ کرتا چلا آرہا ہے، مگر نہ کسی کے کام روس اور نہ کسی کے کام امریکہ کا مصافحہ آیا جب کہ ایک مصافحہ وہ ہے، جو روس اور امریکہ خلوت میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں اور سچ پوچھیں تو بس یہی ایک پر خلوص اور اصلی مصافحہ ہے، باقی ہیر پھیر ہے!

نارِ جہنّم

"شیخ صاحب بول رہے ہیں؟"

"جی جی!"

"میں ملک بشیر بول رہا ہوں!"

"جی ملک صاحب کیسے حال ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے جی۔ وہ دراصل میں نے فون اس لئے کیا تھا کہ آپ کی طرف کچھ پیسے نکلتے ہیں' بہت ضرورت آن پڑی ہے!"۔

"میں تو چند دنوں تک مرنے والا ہوں۔ ملک صاحب"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شیخ صاحب' اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے"۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں' میرا دل کہتا ہے کہ دو ہفتوں کے اندر اندر انتقال کر جاؤں گا!"۔

"آپ کو ایسی بات نہیں کرنا چاہئے شیخ صاحب! آپ سے محبت کرنے والوں کو اس سے تکلیف ہوتی ہے!"

"آپ کی اس بات سے میری بہت ڈھارس بندھی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے' آپ سنائیں آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے!"۔

"اللہ کا شکر ہے کام چل رہا ہے آپ کا کاروبار کیسا جا رہا ہے"۔

"بہت اچھا جا رہا ہے۔ ان دنوں تو سیزن بھی ہے!"۔

"ہاں میں نے یہی سوچ کر فون کیا تھا' اگر ہو سکے تو آج کچھ ادائیگی فرما دیں!"۔

"میں نے تو مر جانا ہے ملک صاحب' میرے بچنے کی تو کوئی امید ہی نہیں ہے!"

"ایسی کون سی بات ہے؟ آپ خدانخواستہ بیمار ویمار تو نہیں ہیں؟"۔

"نہیں بیماری تو کوئی نہیں' لیکن میرا دل کہتا ہے کہ......."۔

"کیا منہ سے برے برے کلمے نکالتے ہیں آپ! آپ یہ بتائیں بچوں کا کیا حال ہے؟"

"بچے بالکل ٹھیک ہیں۔ میں نے پچھلے ہفتے انہیں ایک ایک پلاٹ خرید کر دیا ہے کہ ان پر اپنی اپنی کوٹھیاں خود بنوا لیں!"

"ماشاء اللہ۔ بہت بہت مبارک ہو!"

"خیر مبارک"

" آپ کی کار کیسی جارہی ہے؟ "

"کون سی کار"

"ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا۔ میرا مطلب ہے کہ کاریں کیسی چل رہی ہیں؟ "۔

"میں نے کل ایک نئی مرسڈیز کا آرڈر دیا ہے۔ آپ کسی دن بچوں کو لے کر آئیں نا! "۔

"بس انشاء اللہ کسی دن حاضر ہوں گا۔ اس وقت تو میں نے ضرورت کے تحت فون کیا تھا۔ اگر ہو سکے تو کچھ پیسوں کا انتظام کر دیں! "

"میں نے تو چند دنوں تک مر جانا ہے۔ اب اس دنیا میں جی نہیں لگتا' کچھ نہیں رکھا اس دنیا میں! کوئی شخص میرا حال نہیں پوچھتا' سب کو اپنے اپنے پیسوں کی فکر ہے! "

"خدا کے لئے شیخ صاحب' خدا کے لئے ....! "

"میں صحیح کہہ رہا ہوں ملک صاحب' میں تو ان لوگوں کی وجہ سے دفتر بھی بہت کم آتا ہوں میں نے سب کام بیٹوں کے سپرد کر دیئے ہیں' اب تو کاروبار بھی وہی چلا رہے ہیں! "

"خیر یہ تو اچھی بات ہے کہ بیٹے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں' لیکن آپ کو مایوسی کی باتیں نہیں کرنا چاہئیں "۔

"بڑی مہربانی ملک صاحب! آپ کی باتوں نے مجھے بہت حوصلہ ہوا ہے۔ میں ان دنوں سوچ رہا ہوں کہ دل بہلانے کے لئے یورپ کی سیاحت کو نکل جاؤں! "

"بہت اچھا خیال ہے اگر ہو سکے تو اس دفعہ ایک چکر امریکہ کا بھی لگا لیں"۔

"کیا رکھا ہے جی امریکہ میں! اس قوم کا کوئی کلچر ہی نہیں' سب دولت ہی دولت ہے۔ اب دیکھیں نا دنیا میں صرف پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ پیسہ تو ہاتھ کی میل ہے! "

"وہ تو ٹھیک ہے شیخ صاحب' مگر اس میل کی بھی کبھی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے' میں نے آج اسی لئے فون کیا تھا! "۔

"میں نے چند دنوں تک مر جانا ہے۔ اب تو اس دنیا میں جینے کو جی نہیں چاہتا۔ میں نے تو وصیت کے کاغذات بھی تیار کروا لئے ہیں! "۔

"اللہ نہ کرے شیخ صاحب کہ آپ فوت ہوں..........! "

"جی جی جی! "

"مگر دیکھیں نا! لین دین تو ساتھ ساتھ چلتا ہی ہے "۔

"بالکل بالکل' مگر میں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ بیٹھا ہوں' بس چند دنوں کی بات ہے..........! "

"یعنی کتنے دنوں تک آپ ادائیگی کر دیں گے؟ "۔

"میں ادائیگی کی بات نہیں کر رہا ملک صاحب! چند دنوں تک تو میں نے مر جانا ہے۔ مجھے کہاں ہوش ہے کہ میں نے کس سے کیا لینا ہے' کس کا کیا دینا ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ ملک صاحب! "۔

"آپ بجا فرماتے ہیں شیخ صاحب، لیکن جو دینا ہے، وہ تو دینا ہی ہے!"۔
"مگر میں نے چند دنوں تک مرجانا ہے"۔
"پکی بات ہے"۔
"کون سی بات؟"۔
"یہی کہ آپ نے چند دنوں تک فوت ہو جانا ہے!"۔
"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ملک صاحب! اظہار ہمدردی کی بجائے دوسروں کی طرح آپ بھی میری موت کی دعائیں مانگنے لگے!"۔
"میں ایسی دعا کیسے مانگ سکتا ہوں شیخ صاحب! میں تو صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ موت کے سلسلے میں آپ کا احساس واقعی بہت قوی ہے؟"۔
"جی ہاں آپ یقین کریں مجھے یہی لگتا ہے کہ بس دو چار دنوں تک مر جاؤں گا!"۔
"میں بس یہی پوچھنا چاہتا تھا۔ جہاں میں نے پیسوں کا اتنا عرصہ انتظار کیا تھا، عام حالات میں دو چار مہینے اور انتظار کر لیتا، لیکن اگر آپ کا دو چار دنوں میں فوت ہونا یقینی ہے تو میں ابھی آپ کی طرف پہنچ رہا ہوں تاکہ ایک تو آپ کا آخری دیدار ہو جائے اور رقم ڈوبنے سے بچ جائے، یوں بھی میں چاہتا ہوں کہ میرا دوست خدا کے سامنے سرخرو ہو کر جائے، دوسروں کی دولت، دولت نہیں، نار جہنم ہے، میری خواہش ہے کہ آپ نار جہنم ساتھ لے کر نہ جائیں۔ براہ کرم میرے آنے تک فوت نہ ہوں کچھ دیر انتظار فرمائیں، میں حاضر ہو رہا ہوں۔ خدا حافظ!"۔

۲۴ر مئی ۱۹۸۶ء۔

مولانا مودودی

مولانا سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور یہ ملاقات ان کی کتابوں کے حوالے سے تھی۔ میں اس زمانے میں ابن صفی اور نسیم حجازی کے ناول اور منٹو کے افسانے بہت مزے لے لے کر پڑھا کرتا تھا۔ لیکن سکول کی پڑھائی کے ضمن میں گھر والوں کی سختی کی وجہ سے نسیم حجازی کا ناول رضائی میں چھپا کر یوں پڑھنا پڑتا جیسے ابن صفی کا ناول ہو اور ابن صفی کا ناول میں کچھ اتنی رازداری سے پڑھتا جیسے منٹو کا افسانہ ہو اور منٹو کے افسانے.........! خیر! یہ ذکر چھوڑیں' سو ہوا یوں کہ انہی دونوں اباجی کی لائبریری میں مولانا کا ایک کتابچہ جس کا نام غالباً " دینیات " تھا نظر آیا مجھے اس کی نثر بہت دلکش محسوس ہوئی اور اپنی بات سمجھانے کا انداز بہت مسحور کن لگا میں نے محسوس کیا کہ اس میں دین کی دعوت جذباتیت اور فرقہ پرستی سے ہٹ کر ٹھوس دلائل کے ساتھ دی گئی ہے چنانچہ میں مولانا کے انداز تحریر کا رسیا ہو گیا اور پھر مجھے جہاں ان کی کوئی کتاب نظر آتی' میں اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے ایک تو رضائی میں چھپا کر نہیں پڑھنا پڑتا تھا اور دوسرے اباجی کی نظروں میں میرا وقار خاصا بلند ہو گیا کیوں کہ اب مجھے وہ ایک صالح نوجوان سمجھنے لگے تھے۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ بہت اچھی اچھی باتیں بہت دلکش پیرائے میں کئی دوسری کتابوں میں بھی مل جاتی ہیں' لیکن ان کے مصنف عملی زندگی میں جب نظر آتے ہیں تو ان میں سے بہت سوں کی شخصیت ایک ڈراؤنے خواب سے کم نہیں ہوتی' لیکن مولانا اپنی عملی زندگی میں اپنی کتابوں سے بھی زیادہ خوبصورت لگے خصوصاً اس روز جب بیرون بھاٹی گیٹ ایوب خاں کے حکم سے ان کی تقریر کے دوران پرامن مجمعے پر فائرنگ کی گئی اور جب مولانا کی تقریر سننے والے اس کے باوجود اپنی جگہ سے نہ ہلے' اس وقت بھی نہیں جب ان کے ایک ساتھی کی لاش ان کے درمیان سے اٹھا کر لے جائی گئی تو فائرنگ کا رخ سٹیج کی طرف کر دیا گیا۔ اس وقت مولانا سے کہا گیا " مولانا! آپ خدا کے لئے بیٹھ جائیں! مگر مولانا نے جواب دیا " اگر میں آج بیٹھ گیا' تو کل حق کے دفاع کے لئے کون کھڑا ہو گا! " میں اس واقعے کا عینی شاہد ہوں اور ان لمحوں میں میں نے محسوس کیا کہ مولانا نے اپنی شخصیت کا سب سے موثر نقش میرے دل پر بٹھا دیا ہے۔

مولانا اپنی پہچان اس سے پیشتر بھی کروا چکے تھے جب ختم نبوت کے مسئلے پر محض ایک کتابچہ لکھنے پر انہیں پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ دوسرے " مجرم " مولانا عبدالستار خاں نیازی تھے۔ ان کے لئے بھی پھانسی کا پھندہ تجویز کیا گیا تھا کیوں کہ وہ تحریک کے پرجوش رہنماؤں میں سے تھے۔ محض ایک کتابچہ تحریر کرنے یا آئینی طور پر اپنا

مطالبہ تسلیم کروانے کے جرم میں پھانسی کی سزا سنا دینا' اس امر کا بین ثبوت ہے کہ حکمران اس راہ کے کانٹے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا دینا چاہتے تھے' ورنہ یہ کوئی ایسا جرم نہ تھا چنانچہ ایک ستم ظریف کے بقول مولانا عبدالستار خاں نیازی کو پھانسی کی سزا اس لئے سنائی گئی کہ انہوں نے تحریک میں اتنی گرم جوشی سے حصہ لیا اور مولانا کو اس لئے کہ انہوں نے اتنی گرم جوشی سے حصہ کیوں نہیں لیا؟ بہر حال یہ وہ وقت تھا جب کھرے کھوٹے کی پہچان ہو جاتی ہے۔ میرے والد ماجد مولانا بہاء الحق قاسمی بھی ان دنوں اسی "جرم" میں جیل میں تھے اور دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا عبدالستار خاں نیازی سیاہ لباس میں ملبوس روشن چہروں کے ساتھ تختہ دار کی طرف یوں گئے جیسے محبوب طرحدار سے ملنے جا رہے ہیں۔ مگر حکام چونکہ عمروں کو گھٹانے کے مجاز نہ تھے' اس لئے وہ انہیں مقررہ وقت سے پہلے موت کی دہلیز تک لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکے بلکہ ان کی معرفت مجھے یہ محسوس ہوا کہ ایک شخص ایسا بھی ہے جو اپنے لکھے ہوئے لفظوں کی عملی تفسیر بھی ہے اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ مولانا کی صورت میں حق کا ایک ایسا طرفدار ہمارے درمیاں موجود ہے جسے جھکنا آتا ہی نہیں ہے تو میں نے اس کی بڑائی کے سامنے سر جھکا دیا۔ پھر میں مولانا کی ان محفلوں میں بھی شریک ہونے لگا جو ذیلدار پارک میں ان کے گھر میں منعقد ہوتی تھیں۔ اس دوران ایک انکشاف مجھ پر یہ ہوا کہ مولانا تو بہت شگفتہ طبع بھی ہیں۔ ایک دفعہ جماعت کے رہنما جیل سے رہا ہو کر آئے تو مولانا کی کوٹھی کے لان میں ایک تقریب منعقد کی گئی۔ اس موقع پر جماعت اسلامی کے حبیب جالب یعنی عبداللہ شاکر صاحب نے پنجابی میں ایک نظم سنائی جس میں ایک مصرعہ "پکائی سی کھیر تے بن گیا دلیہ" بھی تھا۔ شاعر نے نظم درمیان میں روک کر مولانا سے پوچھا "مولانا! آپ کو میری پنجابی نظم سمجھ آ رہی ہے؟" مولانا نے کہا "نظم سمجھ میں آئے نہ آئے' مگر مولوی ہوں' کھیر والی بات بہر حال سمجھ میں آ گئی ہے!"۔

جب میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا تو سوچتا تھا کہ مولانا کے بارے میں کیا کہوں گا لیکن اب اتنی باتیں یاد آ رہی ہیں کہ انہیں سمیٹنا مشکل ہو رہا ہے۔ مگر میں یہ کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں اور آخر میں جماعت کے رہنماؤں سے صرف ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں جو بہت اہم ہے۔ یہ گزارش اس لئے ہے کہ مولانا کی بے پناہ دلکش تحریروں اور دین حق کے لئے قربانیوں سے بھری ہوئی ان کی شخصیت کے باوجود' موجودہ انتہائی ظالمانہ نظام نے نوجوانوں کو اتنا کنفیوز کر دیا ہے کہ وہ اب ہر قیمت پر موجودہ مکروہ معاشی نظام کا خاتمہ چاہتے ہیں اور اسے ڈھیلے نظریات کے "سرخ فیتے" کا سہارا بھی نہیں دینا چاہتے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ غربت' افلاس اور استحصال کے ستائے ہوئے چہروں پر روشنی بکھیرنے کے پروگرام کو باقی سب پروگراموں پر ترجیح دی جائے۔ میں جو بات کہنے والا ہوں وہ ایک محفل میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں مگر اسے دہرانے میں کوئی حرج نہیں اور وہ یہ کہ اسلامی نظام پر آپ جو مضمون لکھ رہے ہیں براہ کرم اس میں سے اسلام کے معاشی نظام کی سرخی نکالیں تاکہ لوگ اس سرخی سے "اٹریکٹ" ہو کر یہ مضمون پڑھیں ورنہ لوگوں کا جمگھٹا ان پوسٹروں کے گرد ہو گا جو انہیں کچھ نہ دیتے ہوئے بھی ان سے سب کچھ چھین لیں گے۔ جماعت کے رہنما اگر اس گزارش پر کان دھریں

تو یہ اسلام اور پاکستان کی بہت بڑی خدمت ہو گی بلکہ خود جماعت کے حق میں بھی بہت بہتر ہو گا اور میرے نزدیک یہ کام جماعت اسلامی ہی کر سکتی ہے کیونکہ اس کے پاس مضبوط تنظیم اور انتہائی تربیت یافتہ اور اپنے نصب العین کے ساتھ پوری طرح مخلص کارکن موجود ہیں۔ اتنے پکے کارکن کہ اگر کبھی کسی اختلاف کی بناء پر جماعت اسلامی میں سے نکل بھی جائیں تو عمر بھر جماعت اسلامی ان میں سے نہیں نکلتی!۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۸۶ء۔

مہر دین مالشیا!

لاہور والوں کو جو چیز بہت مرغوب ہے ' وہ سر کی مالش کراتا ہے اور وہ اس کے لئے " عزت سادات " کو بھی خطرے میں ڈال دیتے ہیں ' چنانچہ ہم نے بڑے بڑے شرفاء کو بیچ لکشمی چوک کے مالشیوں کے ہاتھوں " ٹھاپیں " کھاتے دیکھا ہے اور ظاہر ہے اس میں ان کی رضامندی شامل ہوتی ہے سر کی مالش کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ مالشیا دونوں ہاتھوں سے سر کو جھنجوڑنے کے بعد درمیان درمیان میں ایک ہاتھ جھاڑ دیتا ہے اور مالشئے کی یہی وہ ادا ہے جو مالش کرانے والوں کو زیادہ پسند ہوتی ہے ' ہمیں ذاتی طور پر مالش کرانا اتنا پسند نہیں ' جتنا دوسروں کو مالش کرواتے دیکھنا ہے ' کیونکہ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جب مالش کنندہ اور " مالش زدہ " دونوں کی حالت دیدنی ہوتی ہے مالش کنندہ بیک وقت مالش بھی کر رہا ہوتا ہے ' درمیان درمیان میں اس معزز آدمی کو ایک آدھ ہاتھ جھاڑ کر اپنی انا کی تسکین بھی کر لیتا ہے اور اس مالش کے دوران اپنے دونوں ہاتھوں کی ضرب سے تالی کی آواز پیدا کر کے اپنا ذوق موسیقی بھی پورا کر تا رہتا ہے ' اس طرح مالش زدگان بھی اس وقت سرور اور لذت کے عالم میں رتبہ ' منصب ' ذات مقام سبھی کچھ بھول جاتے ہیں اور یوں اس کیفیت میں بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہو جاتے ہیں ' ان لمحات میں مالش زدگان کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں ' ان کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ رہی ہوتی ہے ' اور اس کے نتیجے میں ان کے چہرے پر جو شانتی نظر آتی ہے ' اسے ایک مونوگرام کی صورت میں محفوظ کر لینا چاہئے اور اسے امن و عالم کی علامت کے طور پر فاختہ کی جگہ استعمال کرنا چاہئے

اور لاہور والوں کو اگر سر کی مالش کروانا زیادہ مرغوب ہے تو اہالیان گوجرانوالہ بھی اس شوق میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں ' تاہم ہمارا مشاہدہ یہ ہے انہیں سر کی مالش کی نسبت لتاڑا کروانا زیادہ مرغوب ہے ' ایک دفعہ ہم نے گوجرانوالہ میں برلب سڑک واقع ایک سینما کی دیوار کے ساتھ پانچ چھ معزز لوگوں کو اوندھے منہ لیٹے دیکھا تو ہم سمجھے کہ کوئی احتجاجی مظاہرہ ہو رہا ہے ' مگر دوسرے ہی لمحے ہم پر آشکار ہوا کہ یہ احتجاجی مظاہرہ نہیں بلکہ اجتماعی طور پر لتاڑا کروانے کا مظاہرہ ہے ' مالشیوں نے دیوار کے ساتھ ٹکیں لگوائی ہوئی تھیں ' اپنے اپنے بھاڑو فٹ پاتھ پر لٹائے ہوئے تھے اور سہارا لینے کیلئے ان ٹکوں کو پکڑ کر اپنے " " کو پاؤں سے ضرب خفیف لگا رہے تھے ' ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ یہ مالشیوں کے مستقل اڈے ہیں ' چنانچہ شوقین حضرات لتاڑا کروانے کیلئے یہاں اپنے اپنے " فیورٹ " مالشئے کے پاس آتے ہیں اوندھے منہ لیٹتے ہیں اور من کی مرادیں پاتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری و ساری رہتا ہے۔

چند روز پیشتر ہم اپنے ایک دوست کے پاس لکشمی چوک میں بیٹھے سبز چائے پی رہے تھے ہمارا یہ دوست ملکی

حالات کے بارے میں خاصا پریشان رہتا ہے چنانچہ اس سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے وہ یہ موضوع چھیڑ دیتا ہے اور پھر گھنٹوں بولتا رہتا ہے۔ مالش ہمارے اس دوست کی بھی کمزوری ہے ملک وقوم کے مسائل حل کرنے کے ضمن میں تجاویز پیش کرتے کرتے ہمارے اس دوست کی نظر اچانک ایک مالشئیے پر پڑی جو ہاتھوں میں تیل کی شیشیاں پکڑے اور کانوں میں میل صاف کرنے والی سلائیاں اٹکائے "تیل مالش" کی صدا لگا رہا تھا ہمارے اس دوست نے مالیشئے کو بلایا' اپنی ٹانگیں سامنے پڑی ایک کرسی پر بچھائیں اور پیشگی طور پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ مالیشئے کا نام مہر دین تھا دبلا پتلا سا چہرے سے غیر صحت مند' مگر اس کے ہاتھوں میں بلا کا ہنر تھا۔ اس کا اندازہ ہمیں اپنے دوست کے چہرے کے تاثرات سے ہوا' وہ اس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر لگ رہا تھا اور اس کے چہرے پر وہی شانتی تھی جس کے بارے میں ہم نے تجویز پیش کی ہے کہ اسے ایک مونوگرام کی صورت میں محفوظ کر کے امن عالم کی علامت کے طور پر فاختہ کی جگہ استعمال کرنا چاہئے دریں اثناء مہر دین سر کی مالش سے فارغ ہو کر بازوؤں اور ٹانگوں کی مٹھی چاپی میں مشغول تھا۔ وہ ہمارے دوست کی دکھتی ہوئی رگوں پر ہاتھ رکھتا اور مارے لذت کے ہمارا یہ دوست سسکیاں بھرنے لگتا۔ ہم بیٹھے چائے کی چسکیاں لیتے رہے پھر ہم نے وقت گزاری کے لئے اپنے اس دوست کو مخاطب کیا اور مالیشئے کے آنے سے پہلے سلسلہ کلام جہاں سے ٹوٹا تھا وہاں سے دوبارہ آغاز کرتے ہوئے کہا۔ " یار یہ تم نے انتخابات کے بارے میں جو تجاویز پیش کی ہیں' میں سمجھتا ہوں کہ......... "

مگر ہمارا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہمارے دوست نے ہمیں ٹوک دیا۔ اور نیم غنودگی کے عالم میں بولا " یار لعنت بھیجو انتخابات پر اس موضوع پر پھر کبھی گفتگو کریں گے "۔

اور یہ جو ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ ہم ذاتی طور پر مالش کروانے کے اتنے شوقین نہیں ہیں' تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم مہر دین " مالیشئے " کی سحر کاریوں سے بہت خوفزدہ ہیں۔ یہ دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھنے کا فن جانتا ہے اور وقتی آسودگی کے بدلے دیرپا آسودگی کے بارے میں سوچ بچار کا سلسلہ منقطع کر دیتا ہے۔ ہمیں تو یہ کرکٹ اور ہاکی کے میچوں کا سلسلہ بھی مہر دین مالیشئے کے سلسلے کی ایک کڑی لگتا ہے بلکہ ہم جب بھی مہر دین مالیشئے کو ہاتھوں میں تیل کی شیشی پکڑے ایک معزز آدمی کے سر کی چاپی کرتے دیکھتے ہیں اور وہ معزز شخص دنیا و مافیہا سے بے خبر مارے لذت کے سسکاریاں بھرتا نظر آتا ہے تو ہمیں سیاست دان ہی نہیں ادب برائے ادب کے قائل ادیب بھی یاد آ جاتے ہیں۔ وہ ادیب جو ادب کو کسی اعلیٰ مقصد کے لئے استعمال کرنے کا قائل نہیں بلکہ وہ اسے محض حصول لذت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ مہر دین مالیشا ہے اور جو سیاست دان عوام کی دکھتی رگوں سے واقفیت کے ہنر کو صرف اقتدار کو مضبوط کرنے کا وسیلہ سمجھتا ہے' وہ بھی مہر دین مالیشا ہے۔ دونوں نے ہاتھوں میں تیل کی شیشیاں پکڑی ہوتی ہیں اور دونوں اپنے اپنے بھاروؤں کو سسکاریاں بھرتے چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں گذشتہ ۳۵ برس سے ہم پر صرف ایک حکمران حکومت کر رہا ہے اور اس کا نام مہر دین مالشیا ہے۔

۶ دسمبر ۱۹۸۲ء

بلا تمیز

ہم نے محسوس کیا ہے کہ لوگو ہماری باوقار پرسنیلیٹی کی بناء پر ہم سے خصوصی سلوک کرتے ہیں بلکہ عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ ہم جب ٹیلی فون پر کسی سے بات کرتے ہیں تو وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ٹیلی فون سنتا ہے اور اس وقت تک کھڑا رہتا ہے تا آنکہ ہم اپنا نام نہیں بتاتے۔ خود ہمارا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ہم جب آٹے کی پرات اٹھا کر تندور پر روٹیاں لگوانے جاتے ہیں تو لگتا ہے وہاں پر پہلے سے موجود لوگ ہمارے لئے سراپا انتظار بنے بیٹھے تھے۔ چنانچہ وہ ہمیں دیکھتے ہی تندور کی چوکی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں "چلیں' صوفی جی اپنی نشست سنبھالیں! گھر میں بچے رو رہے ہیں" ۔ کئی دفعہ ایسے بھی ہوا کہ ہم کسی ہوٹل میں کھانا کھانے گئے ہیں اور ہوٹل میں صفائی کا معیار اگرچہ مثالی نہیں ہے مگر بیرے نے ہمارے لئے خصوصی برتاؤ کے طور پر پلیٹ میز پر سجانے سے پہلے اپنی دھوتی کے پلو سے پلیٹ کو اچھی طرح صاف کیا اور گلاس کچھ اس سے بھی اچھے طریقے سے صاف کیا۔

عوام الناس کے اس محبت بھرے سلوک کو دیکھتے ہوئے کئی دفعہ ہماری آنکھیں بھر آتی ہیں۔ بلکہ ایک دفعہ تو کچھ اسی قسم کی صورت حال میں ہم شدید جذباتی ہو گئے۔ ہم نے ایک ریستوران کے بیرے سے پوچھا کہ یہاں باتھ روم کی سہولت موجود ہے' .... 'اس پر بیرے نے کہا کمال ہے صاحب کسی اور کے لئے ہو نہ ہو' آپ کے لئے بہر حال ہے۔ یہ کہہ کر وہ مالک کے پاس گیا ہمارا حوالہ دے کر اس سے چابی مانگی اور کہا میرے ساتھ آئیں۔ ایک بڑے دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا' چابی سے اس مقفل دروازے کو کھولا' دروازہ کھلا تو سامنے ایک گلی تھی جس کے درمیان میں نالی بہہ رہی تھی' بیرے نے نالی کی طرف اشارہ کیا' چابی ہمیں تھمائی اور کہا واپسی پر دروازے کو تالا لگا دیں اور چابی مجھے دے دیں!

ہم نے اپنے ایک حاسد دوست کو اپنی اس نوع کی پذیرائی کے واقعات سنائے تو وہ جل کر کباب ہو گیا اور اس نے کہا کہ یہ خصوصی سلوک صرف تمہارے لئے نہیں ہے بلکہ سب کے لئے ہے' لہٰذا تمہیں خواہ مخواہ بڑیں نہیں ہانکنا چاہئیں۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے؟۔ چنانچہ اس مقولے کی روشنی میں ہم نے اس کی باتوں پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ تو صحیح کہتا ہے مثلاً ایک دن ہم نے ایک شخص کو دیکھا اس نے ایک ریڑھی سے کیلے خریدے اور چل دیا' وہ چلتے ہوئے کیلے چھیل چھیل کر کھاتا جا رہا تھا اور چھلکے دوسرے ہاتھ میں جمع کرتا جاتا تھا۔ ایک چوراہے میں پہنچ کر وہ ایک ٹریفک کانسٹیبل کے پاس گیا اور کہا "سنتری جی' یہ چھلکے کہاں پھینکنے ہیں" یہ سن کر سنتری جی ہنسے اور بولے "بادشاہو جہاں مرضی پھینکیں' یہ سارا ملک آپ کا ہے!"

اسی طرح ہم نے ایک غریب سے شخص کو دیکھا کہ کُلچے لگوانے آیا' کلچے لگانے والے کے پاس دھری پیالی میں پانی ختم ہو گیا تھا' جس سے پیڑے کو تر کیا جاتا ہے' مگر گرمیوں کے دنوں میں کرتا اتار کر تندور کے پاس بیٹھے دوکاندار نے پانی کی عدم موجودگی کا احساس نہیں ہونے دیا چنانچہ وہ ہر پیڑا تندور پر لگانے سے پہلے اپنے پیٹ پر لگاتا تھا جو پسینے سے تربتر تھا اور یوں اس غریب گاہک کو یہ احساس نہ ہونے دیا گیا کہ اس کے لئے تیار کئے گئے کلچوں میں تمام لوازمات پورے نہیں کئے گئے۔

یہ منظر ہم نے قصاب کی دوکان پر بھی دیکھا ہے کہ وہ غریب 'امیر' معزز' غیر معزز سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے۔ اس نے اپنے پاؤں کے انگوٹھے میں چھری پھنسائی ہوتی ہے گوشت کی بوٹیاں بنا رہا ہوتا ہے جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہوتی ہیں' ایسا کبھی نہیں ہوا کہ قیمہ بناتے ہوئے اگر کسی معزز گاہک کے سودے میں دس بارہ مکھیاں مفت میں ساتھ چلی گئی ہیں تو کسی دوسرے گاہک کو محض اس کی کمزور سماجی حیثیت کی وجہ سے اس بونس سے محروم رکھا گیا ہو۔ اسی طرح بازار میں ملنے والی سرخ پسی ہوئی مرچوں میں سب کے لئے یکساں طور پر درجہ سوم کی اینٹ مکس کی جاتی ہے یہ نہیں کہ معزز گاہکوں کے لئے الگ سے درجہ اول کی اینٹ پیس کر ان میں ملائی جاتی ہو چائے کی پتی میں بھی خاص و عام کے لئے کسی عام درخت کی چھال ملائی جاتی ہے اور آٹے میں گھروں سے اکٹھا کیا گیا چھان بورا بھی بغیر کسی امتیاز کے ملا دیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ سب باتیں بیان کرتے ہوئے ہماری انا کو خاصی ٹھیس پہنچ رہی ہے مگر حقیقتوں کا اعتراف تو کرنا پڑتا ہے۔

اور اس سے بڑی حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود قدرت بھی ایسے معاملات میں تمیز بندہ و آقا کی قائل نہیں' چنانچہ مرچوں میں اینٹیں ملانے والے اور یہ مرچیں کھانے میں استعمال کرنے والے مرتے ہیں تو دفن دونوں ایک جیسی مٹی میں ہوتے ہیں۔ قبر کا سائز بھی ایک جتنا ہوتا ہے اور فانی جسم پر پلنے والے کیڑے مکوڑے بھی سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے کالم کے آغاز میں جو خود ستائی کی تھی' اسے کالعدم سمجھا جائے اور جان لیا جائے کہ ہمارے ہاں زندوں اور مُردوں دونوں کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا ہے اور اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی جاتی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اب ہمارے ہاں زندوں اور مُردوں میں فرق بہت کم رہ گیا ہے!۔

ایک ہوائی کالم

دوسروں کے گھروں میں جھانکنا کوئی اچھی بات نہیں لیکن ہمارے دوسرے اعمال کون سے اتنے اچھے ہیں کہ اس برائی سے احتراز کرنے سے ہمارا شمار فرشتوں میں ہونے لگے گا چنانچہ ہم زمین پر چلتے ہوئے "اندر" ہو جانے کے خوف سے ممکن ہے تاکا جھانکی سے پرہیز کرتے ہوں مگر جب ہمارے پاؤں زمین پر نہیں ہوتے یعنی جس وقت ہم فضاؤں میں پرواز کر رہے ہوتے ہیں تو ہزاروں فٹ کی بلندی سے ان گھروں میں ضرور جھانکتے ہیں جہاں عام حالات میں جھانکنے کا ہمیں حوصلہ نہیں پڑتا یوں بھی جہاز پر سے بڑے بڑے ایوان بھی چھوٹے چھوٹے نقطوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور جو عام حالات میں بھی چھوٹے چھوٹے نقطے ہیں، وہ جہاز پر سے اور بھی حقیر نظر آنے لگتے ہیں چنانچہ رہا سہا خوف بھی دل سے نکل جاتا ہے گذشتہ ہفتے لاہور سے اسلام آباد تک کے فضائی سفر میں ہم نے حسب معمول اس تانکا جھانکی کا مظاہرہ کیا یعنی ہزاروں گھروں پر سے گزرتے ہوئے ہم نے چشم تصور میں ان گھروں میں جو ہوتے دیکھا اور جو سنا اس کی چند جھلکیاں آپ کو بھی دکھاتے ہیں تو لیجئے ملاحظہ فرمائیں۔

ایک صاحب اقتدار کا گھر

ایک محل نما عالیشان کوٹھی۔ پورچ میں نئے ماڈل کی تین چار کاریں کھڑی ہیں گھر کے ڈرائنگ روم میں باپ اور بیٹا محو گفتگو ہیں۔

بیٹا۔ ابو الیکشن تو آپ نے جیت لیا وزارت بھی آپ کو مل گئی مگر آپ کے ہاتھ کیا آیا؟

باپ۔ کیا مطلب، میں سمجھا نہیں!

بیٹا۔ الیکشن پر آپ کے کوئی تیس لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں تیس لاکھ روپے پاس ہوں تو حکومت سے لون لے کر کوئی ایک کروڑ روپے کی انڈسٹری لگائی جا سکتی ہے۔

باپ۔ میں نے تمہیں کئی دفعہ کہا ہے اتنی مادہ پرستی ٹھیک نہیں بیٹے جانی، دنیا میں دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی!

بیٹا۔ مجھے آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں ابو

باپ۔ دیکھو بیٹا میرا نصب العین عوام کی خدمت ہے جب کئی برس قبل میں الیکشن میں کھڑا ہوا تھا تو میرے پاس کیا تھا لوگوں نے چندہ کر کے میرا زر ضمانت جمع کرایا تھا اللہ کے فضل سے میں کامیاب ہوا اب یہ جو کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے عوام کی دیرینہ خدمت ہی کا صلہ ہے ورنہ میرے پاس تو تمہارے سکول کی فیس ادا کرنے کے پیسے بھی

نہیں ہوتے تھے۔

بیٹا۔ وہ تو سب ٹھیک ہے ابو، مگر اس دفعہ عوام کی خدمت کا کچھ صلہ ملتا نظر نہیں آتا۔

باپ۔ نہیں بیٹے، اگر ایسا ہوتا تو میری طرح کے سینکڑوں لوگ عوام کی خدمت کے لئے بے چین نہ ہوتے میری طرح ان سب کو اپنے عوام پر مکمل اعتماد ہے۔

بیٹا۔ لیکن اگر ایم آر ڈی والوں نے کوئی کامیاب تحریک چلا کر حکومت کا تختہ الٹ دیا تو؟

باپ۔ تو بیٹے پھر کیا ہوا، ایم آر ڈی والے کوئی غیر تو نہیں ہیں وہ بھی ہمیں میں سے ہیں میں نے اور تمہارے تایا ابو نے الیکشن لڑنے سے پہلے پرچیاں ڈالی تھیں کہ کون الیکشن لڑے گا اور کون الیکشن کی مخالفت کرے گا میرا نام پرچی میں نکل آیا چنانچہ میں حکومت میں ہوں تمہارے تایا ابو ایم آر ڈی میں ہیں۔

بیٹا۔ مجھے تو آپ کی باتیں سمجھ نہیں آتیں ابو۔

باپ۔ سمجھ جاؤ گے بیٹے، سمجھ جاؤ گے، یہ باتیں خود مجھے بھی بہت دیر بعد سمجھ میں آئی تھیں۔

ایک اپوزیشن لیڈر کا گھر

لیڈر اپنی حویلی نما محل میں بیٹھا ہے ارد گرد کئی خستہ حال کارکن بیٹھے نظر آ رہے ہیں۔

کارکن یہ جو حفیظ پیرزادہ، عطاء اللہ مینگل اور ممتاز بھٹو وغیرہ کھلے لفظوں میں کنفیڈریشن کی باتیں کر رہے ہیں تو کیا ہم سمجھیں کہ یہ پارٹی لائن ہے۔

لیڈر۔ آج گرمی کچھ زیادہ ہے اوئے لڑکے، یہ دوسرا ائر کنڈیشنر بھی آن کر دو۔

کارکن۔ ایم آر ڈی کو چاہئے کہ وہ ملک دشمنی کی باتیں کرنے والے نام نہاد لیڈروں کے خلاف سخت ایکشن لیں ہمیں پارٹی سے محبت اس لئے ہے کہ ہمیں پاکستان سے محبت ہے، ہم یہاں مکمل جمہوریت لانا چاہتے ہیں ملک توڑنا نہیں چاہتے۔

لیڈر۔ اس دفعہ خربوزے بہت میٹھے آ رہے ہیں اوئے لڑکے جاؤ فریج میں سے خربوزے نکال کر لاؤ۔

کارکن۔ آپ ہماری باتوں پر دھیان نہیں دے رہے اگر آپ ہماری باتیں نہیں سننا چاہتے تو ہم اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔

لیڈر۔ نہیں نہیں، یہ تم کیا کہہ رہے ہو میں تمہاری باتیں بڑے غور سے سن رہا ہوں مگر تم ساتھ ساتھ یہ خربوزے بھی تو کھاؤ بہت میٹھے ہیں۔

کارکن۔ لیکن ہماری بات کا جواب آپ نے پھر بھی نہیں دیا۔

لیڈر۔ بھئی تم لوگ ٹھیک کہتے ہو مگر وہ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ تمہاری باتوں میں بھی خلوص ہے ان کی باتوں میں بھی خلوص ہے تم بھی محب الوطن ہو وہ بھی محب الوطن ہیں۔

کارکن۔ جناب! یہ آپ ہمارے سوالوں کا جواب دے رہے ہیں یا سیاسی تجزیے کے نام پر لکھے جانے والے بعض کالموں والا کام کر رہے ہیں۔

لیڈر۔ بھئی تم بھی ٹھیک کہتے ہو اور جن کا تم حوالہ دے رہے ہو وہ بھی ٹھیک کہتے ہیں تمہاری باتیں بحث طلب ہیں ان پر گفتگو کے لئے خاصا وقت در کار ہے میں ذرا ایک اہم میٹنگ میں جا رہا ہوں تم بیٹھو اوئے لڑکے فریج میں سے اور خربوزے نکال کر لاؤ۔

ایک صنعت کار کا گھر

صنعت کار۔ بیٹے۔ میری طرف سے تمام کارکنوں کو گرمیوں کے دو دو جوڑے بطور تحفہ دینے کا اعلان کر دو!

بیٹا۔ ابو، اعلان کیا وہ جوڑے تو انہیں دیئے بھی جا چکے ہیں آپ تو بہت جلدی بھول جاتے ہیں۔

صنعت کار۔ بچارے اللہ بخش کا ہاتھ مشین میں آکر کٹ گیا تھا میں نے کہا تھا کہ تمام عمر کے لئے اسے پوری تنخواہ دینے کے آرڈر کئے جائیں اس کا کیا بنا؟

بیٹا۔ یہ ہو گیا تھا اور وہ آپ کو بہت دعائیں دیتا ہے۔

صنعت کار۔ اور ہاں دیکھو نذیر کی بیوہ کے لئے تا عمر وظیفہ جاری کر دو اللہ جنت بخشے وہ بھی بہت محنتی کارکن تھا۔

بیٹا۔ ٹھیک ہے ابو۔

صنعت کار۔ اور مجھے یاد دلانا محمد دین کو اس کی بیٹی کے جہیز کے لئے پانچ ہزار روپے کا چیک دینا ہے۔

بیٹا۔ بہت اچھا ابو، مگر وہ بچارا فضلو چھ ماہ سے ہسپتال میں پڑا ہوا ہے۔

صنعت کار۔ اسے اس کی تنخواہ تو مل رہی ہے نا؟

بیٹا۔ جی ابو، مگر بچارا غریب آدمی ہے ہسپتال کا خرچ اس کی استطاعت سے بہت زیادہ ہے۔

صنعت کار۔ کوئی بات نہیں اسے کہو ہسپتال کے سارے بل ہم ادا کریں گے۔

بیٹا۔ ابو آپ کتنے اچھے ہیں لیکن میں ایک بات کہوں۔

صنعت کار۔ کہو بیٹے کہو۔

بیٹا۔ آپ اس قدر صدقہ زکوۃ اور خیرات دیتے ہیں لیکن ان مدوں سے جتنی مراعات آپ اپنے مزدوروں کو

دے رہے ہیں اگر اس سے آدھی مراعات بھی آپ ان کی شرائط ملازمت میں شامل کر دیں تو اس سے ان کی انا

مجروح ہونے سے بچ جائے۔

صنعت کار۔ وہ تو ٹھیک ہے بیٹے مگر پھر ہمیں مخیر کون کہے گا؟

ایک کالم نگار کا گھر

کالم نگار۔ بیٹے میں یہ کالم چھپنے کے لئے بھیج رہا ہوں ذرا ایک نظر دیکھ لو۔

بیٹا۔ دیکھ لیا ہے۔ ابو!

کالم نگار۔ حکومت تو ناراض نہیں ہوگی؟

بیٹا۔ وہ تو ہوگی۔

کالم نگار۔ اپوزیشن والے؟

بیٹا۔ وہ بھی ناراض ہوں گے۔

کالم نگار۔ اور صنعت کار؟

بیٹا۔ ابو وہ بھی ناراض ہوں گے۔

کالم نگار۔ کوئی بات نہیں تم یہ دفتر بھجوا دو یہ میرا کوئی آخری کالم تو نہیں ہے' آئندہ ہفتوں میں ایک ایک کالم ان کی حمایت میں لکھ دوں گا اس قسم کا ایک کالم برسوں کی خوشامد پر پردہ ڈالنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

۲۴ اپریل ۱۹۸۵ء

مولوی صاحب

گذشتہ روز ہم نے ایک مولانا کو سرراہے روکا اور انہیں بصد اصرار ایک قہوہ خانے میں لے گئے۔ مولانا سے ہمارے دیرینہ عقیدت مندانہ تعلقات ہیں۔ ہم نے چائے کا آرڈر دیا اور چائے آنے پر ایک کپ مولانا اور ایک کپ اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہا "حضرت! بہت دنوں سے جی چاہتا تھا کہ آپ کی صحبت سے فیض اٹھایا جائے' مگر مکروہات دنیا سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج چند لمحے آپ کی صحبت میں میسر آئے"۔ مولانا نے فرمایا۔ "من آنم کہ من دانم' آپ کیوں اس گنہگار کو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں"۔ ہم نے کہا "حضرت! آپ کا انکسار آپ کی عظمت کی دلیل ہے۔ بہرحال ممنون ہوں کہ آپ نے چند لمحے اپنے قیمتی وقت میں سے اس ہیچمدان کو بھی عطا فرمائے۔

مولانا نے فرمایا "اللہ تعالیٰ آپ کو حسن نیت کا اجر عطا فرمائے 'مگر ایسی کونسی بات تھی کہ آپ نے اس ننگ اسلاف کو یاد کیا!" ہم نے عرض کیا! یا حضرت' آپ خود کو ننگ اسلاف نہ کہیں ورنہ کچھ ناسمجھ لوگ وفور عقیدت میں آپ کے اس کہے کو بھی سچ تصور کر بیٹھیں گے' ویسے نئے دور کے بعض نئے مسائل کے بارے میں آپ سے رہنمائی حاصل کرنا تھی' اس اس لئے آپ کو زحمت دی" فرمانے لگے' "آپ کن مسائل کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں"۔ عرض کیا "کفار نے کچھ ایسی ایجادات کی ہیں کہ جن سے بہت پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں' مثلاً اس ایک کیمرے کی وجہ سے گھر گھر میں بت خانے کھل گئے ہیں' کوئی اخبار ایسا نہیں' جس میں مردوں اور عورتوں کی تصویریں شائع نہ ہوتی ہوں"۔

حضرت نے فرمایا "زندہ چیزوں کی تصویر بنانا حرام ہے لہٰذا جملہ مومنین کو چاہئے کہ وہ اس سے اجتناب کریں۔ علماء کا سواد اعظم تصویر کشی کو متفقہ طور پر خلاف شرع سمجھتا ہے" ہم نے کہا "یا حضرت! نامور علما میں سے شاید ہی کوئی عالم ایسا ہو جس کی تصویر اخبار میں شائع نہ ہوتی ہو' "حضرت نے فرمایا" یہ تصویریں ان کی بے خبری میں کھینچی گئی ہوں گی!" ہم نے عرض کیا' نہیں حضرت! انہوں نے یہ تصویریں باقاعدہ پوز بنا کر کھنچوائی ہیں' بلکہ بعض سیاسی جماعتوں سے وابستہ جید علما تو اخبار والوں سے خفا ہو جاتے ہیں، اگر ان کے بیان کے ساتھ ان کی تصویر شائع نہ کی جائے! اس پر حضرت نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "یہ ان کے ایمان کی کمزوری ہے!"

پھر ہم نے عرض کیا "قبلہ گاہی! دور حاضر کی ایک ایجاد ریڈیو بھی ہے' جس کی وجہ سے گھر گھر میں "استاد

جی " پہنچ گئے ہیں۔ یہاں سے مخرب اخلاق گانے نشر ہوتے ہیں' طبلہ سارنگی کی آوازیں آتی رہتی ہیں اور پائل کی چھم چھم سنائی دیتی ہے۔" مولانا نے فرمایا "یہ سب کچھ خلاف شرع ہے چنانچہ گھروں میں ریڈیو رکھنے سے اجتناب کرنا چاہئے!" عرض کیا "مگر حضور' یہ ریڈیو رکھنا بھی پڑتا ہے کیونکہ یہاں سے علماء کی دلپذیر تقریریں بھی نشر ہوتی ہیں۔ بولے "بس وہ تقریریں سن لیا کریں عرض کیا' مگر یہ تقریریں ٹھمریوں اور گانوں کے درمیان پھنسی ہوتی ہیں اور اتنی اعلیٰ پائے کی دینی نوعیت کی تقریریں سننے کے لئے یہ اناؤنسمنٹ بھی سننا پڑتی ہے کہ ابھی آپ نے استاد ماشے خاں سے راگ ملہار سنا' اب مولانا سرکار علی سے اخلاق حسنہ پر تقریر سماعت فرمائیں' بلکہ بعض اوقات تو اناؤنسر کی مخبوط الحواسی سے اناؤنسمنٹ الٹ پلٹ بھی ہو جاتی ہے"۔ اس پر حضرت نے ٹھنڈی سانس بھری اور فرمایا' "ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ ہم لوگوں کو چاہئے کہ ایسی دکان سے آب زم زم نہ خریدیں جہاں شراب بھی فروخت ہوتی ہو!" عرض کیا "پھر گھر میں ریڈیو رکھنے کے بارے میں آپ کا حتمی ارشاد کیا ہے" فرمایا گھر میں ریڈیو اور ریڈیو میں علماء نہیں ہونے چاہئیں جو لوگ ایسا کرتے ہیں' وہ اپنے کی کمزوری کا ثبوت دیتے ہیں!"

ہم نے کہا "مولانا! ایک الجھن اور بھی ہے" فرمایا "وہ کیا" عرض کیا "ٹیلی ویژن معاشرے میں بہت فساد پیدا کر رہا ہے۔ اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟" فرمانے لگے "یہ بھی تصویر کشی کے زمرے میں آتا ہے' اس کا دیکھنا حرام ہے!" عرض کیا "یا حضرت! اس میں ایک قباحت اور بھی ہے۔ فرمایا "وہ کیا؟" عرض کیا "جو خواتین و حضرات اس کے پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں' انہیں سکرین پر آنے سے پہلے میک اپ مین سے باقاعدہ میک اپ کروانا پڑتا ہے' حتیٰ کہ مردوں کو بھی سرخی پاؤڈر لگایا جاتا ہے!" فرمایا "مردوں کے لئے تو خصوصاً یہ بہت نازیبا بات ہے"۔ ہم نے کہا "حضرت! ریکارڈنگ سے پہلے میک اپ روم میں ان علماء کا میک اپ بھی کیا جاتا ہے' جو دینی پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں چنانچہ ایک کرسی پر ڈرامے کی کوئی اداکارہ بیٹھی میک اپ کروا رہی ہوتی ہے اور اس کی برابر والی کرسی پر کسی عالم دین کا میک اپ ہو رہا ہوتا ہے! فرمایا "یہ ایمان کی کمزوری ہے"۔

عرض کیا "یا حضرت! فلموں میں بہت عریاں مناظر ہوتے ہیں تشدد دکھایا جاتا ہے' نئی نسل کو بے راہ روی کی طرف مائل کیا جاتا ہے!" فرمانے لگے "اس کیا شبہ ہے' ہماری بیشتر معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کی جڑ سنیما ہے"۔ ہم نے کہا "سنسر بورڈ کے چیئرمین ڈاکٹر صفدر محمود اپنے طور پر فلموں میں ان برائیوں کی جڑ کاٹنے میں مشغول ہیں"۔ فرمایا "اس سے کیا ہوتا ہے' کنوئیں سے سو بو کے پانی بھی نکالا جائے' لیکن اگر کتا کنوئیں ہی میں رہے تو کنواں پاک نہیں ہوتا۔ جو چیز شرعی طور پر حرام ہے' وہ حرام ہی رہے گی!" عرض کیا "مولانا! سنسر بورڈ میں علماء بھی ہوتے ہیں' چنانچہ اگر فلم میں کوئی عریاں سین ہو تو اسے بار بار چلا کر دیکھا جاتا ہے تاکہ فلم میں اس کا نام و نشان تک نہ رہنے دیا جائے!" فرمایا "یہ بھی ایمان کی کمزوری ہے!"

ہم نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا "مولانا آپ کو چائے کیسی لگی؟" فرمایا "بہت عمدہ چائے ہے" ہم

نے پوچھا "ریستوران کیسا ہے؟" فرمانے لگے "بہت صاف ستھرا ہے' آج آپ کی طفیل یہ ریستوران دیکھنے کا موقع ملا' آئندہ یہیں آیا کروں گا!" ہم نے کہا "حضرت! ایک بات آخر میں اور عرض کرنا چاہتا ہوں!" فرمانے لگے "کہئے کہئے!" عرض کیا "میں نے علماء سے سنا ہے کہ بازاروں میں کھانا پینا شرعی طور پر ایک ناپسندیدہ فعل ہے' بلکہ بازاروں میں کھانے پینے والوں کی گواہی بھی قابل قبول نہیں ہوتی۔ اس حوالے سے صرف ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں" گھبرا کر فرمایا "کہو کہو" عرض کیا "مختلف مسائل کے حوالے سے جو آپ نے ابھی ابھی آراء دی ہیں' متذکرہ اصول کی روشنی میں' میں آپ کی ان گواہیوں کو معتبر نہیں سمجھتا لہٰذا جو امور میں آپ کے ساتھ زیر بحث لایا ہوں' وہ میں کسی جید اور باعمل عالم سے ڈسکس کروں گا! خدا حافظ

۴ فروری ۱۹۸۳ء

علی سردار جعفری

بھارت کے معروف شاعر علی سردار جعفری ان دنوں پاکستان میں ہیں ' بلکہ تین چار روز پیشتر وہ لاہور میں تھے۔ ہمیں ان کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریب کی اطلاع اس پوسٹر کے ذریعے ہوئی جو پوئٹری فورم والوں نے ٹی ہاؤس کے دروازے پر چسپاں کر رکھا تھا۔ سبحان اللہ کیسا کیسا ماسکو نواز دانشور اس روز ٹی ہاؤس کے بالاخانے میں موجود تھا ' اپنے عبداللہ ملک تھے ' حمید اختر تھے ' امین مغل تھے ' ڈاکٹر مبشر حسن اور صفدر میر کو ماسکو نواز کہتے ہوئے ہمیں تکلیف ہو رہی ہے کیونکہ خود انہیں بھی اپنے لئے یہ ٹائیٹل پسند نہیں ' مگر کیا کیجئے کہ قومی اور بین الاقوامی مسائل پر ہمارے یہ دانشور جو لائحہ عمل اختیار کئے ہوئے ہیں وہ " بندہ نوازی " سے زیادہ ماسکو نوازی ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر مبشر حسن ' عبداللہ ملک اور حمید اختر ایسے صاحب ثروت دانشوروں کے درمیان ایک غریب شہر حبیب جالب بھی تھے۔ جو بطور خاص ان کو تکتے تھے ایک دوست نے ہم سے پوچھا حبیب جالب انہیں اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں ہم نے کہا وہ لکھ پتی ترقی پسندوں کو حیرت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں دوست نے کہا اس میں حیرت کی کون سی بات ہے انہوں نے کوئی لکھ پتی ترقی ترقی پسند پہلے نہیں دیکھا؟ ہم نے جواب دیا ' دیکھا ہے ' مگر اکٹھے نہیں دیکھے! اللہ جانے ان لکھ پتی ترقی پسندوں نے اردو ادب اور سیاست کے معروف نام اور اپنے ایک پرانے ساتھی کے لئے ان کے شایان شان تقریب کا اہتمام کیوں نہ کیا۔ اس کے لئے ٹی ہاؤس ایسی " پرولتاری " جگہ کا انتخاب کیوں کیا۔ جہاں پچاس سے زیادہ لوگ جمع ہو جائیں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ چنانچہ جب علی سردار جعفری یہاں اپنی شاعری سنا رہے تھے تو شاعروں کو دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

اور ہاں ' اس تقریب کے صدر حمید اختر تھے اور صفدر میر ' معزز مہمان کو خوش آمدید کہنے کے لئے خطبہ استقبالیہ پڑھ رہے تھے۔ اپنے استقبالی خطبے میں انہوں نے ٹھیک ٹھیک نشانے لگائے ' ترقی پسند تحریک کی تاریخی اہمیت کو اجاگر کیا ' اس انتہاپسندی کے حوالے سے ایک اشارہ انہوں نے علی سردار جعفری کے اس دور کے رویئے کی طرف بھی کیا۔ صفدر میر نے اپنے اس مضمون میں " مساوات " کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلے " سوشلسٹ " افسانہ نگار انور سجاد کی " کومٹ منٹ " پر حرف گیری کی اور پھر " رجعت پسند " افسانہ نگار انتظار حسین کے " نان کمیٹڈ " رویئے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور یوں دونوں طرف سے ایک ایک آدمی مارا گیا ' مقابلہ برابر رہا۔ ویسے صفدر میر ان دنوں انتظار حسین کے بہت لتے لے رہے ہیں اور سچ پوچھیں تو " ترقی پسند " دانشوروں میں اب ایک صفدر میر ہی ہیں جو انتظار حسین جیسے " رجعت پسندوں " سے متھا لگاتے ہیں ورنہ اس وقت تو صورت

حال یہ ہے کہ آدھے ترقی پسند انتظار حسین کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں، باقی وزیر آغا کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ خود علی سردار جعفری نے اپنے پرچے کا جو "ترقی پسند ادب" نمبر شائع کیا تھا' اس میں انتظار حسین کا افسانہ بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس پر کسی نے علی سردار جعفری سے پوچھا تھا کہ جناب! کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ انتظار حسین ترقی پسند ہو گئے ہیں! اگر پیشتر اس کے کہ علی سردار کوئی جواب دیتے، قریب کھڑے کسی ستم ظریف نے کہا "نہیں! اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہئے کہ علی سردار جعفری اب ترقی پسند نہیں رہے"۔

خیر' ہم تو علی سردار جعفری کو پہلے بھی ترقی پسند مانتے تھے اور آج بھی ترقی پسند مانتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض کو لندن میں انہوں نے ہی "ترقی پسندی" کا درس دیا تھا' جس کے نتیجے میں فہمیدہ ریاض آج بھارت میں پاکستان کی "فوجی جنتا" کو برا بھلا کہتی ہیں اور بھارت کی فوجی پریڈوں میں بطور انقلابی شاعرہ کے شریک ہوتی ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں۔

یہ رتبہ' بلند ملا' جس کو مل گیا؟

چنانچہ علی سردار جعفری نے یہاں بھی اپنی تقریر میں یہی کہا کہ فکری تحریکوں کے لئے تشدد ضروری ہوتا ہے' لہٰذا ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند ادبی تحریک میں بھی اگر یہ رویہ در آیا تھا تو یہ بہت ضروری تھا' تاہم نعرے بازی کا ادب اپنی جگہ پر اہم ہونے کے باوجود' زندہ نہیں رہا کرتا' چنانچہ اس طرح کا ادب اپنی موت آپ مر چکا ہے اور باقی صرف خالص ادب بچا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا کلام سنایا مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کلام ان کے نعرے بازی والے دور کا ہے یا وہ جو دستبرد زمانہ سے بچ گیا ہے' کیونکہ اس میں جہاں کہیں "قاتل" وغیرہ کا لفظ آتا تھا' کامریڈ سامعین واہ واہ کے شور سے اگلے مصرعے کو "مقتول" بنا دیتے تھے۔ ادھر کشور ناہید نے فرمائش کر کے جو نظم سنی اس کا عنوان بھی "قتلِ آفتاب" تھا۔ چنانچہ یہ شام جو علی سردار جعفری کے اعزاز میں تھی، شام غریباں میں تبدیل ہو گئی اور ہاں ایک نظم جعفری صاحب نے خود بہت ذوق شوق سے سنائی' یہ نظم ۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے حوالے سے تھی اور محکمہ اطلاعات ہند کی "منظور شدہ" تھی کیونکہ یہ بھارتی ٹیلی ویژن سے تین مرتبہ نشر ہو چکی ہے ہمارے کامریڈ دوستوں نے اس نظم پر بھی بہت کھل کر داد دی۔ ہم جناب صفدر میر کا ردعمل نوٹ نہ کر سکے' جو ۶۵ء کی جنگ میں کھلے ٹرک میں کھڑے ہو کر "چلو واہگے کی سرحد پر" والی نظم بڑے جوش و خروش سے پڑھا کرتے تھے۔ بہرحال علی سردار جعفری کو اس روز ہم نے "ننگی آنکھ" سے دیکھا اور بہت انقلابی روپ میں دیکھا' ورنہ اس سے پہلے تو ہم انہیں بھارتی ٹیلی ویژن پر دیکھا کرتے تھے یا آل انڈیا ریڈیو سے سنا کرتے تھے۔

۸ جون ۱۹۸۳ء

ہاتھ دکھانے والا

ہم پامسٹری پر تھوڑا بہت یقین تو رکھتے ہیں مگر اس میں برائی یہ ہے کہ اچھے خاصے غیور آدمی کو صرف اپنے بارے میں جاننے کی خاطر دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ یہ پامسٹری پر تھوڑا بہت یقین بھی اس لئے ہے کہ دو ایک دفعہ دست شناسوں کی بتائی ہوئی باتیں سو فیصد درست نکلی ہیں مثلاً بچپن میں ایک نجومی نے ہمارا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا "تمہارے آئندہ چھ ماہ سخت مشکلات میں بسر ہوں گے"۔ اس پر ہم نے پوچھا "اور اس کے بعد؟" اس نے ہمارے ہاتھ کی لکیروں کو ایک بار پھر غور سے دیکھتے ہوئے کہا "اور اس کے بعد تم ان مشکلات کے عادی ہو جاؤ گے"۔ ایک اور نجومی کو ہم نے ہاتھ دکھایا تو اس نے یہ نوید سنائی کہ تم بہت بڑے رائٹر بنو گے اور اس پیشگوئی کے درست نکلنے کی گواہی آج بھی ہمارے علاوہ وہ نجومی ہی دے سکتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں تو خود ہم نے بھی ہاتھ دیکھنا شروع کر دیئے تھے اور اسے حسن اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا کہا ہمیشہ درست نکلا اور ہاتھ دکھانے والوں نے کبھی ہمارے بیان کو نہ جھٹلایا مثلاً ہم ہاتھ میں ہاتھ لئے کافی دیر تک لکیروں کو ٹٹولتے رہتے اور بالآخر یہ مژدہ سناتے کہ تمہارا ہاتھ بہت خوبصورت ہے اور اس کی کبھی کسی نے تردید نہ کی۔

لیکن جیسا کہ ہم نے آغاز ہی میں کہا کہ اس علم پر ہمارا یقین تھوڑا بہت ہے، تھوڑا اس وقت جب دست شناس کوئی ایسی پیشگوئی کرے جو ہمارے حق میں نہ جاتی ہو اور پورا اس وقت جب وہ ہمارے دل کی بات کہہ رہا ہو تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو والے اصول پر عمل کرتے ہیں کیونکہ ہم میٹھا میٹھا ہپ تو شاید کر ہی لیتے ہوں کڑوا کڑوا تھو کی نوبت ہی نہیں آنے دیتے اور پھر ہمیں اقبال ساجد نے بھی تو اس علم سے بدظن کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جس نے ایک سیدھا سادا شعر کہا اور اس علم کے گوڈے گٹوں میں بیٹھ گیا۔

ہاتھوں میں بہہ رہی ہے لکیروں کی آبجو
قسمت کا کھیت پھر بھی ہے بنجر پڑا ہوا

اب ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آٹھ افراد خانہ کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے اس شاعر کو کون سمجھائے کہ قصور لکیروں کی آبجو کا نہیں ہے اس آبجو کے پانی کی منصفانہ تقسیم کا ہے کہ اس کے باعث کسی کا کھیت ہرا بھرا رہتا ہے اور کسی کا بنجر ہونے لگتا ہے۔

دراصل یہ معاملہ صرف ہاتھ دیکھنے اور ہاتھ دکھانے والوں تک ہی محدود نہیں بلکہ مقامات آہ و افغاں اور بھی

ہیں۔ یعنی بسا اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ہاتھ دیکھنے والا اپنے علم کے مطابق ٹھیک ٹھاک نشانے لگا رہا ہوتا ہے......
مگر پردہ غیب سے کچھ اور وجود میں آ جاتا ہے...... مثلاً وہ کسی نقب زن کو اس کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ عنقریب تمہیں موتی ملیں گے اور ایسا ہوتا بھی ہے یعنی وہ لنگر لنگوٹ کس کر واردات کے لئے جب کسی گھر میں داخل ہوتا ہے تو اسے وہاں واقعی موتی ملتے ہیں، لیکن اللہ کی قدرت کہ وہ ان سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے چنانچہ انہیں پچکار کر "موتی موتی" کہتا ہے مگر وہ اس کی ٹانگ ہی نہیں چھوڑتے۔

ویسے علم دست شناسی سے اختلافات اور اتفاقات کے باوجود ہماری گوڑھی یاری ایک دست شناس سے ہے اور ہمارا یہ دوست اس پیشے کے حال اور مستقبل سے خاصا مایوس ہے۔ ایک روز ہم نے اس سے اس مایوسی کی وجہ پوچھی تو بولا "وجہ صاف ظاہر ہے
۔ لوگ ہم سے ہماری قسمت کا حال پوچھتے ہیں اور ہمارا حال ہی نہیں پوچھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص قسمت کا حال بتا سکتا ہے اسے مال و زر کی کیا ضرورت ہے، چنانچہ ان میں سے بیشتر ہمارے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں، ہمارا پھیلا ہوا ہاتھ کوئی نہیں دیکھتا" ہم نے اس کے اس بیان کی وضاحت چاہی تو اس نے بتایا کہ "یار لوگ سب کچھ مفت جاننے کی کوشش کرتے ہیں اس کے لئے معقول فیس ادا کرنے پر کوئی تیار نہیں ہوتا۔ ہم سے تو وہ بہتر ہیں جو فٹ پاتھ پر ایک رومال بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں اور طوطے سے فال نکلواتے ہیں" اور ہمارے اس دوست کی مایوسی بالکل بجا ہے کیونکہ ہمارا اپنا مشاہدہ یہی ہے کہ دست شناسوں کا زیادہ وقت اپنے دوستوں ہی کے ہاتھ دیکھنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ شریف النفس لوگ ہیں یہ نہیں جانتے کہ وقت بدل گیا ہے، زمانہ بدل گیا ہے اب فائدہ ہاتھ دیکھنے میں نہیں ہ "ہاتھ دکھانے" میں ہے۔ جو ہاتھ دکھانا جانتے ہیں، وہ کسی ہاتھ دیکھنے والے کو خاطر میں نہیں لاتے۔

پہچان

کئی دفعہ یہ اتفاق ہوا کہ کسی دوست کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا' اس کے جواب میں گھر کے آخری کمرے سے کسی آواز نے سفر کا آغاز کیا اور مختلف کمروں میں سے ہوتی ہوئی یہ آواز باہر دروازے تک پہنچتے پہنچتے بالکل نحیف ہو گئی اور یہ نحیف سی آواز "کون ہے؟" کے "ون ورڈ" پر مبنی ہوتی ہے "اس مبہم سی "کون؟" کے جواب میں ہم بھی اپنی آواز آخری کمرے تک پہنچانے کیلئے حلق کی پوری قوت سے اتنا ہی مبہم جواب دیتے ہیں "میں" اس پر ایک بار پھر گھر کے دوسرے کونے سے ایک آواز سفر کرتے کرتے ہم تک پہنچتی ہے "میں کون"؟ جواباً ہم عرض کرتے ہیں "میں اسلم کا دوست!" اس پر پھر پوچھا جاتا ہے "اسلم کا دوست کون؟" اور پھر ہم بامر مجبوری اپنا نام بتاتے ہیں' حالانکہ ان تمام مراحل سے گزرنے کی بجائے دروازے پر دستک ہونے پر دروازے تک جایا جا سکتا ہے اور جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے کہ باہر کون ہے؟ لیکن ایک تو یہ طریقہ سہل بہت ہے' دوسرے اس پر وقت بہت خرچ ہوتا ہے۔ تیسرے اس میں فریقین کیلئے جھنجھلاہٹ کی گنجائش نہیں رہتی اور یوں یہ طریقہ ہماری قوم کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ ہم لوگ بنیادی طور پر مشکل پسند واقع ہوئے ہیں لہٰذا ہم لوگ اس کی بجائے۔

"کون؟"

"میں"

"میں کون"

"اسلم کا دوست"

"اسلم کا دوست کون"

والا پروسیجر ہی اختیار کرتے ہیں کہ اگرچہ یہ طریقہ طویل ہے لیکن ایک دفعہ دانتوں تلے پسینہ تو آ جاتا ہے۔

یہ معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ ہم لوگ جب کسی کو ٹیلی فون کرتے ہیں تو اس کیلئے بھی کچھ ایسے ہی "مرحلہ وار پروگرام" پر عمل کیا جاتا ہے یعنی ادھورا نام بتایا جاتا ہے تاکہ ایک تو ذہن پر زور ڈالنے کا موقع مل سکے اور دوسرے نہ پہچاننے کی صورت میں مخاطب کا یہ فقرہ سنا جا سکے کہ "اچھا ہُن پچھاندے وی" نئیں" ہمارے ساتھ ایسے کئی دفعہ ہوا کہ ہم سفر سے واپس آئے تو بیگم نے ایک فہرست ہمیں تھمائی کہ ان لوگوں کے فون آئے

تھے۔ یہ فہرست لوگوں کے ناموں کی بجائے ناموں کے مخفف پر مبنی ہوتی ہے۔ روحی' زیبا' شریف' وغیرہ۔ سو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ روحی کون ہے؟ جناب کنجاہی ہیں یا روحی بانو ہیں؟ حضرت زیبا ناردی ہیں یا زیبا محمد علی ہیں؟ ایم شریف ہیں یا بابرہ شریف ہیں؟ چنانچہ ہم احتیاطاً ان سب کو جوابی فون کرتے اور لیڈیز فرسٹ کے اصول کے مطابق پہلے روحی بانو' زیبا محمد علی اور بابرہ شریف وغیرہ سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے تو یاد نہیں فرمایا تھا؟

"ذہنی آزمائش" کے یہ سلسلے یہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ان کی رسی بہت دراز ہے یعنی ہمیں جو خطوط ملتے ہیں ان میں سے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن میں بہت اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے' اس پر ہم فوراً خط کے آخری حصے تک جا پہنچتے ہیں تاکہ پتہ تو چلے کہ یہ کون دوست ہے جو اس زمانے میں اتنی محبت کا اظہار کر رہا ہے لیکن نیچے اس دوست نے اپنا نام لکھنے کی بجائے اپنے دستخط کئے ہوتے ہیں۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں دستخط ہمیشہ "عبرانی" زبان میں کئے جاتے ہیں سو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ مہربان کون ہے جو اس قدر نامہربان ہے کہ ہمیں بیٹھے بٹھائے بھنبھل بھوسے میں ڈال دیا ہے؟ سو اس ذہنی خلفشار سے نجات پانے کیلئے موصوف کو خط لکھنا پڑتا ہے جس کے لفافے پر ان کا صرف ایڈریس لکھا جاتا ہے' نام نہیں کیونکہ نام جاننے کیلئے تو خط لکھا گیا ہوتا ہے.....

گذشتہ دنوں ایک بزرگ ہمارے دفتر آئے کام کرتے کرتے ہماری نظر ان پر پڑی تو دیکھا کہ وہ سیدھے کھڑے ہیں اور گردن کو ذرا خم دے کر نظریں ہم پر جمائے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ یوں دیکھ رہے ہیں جیسے آزما رہے ہوں کہ دیکھیں ہمیں پہچانتا ہے کہ نہیں؟ ہم نے انہیں غور سے دیکھا' ذہن پر زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا' اس پر ان کی مسکراہٹ میں اضافہ ہو گیا لیکن اب کے اس مسکراہٹ میں تھوڑا سا شرمندگی کا عنصر بھی تھا جو ایسے مواقع پر فطری طور پر محسوس ہوتی ہے بالآخر انہوں نے اپنے ہونٹ کھولے اور کہا "آپ نے مجھے پہچانا نہیں"

ہم نے ندامت سے جواب دیا "نہیں" بولے "میں ۱۹۲۳ء میں ایم اے او کالج امرتسر میں آپ کے والد صاحب کا شاگرد تھا"۔ یہ سن کر ہماری شرمندگی میں اضافہ ہو گیا اور ہم نے جی ہی جی میں اپنے حافظے کو کوسا کہ ہماری پیدائش سے بھی بیس برس پہلے جو صاحب ہمارے والد کے شاگرد تھے افسوس ہم انہیں پہچان نہ سکے۔

اس طرح کی مثالیں اور بھی بہت ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں کو پہچاننا کتنا مشکل ہے؟ لوگ کچھ اور ہوتے ہیں ہم انہیں کچھ اور سمجھ بیٹھتے ہیں اور یوں طرفین کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور بات کا بھی پتہ چلتا ہے اور وہ یہ کہ ہم لوگ پہچان کے بحران کا شکار ہیں اور اس حد تک شکار ہیں کہ بسا اوقات اپنی پہچان کرانے کیلئے اپنی نگم کر بیٹھتے ہیں سو گذشتہ کئی برسوں سے دوستوں دشمنوں کے چہرے پہچاننے مشکل ہو گئے ہیں آپ افراد کو تو چھوڑیں اب تو قوم کی شکل بھی نہیں پہچانی جاتی۔

۲۶/نومبر/۱۹۸۶ء

رات کے گیارہ بجے

گزشتہ روز میرے ایک دوست نے فون کیا۔ میں نے کہا "رات کو گیارہ بجے کے بعد فون کرنا" اور فون بند کر دیا۔

ایک دوست ملنے آئے' میں نے انہیں دروازے ہی سے رخصت کر دیا اور کہا "رات کو گیارہ بجے کے بعد تشریف لائیں' آرام سے بیٹھ کر باتیں ہونگی"

بچوں نے سکول کا کام کرنے کیلئے بستے کھولے تو میں نے انہیں ڈانٹ کر کہا "یہ کام کرنے کا وقت ہے' رات کو گیارہ بجے کے بعد کرنا"

والد ماجد جن کی عمر ماشاءاللہ ۸۶ برس ہے' سونا چاہ رہے تھے مگر انہیں نیند نہیں آ رہی تھی' میں نے کہا "آپ گیارہ بجے کے بعد سونے کی کوشش کریں' انشاءاللہ نیند آ جائے گی"

ایک دوست کا فون آیا کہ "یار مجھے بخار سا ہو رہا ہے گھر پر کوئی نہیں ہے اگر ہو سکے تو مجھے ڈاکٹر سے دوالا دو" میں نے کہا "میں حاضر ہوں' مگر تم کوشش کرو کہ بخار تمہیں رات کے گیارہ بجے کے بعد چڑھے کہ اسی میں تمہارا فائدہ ہے"

میرے دوست اور عزیز واقربا میری طرف سے عائد شدہ اس عجیب وغریب ٹائم کی پابندی سے بہت نالاں تھے' چنانچہ میں نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کا فیصلہ کیا!

دوست کا فون آیا تو میں نے اس سے گپ شپ کرنا شروع کر دی' چند لمحوں کے بعد اس نے کہا "یار یہ جو تم نے گانوں کی ٹیپ لگائی ہوئی ہے' خدا کیلئے اسے تو بند کرو' یا اسے آہستہ ہی کر دو' تمہاری آواز سنائی نہیں دے رہی!" میں نے کہا "برادرم! یہ گانوں کی ٹیپ نہیں' سلطان باہو کا کلام گایا جا رہا ہے اور یہ آواز میرے کمرے سے نہیں' برابر والی مسجد سے آ رہی ہے!"

دوست نے کہا "ٹھیک ہے' میں تھوڑی دیر بعد فون کر لوں گا!"

میں نے کہا "تھوڑی دیر بعد نہیں' رات کے گیارہ بجے کے بعد کرنا' کیونکہ یہ پروگرام رات گیارہ بجے تک جاری رہتا ہے"

ایک دوست ملنے کیلئے آئے تو میں نے انہیں دروازے ہی سے رخصت کرنے کی بجائے ڈرائنگ روم میں بٹھایا' چائے منگوائی اور گپ شپ شروع کر دی' تھوڑی ہی دیر بعد وہ ناراض ہو گئے اور کہنے لگے "یہ تم نے

کیا کہا کہ تم دوزخ میں جاؤ گے؟" میں نے کہا "برادر! یہ میں نے نہیں کہا بر والی مسجد کے مقرر صاحب کہہ رہے ہیں!" یہ سن کر انہوں نے معذرت کی اور کہا "میں پھر کسی وقت آجاؤں گا' تاکہ آرام سے باتیں تو ہو سکیں!" میں نے کہا "رات کے گیارہ بجے کے بعد آنا کہ یہ سلسلہ اس سے پہلے ختم نہیں ہوتا"

بچوں نے سکول کا کام کرنے کیلئے بستے کھولے تو میں نے انہیں پچکار کر کہا "شاباش اچھے بچوں کی طرح اب سکول کا کام کر کے ہی اٹھنا!" مگر تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے بستے بند کر دیئے اور کہا "ابو اسے منع کرو' ہم سے سکول کا کام نہیں ہو رہا!" میں نے کہا "بیٹے میں کیسے منع کر سکتا ہوں' میں نے مرنا ہے۔ تم سکول کا کام رات کے گیارہ بجے کے بعد کر لینا!"

والد صاحب عشاء کی نماز پڑھ کر سونے لگے تو میں نے انہیں کہا "آپ سکون سے گہری نیند سوئیں میں آپ کو صبح تین بجے جگا دوں گا' کیونکہ اس وقت علامہ صاحب نے بھی جاگنا ہوتا ہے!" مگر کچھ دیر بعد والد صاحب بے آرام سے ہو کر اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے "میں رات کو گیارہ بجے کے بعد ہی سوؤں گا!"

بخار والے دوست کا فون اگلے روز خود ہی آگیا' اس نے کہا "یار' تم ٹھیک کہتے تھے' رات کو گیارہ بجے سے پہلے بیمار نہیں ہونا چاہئے' میرے محلے میں بھی چاروں طرف لاؤڈ سپیکر فٹ ہیں' ان کی وجہ سے بخار تیز ہوتا گیا' لیکن رات گئے جب لاؤڈ سپیکر خاموش ہوئے' میرا بخار اترنا شروع ہوا اور اب اللہ کا شکر ہے' میں ٹھیک ہوں' آئندہ میں کوشش کروں گا کہ رات کو گیارہ بجے سے پہلے بیمار نہ پڑوں!"

دوستوں کو تو میں نے مطمئن کر دیا کہ میں انہیں رات کے گیارہ بجے کے بعد کا ٹائم کیوں دیتا ہوں' مگر میں نے اپنے طور پر سوچا کہ انسان کو حالات کے مطابق خود کو ایڈجسٹ کرنا چاہئے چنانچہ مسجد کے میناروں میں مشرق' مغرب اور شمال جنوب کی طرف فٹ چاروں لاؤڈ سپیکروں سے خود کو غافل کر کے میں سرشام ہی اپنے لکھنے کی میز پر بیٹھ گیا اور کالم لکھنے کی تیاریاں کرنے لگا' مگر مجھے یوں لگا جیسے میرے کمرے کے اندر جلسہ ہو رہا ہے' چنانچہ میں نے سوچا کہ لاؤنج میں بیٹھ کر لکھنا چاہئے' مگر لاؤنج میں اصل آواز کے علاوہ آواز کی گونج بھی سنائی دے رہی تھی' اس پر میں نے باورچی خانے کا رخ کیا کہ چولہے کے پاس بیٹھ کر لکھ لوں گا' لیکن جب میں چولہے کے پاس بیٹھا تو مجھے محسوس ہوا جیسے یہ آواز چولہے کے اندر سے آرہی ہے' اب لے دے کے گھر کا غسل خانہ رہ گیا تھا' میں نہانے کی چوکی پر بیٹھ گیا مگر مقرر کی آواز میں اتنی کڑک تھی کہ اس سے پیدا ہونے والی تھرتھراہٹ سے چوکی اپنی جگہ سے اٹھ کر فضا میں بلند ہونے لگی' اس پر میں نے گھبرا کر گھر کی چھت کا رخ کیا' مگر وہاں تو جیسے کہرام مچا ہوا تھا' چنانچہ میں ہڑبڑا کر نیچے آگیا اور دوبارہ اپنی لکھنے کی میز پر آکر بیٹھ گیا۔

اور قارئین! میں اپنی لکھنے کی میز پر بیٹھا ہوں اور کالم لکھ رہا ہوں اور اس وقت رات کے بارہ بجے ہیں!

۱۳/نومبر/۱۹۸۶ء

نظرِ بد دُور

شرافت وضعداری اور خلوص ایسی قدریں 'اب اگر کہیں زندہ نظر آتی ہیں تو کاروباری طبقے میں نظر آتی ہیں 'اللہ اللہ 'اس طبقے میں کیسے کیسے ایثار پیشہ لوگ موجود ہیں 'ابھی گذشتہ روز ہمارا ایک دوست موٹر سائیکل کے سپیئر پارٹس خریدنے کیلئے اپنے ایک عزیز کی دوکان پر گیا' واپس آیا تو فرطِ جذبات سے اس کی آواز رندھی ہوئی تھی' کہنے لگا کہ جب منیجر نے سات سو چودہ روپے ستر پیسے کا بل بنایا اور رسید میری طرف بڑھائی تو اتنے میں میرا عزیز جو دوکان کا مالک تھا' دوکان میں داخل ہوا اور مجھے دیکھتے ہی محبت سے گلے لگا لیا' اپنے پاس بٹھایا' کتنی دیر تک گلے شکوے کرتا رہا کہ تم کبھی ملتے ہی نہیں اور پھر اس نے پوچھا کہ آج تمہیں ہماری یاد کیسے آئی ہے؟ دوست نے اسے بتایا کہ موٹر سائیکل اوور ہال کروا رہا ہوں 'اس کیلئے سپیئر پارٹس خریدنے تھے' سودہ خرید کر میں جا ہی رہا تھا کہ تم آگئے اس نے پوچھا تم نے ابھی ادائیگی تو نہیں کی' دوست نے نفی میں جواب دیا تو اس نے رسید مانگی اور منیجر کو واپس کرتے ہوئے کہا "یہ میرے عزیز ہیں اوپر کے پیسے اس میں سے منہا کر دو" چنانچہ منیجر نے سات سو چودہ روپے ستر پیسے کے سودے میں سے فوراً ستر پیسے منہا کر دیئے۔ میرا یہ دوست اپنے اس کاروباری عزیز کے اس ایثار سے بے حد متاثر تھا اور باقاعدہ آب دیدہ ہو رہا تھا' ہم نے اپنے اس دوست کے احساسِ احسان مندی کی قدر کی۔ اور اسے بتایا کہ ہمارا ایک کاروباری دوست تمہارے عزیز جتنا ایثار پیشہ تو نہیں' مگر اس کے دل میں بھی رشتوں کی بہت قدر ہے۔ ایک دفعہ ہم نے اس کی دوکان سے گرم سوٹ خریدا' کیشئر نے ہمیں چھ سو سات روپے چار آنے کی رسید دی' تو ہمارا یہ دوست اپنے کیشئر پر برس پڑا اور اسے ڈانٹتے ہوئے کہا یہ چار آنے کی کیا ضرورت ہے کاٹو اسے' تم جانتے نہیں یہ میرے کتنے عزیز دوست ہیں"

ہم نے اپنے ایک شاعر دوست کو یہ دونوں واقعات سنائے تو وہ خود بھی کشتۂ تیغ احسان نکلا اور ایک واقعہ اس نے بھی سنایا۔ اس نے بتایا کہ ایک دفعہ ریشمی کپڑا تیار کرنے والی ایک بہت بڑی مل نے ادب پروری کے سلسلے میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا اہتمام کیا مشاعرے سے پہلے شاعروں کو وسیع وعریض مل دکھائی گئی جہاں نہایت اعلیٰ درجے کا کپڑا بہت وسیع پیمانے پر تیار ہو رہا تھا۔ مشاعرے کے اختتام پر مل اونر نے ایک ایک شاعر کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا اور اپنی مل کے بنے ہوئے کپڑے کا ایک ایک سوٹ پیک کر کے شعراء کو بطور تحفہ پیش کیا اور کہا یہ ہماری بھابی کیلئے ہے۔ یہ وہ کپڑا ہے جو ہم بازار میں فروخت کیلئے نہیں بھیجتے' یہ صرف آپ اور آپ ایسے مہربانوں کیلئے ہے!" مگر خلوص کی قدر تو ایک شاعر ہی کر سکتا ہے' اس کی بیوی تو اس کی پابند نہیں' چنانچہ

ہمارے شاعر دوست کے مطابق اس کی بیوی نے یہ کپڑا کھول کر دیکھا اور اسی وقت اپنی جمعدارنی کو " دان " کر دیا۔ تاہم اس امر کی تصدیق بیوی نے بھی کی کہ اس قسم کا کپڑا واقعی بازار میں فروخت کے لئے پیش نہیں کیا جاتا۔

اور یہ جو ہم کاروباری لوگوں کی بے غرض ایثار پیشگی کا ذکر کر رہے ہیں۔ تو یہ خوبی صرف ہمارے ہاں کے دولت مندوں میں نہیں' بلکہ اس خوبی سے تو دنیا بھر کے صاحب دولت بہرہ ور ہیں۔ یہ لوگ تو وہاں بھی احسان کا رویہ اپناتے ہیں جہاں انہیں کوئی غرض نہیں ہوتی اور اگر کسی نے ان کیلئے تنکا بھی توڑا ہو' تو اس صورت میں تو ان کی مہربانی دیدنی ہوتی ہے۔ ایک فرم کے مالک نے اپنے ایک دیرینہ ملازم کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور کہا " ولیم! آج اس ادارے سے وابستہ ہوئے تمہیں بیس سال ہو گئے ہیں تم نے ان برسوں میں نہایت عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے' آج میں تمہارے لئے ایک انعام کا اعلان کرنے والا ہوں اور وہ یہ کہ آج کے بعد تمہیں دفتر میں " ولیم " نہیں " مسٹر ولیم " کہا جائے گا"

سو' وہ جو حاسد ہیں اور جنہوں نے کبھی کسی کی خوبیوں کی تعریف نہیں کرنی' وہ جو چاہے کہتے پھریں' ہمیں تو اس طبقے کے لوگ بہت عزیز ہیں۔ اور ان سے روز افزوں محبت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ یہ سب کچھ انتہائی " کساد بازاری " کے دور میں کرتے ہیں چنانچہ آپ کبھی کسی کاروباری آدمی سے اس کے کاروبار کے بارے میں پوچھیں' وہ بچارا جواب میں " اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے " کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں پاتا' چنانچہ اسے مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ آج کل بہت مندا جا رہا ہے اور یہ کوئی آج کل ہی ایسا نہیں بلکہ گذشتہ پینتس برسوں میں جب بھی ہم نے کسی کاروباری آدمی سے اس کے کاروبار کے بارے میں استفسار کیا ہے اس نے جواب میں آہ سرد کھینچی ہے اور کہا ہے ان دنوں بہت مندا جا رہا ہے' دو وقت کی روٹی مشکل سے نکلتی ہے "۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا رحم کرے' ان کی مشکلات آسان کرے انہیں نظر بد سے بچائے۔ کیوں کہ دم توڑتی ہوئی اقدار اور آخری سانس لیتے ہوئے انسانی تعلقات کے اس معاشرے میں یہی تو ایک طبقہ ہے جس میں وضعداری دوستداری اور اقدار کی پاسداری باقی ہے ورنہ تو جسے دیکھو وہ دولت کی ہوس میں یہودی بنا ہوا ہے

۲۹/جون/۱۹۸۳ء

احمد فراز سے چند ملاقاتیں

احمد فراز کے بارے میں تازہ اطلاع یہ ہے کہ انہوں نے فیض صاحب کے انداز میں سگریٹ پینااور ان کی طرح شعر پڑھنا "حسب توفیق" ترک کر دیا ہے' البتہ جو کام فیض صاحب نے ترک کر دیا وہ احمد فراز نے شروع کر دیا ہے۔ یعنی وہ ان دنوں اپنے "جلاوطن" ہونے کا تاثر دے رہے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ فیض صاحب کا مصرعہ اٹھانے والے بہت تھے جبکہ فراز کا یہ مصرعہ ابھی تک کسی نے نہیں اٹھایا۔ گذشتہ دنوں بھارت میں' میں اور فراز کئی روز تک اکٹھے رہے ہیں اور اسی دوران ان سے بار بار ملاقاتیں رہی ہیں۔ فراز بھی انبالے کے ہندو پاک مشاعرے میں شرکت کے لئے بھارت پہنچے تھے۔ وہ یہاں بطور پاکستانی شاعر مدعو کئے گئے تھے مگر وہ پاکستان سے نہیں لندن یا امریکہ سے بھارت پہنچے تھے کیونکہ وہ گذشتہ کچھ عرصے سے ملک سے باہر ہیں اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رہے ہیں۔ فراز وہاں اپنے پاکستانی احباب کے سامنے دبے دبے لفظوں میں اپنی بیرون ملک رہائش کو اپنی "حریت پسندی" کا "شاخسانہ" قرار دیتے رہے تاہم ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ وہاں انہوں نے پبلک اور نجی اجتماعات میں یوں تو بہت سی بے احتیاطیاں کیں لیکن پاکستان کے بارے میں انہوں نے خاصا ذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا' حتیٰ کہ موجودہ پاکستانی حکومت کے ساتھ اپنے "اختلافات" کو بھی انہوں نے موضوع گفتگو نہیں بننے دیا۔ احمد فراز کے ذکر سے یاد آیا کہ فہمیدہ ریاض بھی ابھی تک بھارت ہی میں ہیں مگر ادیبوں اور دانشوروں کے دلوں میں سے اپنی عزت گنوا چکی ہیں۔ وہ ان دنوں "سکرین" سے غائب ہیں۔ انہیں بہت کم کسی محفل میں مدعو کیا جاتا ہے۔ بھارت میں قیام کے دوران کسی ایک محفل میں بھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی' چنانچہ اب وہ حکومت ہند کی وظیفہ خوار کے طور پر گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ انہوں نے ادیبوں اور دانشوروں کے طبقے میں اپنی عزت پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی کی وجہ سے گنوائی ہے کیونکہ ادیبوں کا کہنا ہے کہ جنہیں اپنے ملک کی حکومت سے اختلاف ہوتا ہے اور نیک نیتی کی بنا پر ہوتا ہے' وہ اس کے لئے لڑائی اپنے ملک میں لڑتے ہیں' کسی ایسے ملک میں نہیں جس کے ساتھ تعلقات کی نوعیت پہلے ہی بہت نازک ہو۔ بہرحال احمد فراز نے اس معاملے میں خاصی سمجھ داری کا مظاہرہ کیا۔ ممکن ہے فراز کی اس احتیاط کے پیچھے کچھ مصلحتیں کارفرما ہوں اور جب وہ مصلحتیں نہ رہیں تو وہ نقاب الٹ کر سامنے آ جائیں' اگر کبھی ایسا ہوا تو پھر انہی کالموں میں اس کا ذکر بھی ہو گا' جس طرح اس سے پیشتر یہ ذکر ہوتا رہا ہے مگر چونکہ فی الحال صورتحال وہی ہے' جو ہم نے ابھی بیان کی ہے لہٰذا اس کا ذکر ضروری تھا' کیونکہ ذاتی دوستی یا ذاتی دشمنی کے نتیجے میں وطن کے حوالے سے کسی کے سر پر سہرا باندھنا یا کسی

کے منہ پر کالک ملنا وطن دوستی نہیں، وطن دشمنی کی ذیل میں آتا ہے۔

ابھی کالم کے آغاز میں، میں نے یہ ذکر کیا تھا کہ فراز اپنی نجی گفتگوؤں میں بیرون ملک سیاحت کو "جلاوطنی" کے کھاتے میں ڈالنے کی دبی دبی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ انبالے کے مشاعرے سے فراغت کے بعد اگلے روز اپنی "آمد" کی اطلاع دینے کے لئے جب میں انور مسعود، اجمل نیازی، شمیم سہگل، پروین فناسید اور احمد فراز اپنے میزبان راجندر لموترہ کی کار میں تھانے کی طرف روانہ ہوئے تو میں نے تھانے کی راہداری میں ٹہلتے ہوئے فراز سے پوچھا اب انبالے سے واپس پاکستان جانا ہے یا کسی اور طرف کا ارادہ ہے تو فراز نے کہا کہ فی الحال تو میرا ارادہ دہلی اور بمبئی وغیرہ جانے کا ہے، اس کے بعد سوچوں گا کہ کدھر جانا ہے۔ میں نے کہا اس میں سوچنے کی کون سی بات ہے۔ بھارت میں گھوم پھر کر واپس پاکستان چلو۔ اس پر فراز نے کہا کہ نہیں یار، آپ کو پتہ ہے وہاں میرے لئے حالات سازگار نہیں ہیں۔ وہاں ایک پرچے میں میری ایک نظم شائع ہونے پر اس کے مدیر کو جس طرح گھسیٹا گیا، اس کے بعد وہاں میرا جانا بہت سی پیچیدگیوں کا باعث بنے گا۔ اس پر میں نے فراز کو بتایا کہ اس پرچے کا نوجوان مدیر جو میرا عزیز اور دوست ہے چند روز پریشانیوں کا شکار ضرور رہا مگر اب وہ محفوظ و مطمئن ہے، بلکہ اب اسے تین چار گریڈ آگے ترقی دے دی گئی ہے، نیز یہ کہ اسے جس پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کا باعث آپ کی بے ضرر نظم نہیں تھی، بلکہ ایک غیر ملکی ادیب کی فحش تحریر تھی۔ اسے خود بھی اس ناگوار تحریر کا اندازہ ہو گیا تھا، چنانچہ اس نے یہ صفحہ پھاڑ کر رسالہ سٹالوں پر بھجوایا تھا مگر اس کے اپنے "ترقی پسند" احباب کی مخبری نے کام خراب کیا، تاہم بعد میں اس کی یہی احتیاط اس کی پریشانی کو کم کرنے کا باعث بنی! یہ سن کر فراز نے سگریٹ سلگایا اور خاموش ہو گئے۔

احمد فراز ایک اچھے شاعر ہونے کے علاوہ خوش طبع، حاضر جواب، بذلہ سنج اور لطیفے باز شخص ہیں چنانچہ بھارت میں ان کے ساتھ ملاقاتیں بہت دلچسپ رہیں۔ ایک اسی طرح کی محفل میں میں ایک بار پھر انہیں کھینچ کر ایک طرف لے گیا اور کہا آئیں اب کچھ سنجیدہ باتیں کریں۔ چنانچہ گفتگو کی ابتدا فلسطین سے ہوئی اور آسام اور پھر افغانستان تک جا پہنچی۔ فلسطین کے بارے میں احمد فراز کا کہنا تھا کہ جب تک تیل کی دولت سے مالا مال عرب ملک اس مسئلے کو سچ مچ اپنا مسئلہ نہیں سمجھیں گے۔ اس وقت تک ہمارے مقدر میں ندامت لکھی رہے گی۔ احمد فراز نے بتایا کہ انہوں نے فلسطینیوں کی وطن پرستی اور آزادی کے لئے ان کی طرف سے دی جانے والی عظیم قربانیوں پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں، مگر ان کی یہ نظمیں فلسطینیوں کے اس خون کا متبادل نہیں ہو سکتیں، جو بیروت میں بہایا گیا۔ آسام میں وسیع پیمانے پر مسلمانوں کے قتل عام کے بارے میں احمد فراز نے جو کچھ کہا وہ میرے لئے خاصا چونکا دینے والا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آسام کا قتل عام لبنان کے قتل عام سے کم نہیں ہے اور مجھے اس کا اتنا دکھ تھا کہ بھارت آنے سے پہلے میں نے سوچا کہ مجھے ایسے ملک میں جانا چاہئے بھی یا نہیں جہاں بے گناہوں کے خون سے اس بری طرح ہولی کھیلی گئی ہے۔ البتہ افغانستان میں روسی مداخلت کے سوال پر احمد فراز اسی "کشمکش" کا شکار تھے، جس "کشمکش" کا ان کے بھائی بند شکار ہیں کیونکہ اتنی کھلی جارحیت کے حق میں ان

کے پاس کوئی دلیل نہیں اور اس کی کھل کر مذمت کرنے میں بہت سی " دشواریاں " ہیں چنانچہ جب احمد فراز نے اس مسئلے پر گول مول بات چیت کی تو میں نے کہا کہ فراز صاحب اگر ادیب اپنے پسند کے ظالموں کا دفاع اور ناپسندیدہ مظلوموں کی مذمت کرتے رہے ' تو اس سے زیادہ انسانیت کی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہوگی۔ اس پر فراز نے کہا " آپ ٹھیک کہتے ہیں ' مگر میں اس مسئلے پر ابھی مزید غور کروں گا۔ فی الحال میں اس سلسلے میں بہت کنفیوژ ہوں "۔

میں ان کالموں میں فراز سے جن ملاقاتوں کا تذکرہ کر رہا ہوں ' وہ ایک نہیں بہت سی " قسطوں " میں ہوئی ہیں ' مثلاً ان میں سے ایک گفتگو اس وقت ہوئی جب وہ ہماری طرف " سرہند کلب " آئے اور ہم پوڑیوں کا ناشتہ کرنے کے لئے بازار کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے انہیں راستے میں ایک چبھتا ہوا سوال کر دیا اور وہ سوال یہ تھا کہ آپ نے فوج کے خلاف ایک نظم لکھی مگر عدالت میں جا کر مکر گئے اسی طرح آپ کی غزل کے ایک شعر پر گرفت ہوئی تو آپ اس شعر سے مکر گئے۔ آخر یہ کہاں کی حریت پسندی ہے؟ اس پر فراز نے کہا کہ میں سپاہی نہیں شاعر ہوں ' میرے ساتھ لاؤ لشکر بھی نہیں ' تنہا ہوں ' لہٰذا اگر میں نے زندگی کے کسی سٹیج پر " ہتھیار " ڈال دیئے تو یہ میری ذاتی کمزوری تھی ' جس کا اعادہ نہیں ہوگا۔ خدا کرے کہ دوسرے لوگ بھی اپنے فعل پر ندامت محسوس کریں۔ میں نے فراز سے کہا کہ فوج کے خلاف نظم کہنے پر جب آپ کو پکڑا گیا تھا تو آپ نے وہاں ایک نظم فوج کی حمایت میں بھی لکھی تھی اور اپنے ہاتھ سے لکھ کر انہیں دی تھی ' جس کے نتیجے میں آپ بہت سہولت میں رہے تھے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ اس کے ساتھ ہی میں نے ہنستے ہوئے کہا " آپ اس کی تردید نہ کریں کیونکہ میں آپ کو مصدقہ اطلاع دے رہا ہوں "۔ اس پر فراز نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا ہاں یہ درست ہے مگر میں نے یہ نظم اس وقت بطور خاص نہیں لکھی تھی ' بلکہ یہ میرے مجموعے میں شامل تھی۔ چنانچہ اس موقع پر میں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر انہیں دے دی ' کیونکہ میں فوج کے خلاف نہیں ہوں صرف اس کے موجودہ کردار کے خلاف ہوں۔

اور پھر نئی دہلی میں ایک استقبالیہ تقریب کے بعد مجتبیٰ حسین ' مخمور سعیدی اور اجمل نیازی کی موجودگی میں احمد فراز نے اپنی تازہ غزلیں سنائیں جو یقیناً بہت خوبصورت تھیں ' اس کے بعد فراز سے ملاقات نہ ہو سکی ' ورنہ میں نے ایک سوال ابھی پوچھنا تھا کہ آپ جوان دنوں شعوری طور پر اپنا سیاسی امیج بنا رہے ہیں ' یہ کہیں اس امیج کو ختم کرنے کے لئے تو نہیں جو کچھ لوگوں نے آپ کو ٹین ایجرز کا شاعر ثابت کرنے کی کوشش میں بنا رکھا ہے؟۔

۳ مئی ۱۹۸۳ء

ناشُکری

جن چیزوں کو ہم نے زندگی میں قبول کر لیا ہے' وہ خاصی احمقانہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے عادی ہو جانے کی وجہ سے ہمیں کتنی دانشمندانہ لگتی ہیں۔ اس نوع کی باقی چیزوں کا تذکرہ تو فی الحال چھوڑیے صبح صبح اٹھ کر شیو بنانے کے عمل ہی کو لیجیے یعنی ایک اچھا خاصا شریف آدمی دن چڑھتے ہی آئینے کے سامنے جا کھڑا ہو جاتا ہے اور یوں اسے صبح صبح اپنا منہ دیکھنا پڑتا ہے، جس سے بعض صورتوں میں سارا دن موڈ آف بھی رہ سکتا ہے۔ پھر یہ شریف آدمی ڈونگے میں پانی بھرتا ہے۔ سیفٹی ریزر کھولتا ہے اور اس میں ایک تیز دھار والا بلیڈ رکھتا ہے، جو اس نے شہ رگ کے قریب و جوار میں چلانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ برش ہاتھوں میں پکڑ کر چہرے پر شیونگ کریم لگاتا ہے پھر یہ برش پانی میں بھگو کر آنکھوں اور ماتھے کو چھوڑ کر سارے چہرے پر ملنا شروع کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ جھاگ بناتا ہے حتیٰ کہ ہونٹوں اور ناک کے درمیانی حصے سے لے کر ٹھوڑی اور ٹھوڑی سے نیچے والے حصے تک سفید سفید جھاگ کی پہاڑیاں سی بن جاتی ہیں اور اس عالم میں آئینے میں صورت دیکھنے پر انسان خود کو وہ "بابا" محسوس کرتا ہے جو روایتی طور پر کرسمس والی رات بچوں کے سرہانے تحفے چھوڑ جاتا ہے۔

شیو بنانے کا عمل یہیں تک محدود نہیں ہے' بلکہ ان کا ایک لمحہ ابھی اور بھی ہے جسے شہادت گہ الفت میں قدم رکھنے کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ لمحہ وہ ہے جب وہ شریف آدمی تیز دھار والا بلیڈ ہاتھ میں پکڑ کر بال بلکہ بال کی کھال اتارنا شروع کرتا ہے اور جدھر جدھر سے وہ بلیڈ گزرتا ہے اس کی زد میں ابھری ابھری سی سفید سفید سی جھاگ بھی آتی چلی جاتی ہے اور یوں لگتا ہے کہ کسی پہاڑی علاقے میں برفباری کے موسم میں سڑکوں پر سے برف کے گالے ہٹائے جا رہے ہیں اس عمل کے دوران جگہ جگہ ٹک لگنے کے امکانات بھی خاصے روشن ہوتے ہیں مگر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر شیو بنانے والا شخص حوصلہ نہیں ہارتا اور شہ رگ سمیت گردن اور چہرے کے نرم و نازک حصوں پر بلیڈ کی دھار آزماتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اس کام میں "سرخ رو" ہو کر اب پورے اطمینان سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہے اور اگر کسی ایک آدھ جگہ بال یا کسی بال کے "بال بچے" رہ گئے ہوں تو وہ دوبارہ سیفٹی ریزر ہاتھ میں پکڑ کر پوزیشن سنبھالتا ہے اور ان کا قلع قمع کر دیتا ہے اور اس کے بعد تولئے سے منہ پونچھ کر اطمینان کا سانس لیتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس تمام "ڈسکرپشن" کے باوجود آپ کو یہ فعل جو بیک وقت احمقانہ اور ظالمانہ ہے' حسب معمول ایک معصوم سا فعل لگے گا کیونکہ آپ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ لہٰذا میں آپ سے انصاف طلب

نہیں کرتا بلکہ آج سے ہزاروں سال پہلے کے انسان کو اپنی "سپورٹ" میں لاتا ہوں کیونکہ وہ وہ لالہ تھا جس کی قدرت خو بخود حنابندی کرتی تھی نہ اسے پلاسٹک کی ایک چھڑی جس کے آخری کنارے پر بالوں کا ایک گچھا لگا ہو' صبح صبح اپنے دانتوں پر رگڑنا پڑتی تھی اور نہ اسے تیز دھار والا آلہ اپنے منہ پر چلانا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دانت اتنے مضبوط تھے کہ وہ کچا گوشت چبا جاتا تھا اور چہرے پر بڑھے ہوئے بالوں کے باوجود اتنا ہینڈسم نظر آتا تھا کہ اس وقت کی حسینائیں اس پر مرتی تھیں لہٰذا میری طرف سے ہزاروں سال پہلے کا یہ شخص گواہی دے گا کہ میں اور آپ جو اپنی صبح کا آغاز اپنی اصلیت چھپانے کے لئے اپنا چہرہ کھرچنے سے کرتے ہیں یہ خاصی ظالمانہ سی حرکت ہے گو یہ حرکت "کنڈیشنڈ" ہو جانے کی وجہ سے ہمیں بالکل ظالمانہ نہیں لگتی۔

چلئے میں شیو بنانے کے احمقانہ اور وحشیانہ عمل کی مذمت میں ایک وحشی کی سند نہیں لاتا اس کی بجائے میں آج کے عہد کی کسی بھی ماڈرن یا غیر ماڈرن خاتون کو بطور گواہ پیش کرتا ہوں۔ آپ اس خاتون سے پوچھ لیں کہ اگر کوئی خاتون صبح صبح اٹھ کر شیونگ برش ہاتھ میں لے کر اپنے چہرے پر صابن کے بلبلے بنانا شروع کر دے اور اس کے بعد وہ بلیڈ ہاتھ میں پکڑ کر چہرے پر گھمانا شروع کر دے تو وہ خود تو اپنے آپ کو بدنصیب محسوس کرے گی ہی دیکھنے والی خواتین کو بھی اس پر کتنا ترس آئے گا؟ میں یہ دلیل پیش کرتے ہوئے خود کو خاصا بے وقوف سا محسوس کر رہا ہوں، مگر یقین جانیں یہ بہت "ٹھکویں" دلیل ہے کیونکہ اس میں صنف کے فرق سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خواتین اس فعل کی عادی نہیں ہیں اگر شومئی قسمت سے عادی ہوتیں تو مردوں کی طرح انہیں بھی یہ فعل بہت مہذب فعل لگتا اور وہ گھر پر شیو کرنے کے علاوہ کسی حجام کی دکان پر یعنی بر سرعام کرسی کی ٹیک سے سر لٹکائے' گردن کے گرد تولیہ لپیٹے بیٹھی نظر آتیں اور ان کا چہرہ بھی کسی جابر استرے کی زد میں ہوتا۔

میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ میرے یہ سارے دلائل شیو بنانے کے عمل کو نہیں' آپ کی نظروں میں الٹا مجھے غیر مہذب ثابت کرنے کا باعث بن رہے ہیں تاہم میں اس کی پرواہ کئے بغیر اپنی بات پر ڈٹا رہوں گا لیکن اس کا یہ مطلب بہرحال نہیں کہ میں خود روزانہ شیو بنانی چھوڑ دوں گا کیونکہ میں تو لوگوں کو دوا کے بغیر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہوئے دیکھتا ہوں مناسب خوراک نہ ملنے کی وجہ سے غنچوں کو کھلنے سے پہلے مرجھاتے دیکھتا ہوں اپنی کار میں اپنے بچوں کو آئس کریم کھلانے لے جاتا ہوں اور اپنے بچوں جتنے بچوں کو ہارن سن کر دوڑتے ہوئے کار کی کھڑکی کے پاس آکر آرڈر لیتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ایک کمرے کے مکان میں کچن باتھ روم اور بیڈ روم کے تقاضے پورے ہوتے دیکھتا ہوں بے گناہوں کو قتل ہوتے دیکھتا ہوں چھوٹے بڑے معاملات میں کمزوروں کو سزا پاتے اور زور آوروں کو جزا پاتے دیکھتا ہوں بازاروں میں برہنہ عورتوں کے جلوس دیکھتا ہوں جابر قوانین اور رسم و رواج کے استرے گردنوں پر چلتے دیکھتا ہوں مگر یہ سب مناظر دیکھنے کے باوجود زندہ رہتا ہوں۔ میں سانس لینا نہیں چھوڑتا کیونکہ میں ان تمام مناظر کا عادی ہو گیا ہوں۔ لہٰذا میں شیو بنانا بھی نہیں چھوڑوں گا۔ کیونکہ میں ہر روز صبح ہوتے ہی اپنی گردن پر استرا دیکھنے کا بھی عادی ہو چکا ہوں۔ تاہم میں اپنی اس بات پر ابھی تک قائم و دائم ہوں کہ اپنی اصلیت چھپانے کے لئے استرے فضا میں لہرا کر اپنی صبح کا آغاز کرنا اس خوبصورت صبح کی ناشکری ہے جو قدرت کی طرف سے ایک عظیم تحفے کے طور پر ہمیں عطا ہوئی ہے۔

۲ جون ۸۴ء

اشفاق نقوی

اشفاق نقوی سے میرا تعارف اس ریچھ کے حوالے سے ہے' جس کی کھال میں بھُس بھر کر اشفاق نقوی نے اسے اپنے بنگلے کے بر آمدے میں گذشتہ ربع صدی سے کھڑا کیا ہوا ہے۔ گذشتہ ربع صدی سے تو میں اس بچارے کو دیکھ رہا ہوں۔ اللہ جانے وہ اپنی یہ ڈیوٹی کب سے انجام دے رہا ہے۔ میں نے اپنے بچپن کا ایک حصہ اور پوری جوانی ماڈل ٹاؤن لاہور میں بسر کی ہے۔ جہاں اے بلاک کی جامع مسجد سے ملحق ہمارا گھر تھا اشفاق نقوی کے والد مرحوم خان بہادر محمد حسین نقوی کو مسجد میں آتے جاتے اور مسجد سے متعلق امور میں دلچسپی لیتے دیکھتا تو حیران ہوتا تھا کیونکہ وہ عقیدے کے لحاظ سے شیعہ تھے اور یہ مسجد سنیوں کی تھی اور وہ شیعہ بھی کوئی برائے نام نہیں تھے بلکہ ہر سال محرم الحرام میں ذوالجناح ان کے گھر میں سے ہو کر جاتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنے گھر میں قرآن مجید کا ختم کیا۔ مسجد میں دینی تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ جب ہم خان بہادر صاحب کے وسیع و عریض بنگلے کے گیٹ میں داخل ہوئے تو ہر طرف پھلوں کے درخت دیکھ کر خوش ہوئے مگر جب گھر کے اندر داخل ہونے کے لئے ہم نے بر آمدے میں قدم رکھا تو ہم میں سے بہت سے سہم کر ایک طرف کو کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک طالب علم کی تو چیخ بھی نکل گئی' کیونکہ بائیں جانب ایک خوفناک ریچھ دانت نکالے ہم پر جھپٹنے کے انداز میں کھڑا تھا۔ بس یہی وہ ریچھ ہے جس کے حوالے سے میں اشفاق نقوی کو جانتا ہوں' کیونکہ اس کے بعد میں نے دوسرے بچوں کے ساتھ کئی دفعہ خان بہادر محمد حسین نقوی مرحوم کے بنگلے کے چکر کاٹے' مقصود صرف پھلوں سے لدے ہوئے ان درختوں سے "ہیلو ہیلو" کرنا تھا۔ مگر کبھی مالی ہمیں بھگا دیتا تھا اور کبھی ہم دور ہی سے اس ریچھ کو دیکھ کر سہم جاتے تھے اور آپ کو بتلانا صرف یہ مقصود ہے کہ اس تمام مرحلے میں اشفاق نقوق سے ہماری کوئی ملاقات نہیں ہوئی کیونکہ وہ ایئر فورس کی ملازمت کے سلسلے میں لاہور سے باہر تھا' ملاقات اس ریچھ ہی سے ہوتی رہی' جو مرحوم ہونے کے باوجود ایک عرصے سے اپنی ڈیوٹی پر تھا۔

اشفاق نقوی سے ملاقات کا قصہ بھی اپنی جگہ پر بہت دلچسپ ہے ہم ماڈل ٹاؤن سے بوریا بستر لپیٹ کر اچھرے چلے آئے تو ایک روز مجھے سرگودھے سے ایئر فورس کے پیڈ پر ایک خط موصول ہوا یہ ایک مداح کا خط تھا جس میں بہت محبت سے دعوت دی گئی تھی کہ اگر کبھی سرگودھے آئیں تو مجھے ضرور مطلع کریں۔ یہ خط اشفاق نقوی کا تھا۔ مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ اشفاق نقوی خان بہادر محمد حسین نقوی کا بیٹا ہے اور اسی ریچھ والی کوٹھی میں رہتا ہے جب دو تین خطوں میں یہ بھید کھلا تو اس کے ساتھ دوستی کا آغاز ہوا۔ پھر وہ مستقلاً لاہور آ گیا اور اس سے

مسلسل متواتر نشستیں ہوتی رہیں جس کے نتیجے میں بر آمدے میں نصب ریچھ کا خوف جاتا رہا بلکہ اب تو یہ صورتحال ہے کہ اس کے دوست جب کبھی شام کو اشفاق نقوی کے ساتھ دو تین گھنٹے کی نشست جما کر باہر بر آمدے میں آتے ہیں تو ان بے فکروں کو دیکھ کر اس ریچھ کی گھگی بندھ جاتی ہے۔

سو یارو' اب تو صورتحال یہ ہے کہ اشفاق نقوی ساٹھ سے اوپر ہو گیا ہے مگر اپنی عادات و خصائل اور ٹمپرامنٹ کے لحاظ سے وہ ابھی تک پندرہ بیس سال کا نوجوان ہے یعنی کبھی سود و زیاں کے چکروں میں نہیں پڑتا مصلحتوں کا اسیر نہیں ہوا خلوص اور محبت سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ بہت جذباتی ہے ساری عمر لیفٹ رائٹ کرتے گزاری۔ مگر کبھی لیفٹ اور رائٹ کے چکر میں نہیں پڑا دوستوں پر جان نچھاور کرتا ہے پکا مسلمان ہے مگر نہیں جانتا کہ شیعہ سنی اور دیو بندی' بریلوی کیا ہوتے ہیں۔ گویا ساٹھ سال کا ہونے کے باوجود ابھی تک نابالغ ہے' کیونکہ بالغ ہونے کے بعد انسان انسان نہیں رہتا شیعہ ہو جاتا ہے' سنی ہو جاتا ہے لیفٹ ہو جاتا ہے۔ رائٹ ہو جاتا ہے اور کیسلکو لیٹر بن جاتا ہے غرضیکہ خاصا سمجھدار ہو جاتا ہے۔

ویسے اشفاق نقوی سے دوستی کی ایک وجہ اس کے نابالغ ہونے کے علاوہ بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ بہت منجھا ہوا شاعر ہے اس فقرے سے حاشا و کلا میری یہ مراد نہیں کہ اس سے دوستی کی وجہ شاعری ہے میں تو شاعروں سے اس طرح بھاگتا ہوں جس طرح کوا غلیل سے بھاگتا ہے چنانچہ شاعر ہونے کے باوجود اگر اس سے دوستی ہے تو صرف اس لئے کہ اس معاملے میں وہ "سیکولر" واقع ہوا ہے یعنی وہ دوسروں کو اپنے شعر سننے پر مجبور نہیں کرتا غزل کہتا ہے' یا تو رکھ چھوڑتا ہے اور یا کسی مدیر کو بھیج کر بھول جاتا ہے گویا وہ اس معاملے میں بھی نیکی کر کے دریا میں ڈالنے کا قائل ہے ورنہ تو شاعر جب نئی غزل کہتا ہے تو اسے ہوا میں لہراتا ہوا گھر سے نکلتا ہے اور شہر میں بھگدڑ مچا دیتا ہے۔

اور ہاں اشفاق نقوی کی ایک اور ادا بھی تو میں نے ابھی بیان کرنی ہے اور وہ یہ کہ اس کے پیٹ میں کوئی بات نہیں رہتی آپ یقین جانیں اگر وہ عورت ہوتا تو نو مہینے انتظار نہ کرتا بلکہ زیادہ سے زیادہ ہفتے بعد بچہ جنم دیتا اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اگلے روز آپ کو بتا بھی دیتا ہے کہ تم نے فلاں شخص کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ میں نے اسے بتا دیا ہے اور اب وہ بہت غصے میں ہے' ایک روز ملاقات ہوئی تو کہنے لگا کہ یار وہ فلاں دوست بہت غصے میں ہے میں نے حیران ہو کر کہا "کیوں؟ میں اس کی بہت عزت کرتا ہوں وہ تو بہت اچھا آدمی ہے اور بہت محنت سے لکھنے والا ہے" اشفاق نقوی نے کہا تم نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ وہ سیکنڈ ریٹ ادیب ہے۔ میں نے کہا "میں نے تو یہ بات اس سے کبھی نہیں کی البتہ تم سے یونہی بات ہوئی تھی" کہنے لگا "ہاں میں نے ہی اسے بتایا تھا" حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ میں نے اس ادیب کو سیکنڈ ریٹ ادیب نہیں کہا تھا تھرڈ ریٹ ادیب کہا تھا کیونکہ فرسٹ ریٹ ادیب تو اقبال' غالب اور دوسرے کلاسیکس ہیں دوسرے نمبر پر فیض' ندیم' شفیق الرحمٰن' منیر نیازی' قراۃ العین حیدر' بیدی' منٹو اور اس کیلیبر کے چند اور ادیب آتے ہیں جنہیں آپ نیو کلاسیکس کہہ سکتے ہیں اور تیسرے نمبر پر وہ سب لکھنے والے ہیں جو بہت اچھا لکھتے ہیں مگر ابھی تک ان پر اجماع امت نہیں ہوا اور

اس میں بہت نامور ادیب بھی شامل ہیں سو میں نے اس دوست کو بھی اس تیسرے گریڈ میں رکھ کر بات کی تھی اس وضاحت کے بعد اب اس دوست کو غصہ تھوک دینا چاہئے اور اشفاق نقوی سے پوچھنا چاہئے کہ تم نے قاسمی کے حوالے سے میرے ساتھ غلط بیانی کیوں کی ؟۔

اشفاق نقوی کے بارے بس ایک بات بتانے والی یہ بھی ہے کہ دلِ زندہ رکھنے والا یہ شخص اپنی اہلیہ کی وفات کے بعد سے بالکل بکھر کر رہ گیا ہے اس سے ملیں تو اتنی مایوسی کی باتیں کرتا ہے کہ لگتا ہے کہ ہم اشفاق نقوی سے نہیں فانی بدایونی سے مل رہے ہیں' بلکہ اب تو یہ شعر بھی فانی ہی کے رنگ میں کہنے لگا ہے اس کی اداسی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے سارے بچے لاہور سے باہر ہیں اور یوں وہ اتنے بڑے گھر میں ایک عرصے سے بھُس بھرے ریچھ کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے یہ ان دنوں اسی کیفیت سے دوچار ہے جس کیفیت سے غالب دہلی اجڑنے کے بعد دوچار ہوا تھا چنانچہ آج کل اکثر رات کے دس گیارہ بجے فون کی گھنٹی بجتی ہے اور دوسری طرف اشفاق نقوی ہوتا ہے۔

"کیا کر رہے ہو؟"۔

"کام کر رہا ہوں۔ تم کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں یار کرنا کیا ہے اب تو زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں"۔

اور اس طرح کی دوچار اور مایوسی کی باتیں کر کے وہ فون بند کر دیتا ہے سو آخر میں اشفاق نقوی سے کہنا ہے کہ پیارے اشفاق نقوی تم اس طرح کی باتیں کرنا چھوڑ دو' اس ذلیل اور گھٹیا معاشرے میں تم ایسے اچھے اور اعلیٰ درجے کے انسانوں کو دیکھ کر ہم ایسوں میں جینے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے اگر تم نے بھی ہتھیار ڈال دیئے تو ہم ایسے ناتواں لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں رہ سکیں گے تم خوبصورت شاعر اور خوبصورت نثر نگار ہی نہیں بے حد خوبصورت انسان بھی ہو' سو اپنے دوستوں کو اس طرح آزردہ نہ کیا کرو' بندے بن جاؤ!

غمگین سلیمان کا خط

پیارے عطا!

ان دنوں شہر میں شادیاں بہت ہو رہی ہیں۔ اس لئے تمہارے خط کا جواب جلدی نہ دے سکا۔ شہر میں جس طرف نکل جائیں قناتوں اور سائبانوں سے رستہ بند ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے لمبا چکر کاٹنا پڑتا ہے۔ پھر ان دنوں کوئی بارات بینڈ باجے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور یوں شور و شغب سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ اوپر سے دولہا نے چہرے کو سہرے سے چھپایا ہوتا ہے جس سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے کس قدر احمقانہ رسم ہے خدا جانے ہم لوگوں کو کب عقل آئے گی۔ میں تو ہر وقت اس خیال سے پریشان رہتا ہوں کہ ہم لوگ ہر وقت خوشیوں کے پیچھے کیوں دوڑتے رہتے ہیں' حالانکہ ہم سب نے ایک روز مرنا ہے۔ چنانچہ اس دنیا کے چند روز ہم اگر ہنسی خوشی بسر بھی کر لیں تو کیا فائدہ۔ بالاخر مرنا تو ہے کل میرے بچے کی سالگرہ تھی۔ بہت سارے لوگ گھر میں جمع تھے۔ کیک کاٹا گیا۔ پھر تالیاں بجائی گئیں میری بیوی جو ایک بیوقوف سی عورت ہے سب سے زیادہ خوش نظر آ رہی تھی اور فرط مسرت سے بیٹے کو بار بار چوم رہی تھی۔ میں یہ سب خاموشی سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ہم لوگ کدھر جا رہے ہیں۔ آخر ہمیں موت کیوں یاد نہیں۔ یہ خوشیاں دائمی نہیں ہیں' کیا فائدہ ان چیزوں کا کہ بالاخر ہم سب نے تنگ و تاریک قبر میں لیٹنا ہے۔ مگر ہم لوگ یہ سب کچھ سوچتے ہیں' یہاں میرے دفتر میں جتنے لوگ ہیں' سب بے فکرے ہیں' لنڈے کے کپڑے پہنتے ہیں' بسوں میں دھکے کھاتے ہیں' غلیظ اور تنگ گھروں میں رہتے ہیں غربت' افلاس اور بیماری نے ان کا ناطقہ بند کیا ہوا ہے۔ مگر دفتر میں آتے ہیں تو سب کچھ بھول کر قہقہے لگانے میں لگے رہتے ہیں۔ مجھے تو ان لوگوں کو دیکھ کر بہت غصہ آتا ہے انہیں چاہئے کہ اکٹھے بیٹھیں تو ایک دوسرے کے دکھ سکھ بلکہ صرف دکھ پھرولیں اگر ان کے دل غموں سے بھرے ہوئے ہیں تو ان کے چہروں پر بھی دکھ کی پرچھائیاں ہونی چاہئیں مگر یہ لوگ جھوٹے قہقہے لگا کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جوانمردی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بھلا یہ کہاں کی جوانمردی ہے اور اگر جوانمردی ہے بھی تو اس جوانمردی کا کیا فائدہ کہ ایک روز بالاخر سب کو مر جانا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں یہ زندگی اسی طرح گزارنی چاہئے جس طرح قبر میں لیٹ کر گزارنی ہے تاکہ ہم اس زندگی کے عادی ہو سکیں جو اس چند روزہ زندگی سے کہیں زیادہ طویل ہے چند روز پیشتر میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنے بچے کی بے معنی سی حرکتیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا حالانکہ اس میں خوش ہونے والی کوئی بات نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو خوش ہونا کون سی کوئی ایسی بات ہے کہ خواہ مخواہ خوش ہوا جائے میں تو روزانہ صبح اٹھتے ہی زندگی اور

موت کے مسئلے پر سوچنا شروع کرتا ہوں ' ناشتے کی میز پر بھی دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا ہوں اور رات کو سونے سے پہلے ایک دفعہ پھر موت کا منظر یاد کرتا ہوں۔ میں نے ان دنوں میں خواجہ اسلام کی معرکتہ الآرا کتاب "موت کا منظر بمعہ مرنے کے بعد کیا ہو گا" بھی پڑھی میرے خیال میں یہ کتاب پہلی جماعت سے بچوں کو پڑھانی چاہئے سبحان اللہ کیا عمدہ کتاب ہے ' جب سے پڑھی ہے زندگی کی جو تھوڑی بہت رمق میرے اندر موجود تھی وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

تمہیں لٹریچر سے بہت دلچسپی ہے۔ جبکہ تم جانتے ہو مجھے لٹریچر سے کبھی شغف نہیں رہا لیکن گذشتہ دنوں میں نے اردو کے کلاسیکی شعراء کا ایک انتخاب دیکھا تو اردو ادب سے مجھے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی ' موت پر ان شاعروں نے کیا کیا شعر کہا ہے ' خواجہ اسلام کی کتاب اور اردو کے ان شعراء نے میری زندگی پر بہت گہرا اثر ثبت کیا ہے ' چنانچہ اب زندہ رہنے کی کوئی خواہش نہیں رہی۔ دو تین شعر تم بھی سنو۔

کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

حسرت برس رہی ہے ہمارے مزار پر
کہتے ہیں سب یہ قبر کسی نوجواں کی ہے

سنگ پھینکے ہیں میری قبر پہ گل کے بدلے
گالیاں دے ہے پسِ مرگ بھی قُل کے بدلے

میری نماز جنازہ پڑھائی غیروں نے
مرے تھے جن کے لئے رہ گئے وضو کرتے

میں جانتا ہوں تمہیں میرا یہ خط اچھا نہیں لگے گا کیونکہ تمہیں زندگی عزیز ہے۔ مگر میرے عزیز ہم سب کو ایک روز مرنا ہے۔ لہٰذا اس زندگی کا ایک ایک لمحہ موت کو یاد کرتے ہوئے گزارنا چاہئے۔

تمہارا دوست! غمگین سلیمانی

خوش باش عیش پوری کا خط

ہیلو عطا!

یار آج اخبار میں پڑھا کہ کشمیری حریت پسند مقبول بٹ کو بھارتی حکومت نے پھانسی دے دی ہے۔ بھئی اس پر ایک لطیفہ یاد آیا ہے۔ پرانے زمانے میں تین افراد کو سزائے موت کا حکم ہوا ' چنانچہ پہلے ان میں سے ایک کو معمول کے مطابق گلوٹین کے نیچے لٹا دیا گیا اور اس کی آخری خواہش پوچھی گئی اس نے اپنی آخری خواہش بتائی ' اس کے بعد گلوٹین کا بٹن آن کر دیا گیا۔ مگر جب تیز دھار والا یہ آلہ اس شخص کی گردن کے

قریب پہنچا تو مشین میں کسی خرابی کی وجہ سے وہ وہیں رک گیا' چنانچہ قواعد کے مطابق اس کی جان بخشی ہو گئی' پھر دوسرے شخص کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا۔ یعنی گلوٹین کسی فنی خرابی کی وجہ سے اس کی گردن کے قریب آ کر رک گئی اور یوں اس کی جان بھی بچ گئی۔ اس کے بعد جلادوں نے تیسرے شخص کو گلوٹین کے نیچے لٹایا اور پوچھا "تمہاری آخری خواہش کیا ہے" اس نے کہا "تم میری آخری خواہش پر لعنت بھیجو پہلے اپنی مشین ٹھیک کراؤ" میں جانتا ہوں تم نہیں ہنسو گے' تمہیں مقبول بٹ کی پھانسی کا صدمہ ہو گا' چھوڑو یار' کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو' جس بد قسمت شخص نے اپنے لئے زندگی کی بجائے موت کو پسند کیا۔ وہ بھی کوئی شخص ہے کہ اس کے لئے خواہ مخواہ اداس ہوا جائے۔ زندگی سب سے بڑی حقیقت ہے' زندہ رہنا اور ہر قیمت پر زندہ رہنا اصل زندہ دلی ہے "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے" جیسی باتیں زندگی کی نعمتوں سے محروم یا مایوس لوگوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ میں تو کبھی کسی جنازے میں شریک نہیں ہوتا' جنازے کو کندھا دیتے ہوئے اور روتے ہوئے لوگ کس قدر مضحکہ خیز لگتے ہیں کل میرا ہمسایہ مر گیا۔ میں اس وقت گلی میں سے گزر رہا تھا جب اس کا جنازہ گھر سے بر آمد ہوا' چنانچہ مجبوراً مجھے چند قدم جنازے کے ساتھ جانا پڑا مگر یار کندھا دیتے ہوئے چار پائی جس طرح کبھی ایک طرف کو اور کبھی دوسری طرف کو لڑھک جاتی تھی' اس پر مجھے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ میں دوڑ کر واپس اپنے گھر میں گھس گیا اور اپنے کمرے کی چٹخنی چڑھا کر دیر تک ہنستا رہا۔ اب تم پھر اس پر منہ بسورو گے اور کہو گے کہ انسان کو نہ غمگین سلیمانی ہونا چاہئے کہ ہر وقت موت کو یاد کرتا رہے اور نہ اتنا سنگدل ہونا چاہئے کہ اسے کبھی موت یاد ہی نہ رہے تم دراصل منافق آدمی ہو۔ چنانچہ ہر معاملے میں اعتدال کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ ارے میاں اس چکر سے نکلو' ورنہ جینا بھی مشکل ہو جائے گا اور مرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ لاحول ولا قوۃ یہ کیا موت کا ذکر درمیان میں لے آیا ہوں۔ ایک تازہ لطیفہ سنو' ابھی کل ہی سنا ہے ریلوے کی ملازمت کے لئے ایک شخص کا انٹرویو ہو رہا تھا۔ انٹرویو لینے والے نے پوچھا "اگر تم دیکھو دو گاڑیاں ایک ہی پٹڑی پر آمنے سامنے آ رہی ہیں تو تم کیا کرو گے" ملازمت کے خواہشمند نے کہا "میں کانٹا بدل دوں گا"۔

"اگر اس وقت کانٹا بدلنا ممکن نہ ہوا' تو پھر کیا کرو گے؟"

"پھر میں سرخ جھنڈی لہراؤں گا"

"اگر اس وقت سرخ جھنڈی دستیاب نہ ہوئی تو پھر؟"

"پھر میں لالٹین ہاتھوں میں پکڑ کر خطرے کا اشارہ دوں گا"

"اگر اس وقت تمہیں لالٹین بھی نہ ملی تو پھر کیا کرو گے"

"تو پھر میں اپنے چھوٹے بچے کو گھر سے لے آؤں گا"۔

"وہ بچہ وہاں کیا کرے گا؟ انٹرویو لینے والے نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ اسے گاڑیوں کی ٹکر دیکھنے کا بہت شوق ہے" ! انٹرویو دینے والے نے جواب دیا۔

دراصل یہ جواب جو اس نے سب سے آخر میں دیا ہے' اسے سب سے پہلے دینا چاہئے تھا' کیونکہ اس قسم کے

مناظر واقعی بہت "تھرلنگ" ہوتے ہیں تم جو سپر پاورز کے تصادم دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے ہو تو پیارے ان پر کڑھنا نہیں چاہئے انہیں انجوائے کرنا چاہئے۔ میں نے اور تم نے کون سا کوئی روز روز پیدا ہونا ہے کہ خواہ مخواہ سارے جہاں کے درد کو اپنے جگر میں جگہ دیتے پھریں۔ ہمیں تو

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

والی نصیحت پر عمل کرنا چاہئے۔ تمہارا دوست غمگین سلیمانی اسے نصیحت نہیں 'وصیت کہے گا' چلو وصیت ہی سہی 'مگر سبحان اللہ کیا عمدہ وصیت ہے کتنا اچھا ہو اگر کسی کو مجبوراً مرنا پڑ جائے تو وہ اس قسم کی وصیت کر کے مرے۔ سقوط حیدر آباد' سقوط جونا گڑھ' سقوط کشمیر اور سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے مجھے چند لاجواب لطیفے یاد آ رہے ہیں 'مگر اس وقت مجھے ایک پارٹی میں شرکت کے لئے جانا ہے' لہذا پھر کبھی سناؤں گا۔

تمہارا دوست! خوش باش عیش پوری

۱۴ فروری ۱۹۸۴ء

مارکس صاحب

مارکس کے بارے میں ہمارے خیالات وہی ہیں جو اکابر مسلم مفکرین کے ہیں یا یوں کہہ لیں کہ مارکس کے بارے میں اکابر مسلم مفکرین کے خیالات وہی ہیں جو ہمارے ہیں۔ یعنی یہ بہت بڑا آدمی تھا اتنا بڑا کہ دل کی گہرائیوں سے اس کی عزت کی جا سکتی ہے کیونکہ اس نے سرمایہ پرستانہ نظام کی چیرہ دستیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور پوری نیک نیتی کے ساتھ ایک متبادل نظام پیش کیا تاکہ دکھی انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھا جا سکے۔ لیکن انسانوں کے بنائے ہوئے نظام میں ہمیشہ ایک بنیادی خامی رہ جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی کامیاب آپریشن کے بعد کسی ڈاکٹر سے مریض کے پیٹ میں قینچی رہ جاتی ہے سو ایک خامی مارکسزم میں بھی رہ گئی اور وہ یہی قینچی والی تھی، چنانچہ اس کا آپریشن ہر دفعہ کامیاب ہوتا ہے مگر کچھ عرصہ بعد ہی قینچی نکالنے کے لئے دوسرا آپریشن کرنا پڑتا ہے اور یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے چیر پھاڑ کے اس مسلسل عمل کو مارکسزم میں یقیناً کوئی اچھا سا نام دیا گیا ہو گا جو ہمارے علم میں نہیں ممکن ہے جدلیاتی عمل اسی کو کہتے ہوں۔

لیکن یہ تو ہم کچھ "فروعی" سی باتوں میں پڑ گئے ہیں کیونکہ اس وقت ہم بات کچھ اور کہنا چاہتے ہیں۔ دراصل ہمارے ایک دوست حال ہی میں نجی ملکیت کے قائل ہوئے ہیں کیونکہ وہ حال ہی میں اپنا مکان بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں اس کام سے فراغت کے بعد گذشتہ روز وہ ہمارے پاس تشریف لائے اور مزدوروں، مستریوں، ترکھانوں، لوہاروں اور رنگ روغن کا کام کرنے والے محنت کش عوام کی چغلیاں کرنے لگے اس پر ہم نے انہیں ٹوکا اور کہا "یار جانے دو، ایک تو غیبت ویسے ہی بری چیز ہے اور دوسرے سماج کے پسے ہوئے طبقوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرنا یوں بھی کچھ اچھا نہیں لگتا۔ مگر لگتا تھا کہ ان کا دل بہت دکھا ہوا تھا کیونکہ اس پر انہوں نے ہمیں گھور کر دیکھا اور کہا "یہ لوگ مجھے لوٹ کر کھا گئے ہیں۔ میں نے ہاؤس بلڈنگ والوں سے ادھار لیا، رشتے داروں سے قرض لیا اور اب سماج کے اس پسے ہوئے طبقے کا بھی مقروض ہوں اور تم کہتے ہو میں ان کی چغلی بھی نہ کروں؟" اور اس کے بعد وہ شکایات کا دفتر کھول کر بیٹھ گئے یعنی مکان کا لینٹر ڈالنے کے مرحلے کے دوران بجلی والوں نے بجلی کے پائپ بھی غلط مقامات پر رکھے اور ایڈوانس رقم بھی لے کر فرار ہو گئے۔ سینیٹری والوں نے ادھورا کام کیا اور پیسے پورے وصول کر لئے، لوہے کی کھڑکیاں اور چوکھٹیں بنانے والا پہلے سے طے شدہ نرخوں سے منحرف ہو گیا اس نے کام بھی زائد نرخوں پر کیا اور چوکھٹیں روشن دان اور کھڑکیاں ٹیڑھی بنائیں نیز میٹریل بھی ناقص استعمال کیا۔ ریت والا بغیر آرڈر کے ریت کا ایک ٹرک اتار جاتا تھا اور بعد میں بڑے دھڑلے

سے دو ٹرکوں کے پیسے وصول کرتا تھا کہ اس کے بقول اس نے دو ٹرک اتارے ہوتے تھے' مزدور' مستری دس بجے تعمیر کا کام شروع کرتے اور ساڑھے دس بجے ہی سے دوپہر کے وقفے کے لئے گھڑی دیکھنا شروع کر دیتے تھے۔ وہ کام کے آغاز میں ڈھیر سارا مسالہ تیار کر لیتے تھے اور شام کو اسے ختم کئے بغیر ریت میں دبا کر رفوچکر ہو جاتے تھے"۔ ہم نے اپنے دوست سے اس کی یہ "المناک" داستان سنی تو اس کی حالت زار پر ترس آیا اور کہا عزیز صبر کر! بولا "صبر کیسے کروں ابھی تو میں۔نے تمہیں یہ بتانا ہے کہ سیمنٹ کس طرح چوری ہوتا ہے بجلی' سینیٹری اور اس طرح کا دیگر سامان کس طرح زیادہ منگوایا جاتا ہے اور پھر یہ کس طرح غائب کیا جاتا ہے۔ ابھی تو میں نے تمہیں رنگ سازوں اور لکڑی کا کام کرنے والوں...... "مگر ہم نے ان کا بیان درمیان ہی میں روک دیا اور گفتگو کا رخ موڑنے کے لئے کہا "آؤ ذرا سیر کے لئے باہر چلتے ہیں" وہ بادل نخواستہ اٹھے اور ہمارے ساتھ ہو لئے۔ لیکن چند قدم چلنے کے بعد رک گئے اور بولے "اگر مارکس نے کبھی مکان بنایا ہوتا تو وہ کبھی "داس کیپیٹل لکھنے کے جھنجھٹ میں نہ پڑتا تو یقیناً مکان بناسکتا تھا لیکن اس نے کتاب لکھنے کو ترجیح دی ہم تو مکان بنانے کو ترجیح دیتے ہیں"۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوست تو ہم سے رخصت ہو گئے' لیکن ہم ایک اور "فروعی" مسئلے میں الجھ گئے یعنی مارکس کو اپنی زندگی میں مکان بنانے کا تجربہ ہوا تھا یا نہیں ہوا تھا؟ غالباً نہیں ہوا تھا تاہم ہم نے سوچا کہ اگر ہمارے دوست کی یہ ساری باتیں صحیح ہیں تو پھر اس امر کا امکان موجود ہے کہ مارکس نے مکان بنایا ہو اور مزدوروں سے اسی نوع کا سابقہ پڑنے کے بعد اس نے انتقامی کارروائی کے طور پر داس کیپیٹل لکھی ہو کہ پترو! پہلے تو تمہیں روکھی سوکھی مل ہی جاتی تھی۔ لیکن اب میں اس کتاب کی صورت میں تمہارے لئے ایسا نظام وضع کر رہا ہوں کہ تمہاری سات پشتیں یاد رکھیں گی تم لوگ ہڑتال تک کو ترس جاؤ گے اور انسانوں کی بجائے مشینوں کی جون میں آجاؤ گے لیکن دوسرے ہی لمحے ہم نے اپنے اس خیال کو جھٹک دیا کیونکہ اکابر مسلم مفکرین کی طرح ہم نے بلکہ ہماری طرح اکابر مسلم مفکرین نے مارکس کی نیک نیتی پر کبھی شک نہیں کیا کیونکہ مارکس وہ سرجن ہے جس کا آپریشن ٹھیک ہے بس قینچی پیٹ میں رہ گئی ہے۔

گم گشتہ

رات کو گیارہ بجے جب جھنگ سے تابوت جیسی شکل وصورت والی بس لاہور روانہ ہوئی تو مجھے جتنے کلمے یاد تھے، وہ میں نے دل ہی دل میں پڑھ لئے۔ اس بس کو ڈھائی بجے شب لاہور پہنچنا تھا۔ چنانچہ میرا خیال تھا کہ تین ساڑھے تین گھنٹے کی نیند بس میں کر لوں گا۔ اور نیند کی دوسری "قسط" گھر پہنچ کر "ادا" کر لوں گا۔ مگر جب بس سٹارٹ ہوئی تو میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا، کہ باقی سب کچھ ہو سکتا ہے، اس بس میں نیند نہیں ہو سکتی۔ گیٹ کے برابر والی سیٹ کا سپورٹنگ راڈ، ٹوٹا ہوا تھا، بلکہ کئی دفعہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اور اس دفعہ تو اس کی ویلڈنگ اکھڑی ہوئی تھی، چنانچہ بس کے سٹارٹ ہوتے ہی اس ٹوٹے ہوئے راڈ نے جلترنگ کی طرح بجنا شروع کر دیا۔ اگر معاملہ یہیں تک محدود رہتا تو شاید یہ جلترنگ "نیند آور" ثابت ہوتا۔ مگر ڈرائیور نے گانوں کی کیسٹ بھی آن کر دی تھی۔ اگر گانوں کی یہ ٹیپ صفدر جاوید چیمہ کے گانوں پر مشتمل ہوتی تو شاید مجھے نیند آ جاتی، مگر اللہ جانے اس ٹیپ میں کون مظلوم قید تھا۔ کیونکہ کثرت استعمال سے آواز بھی نہیں پہچانی جا رہی تھی۔ بلکہ یہ اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں تھا کہ جو آواز ہم سن رہے ہیں۔ وہ گانے کی ہے یا گانے والی کی ہے؟ اس کے علاوہ بس کے اندر کی تمام بتیاں ڈرائیور نے آن کر رکھی تھیں، جن کی موجودگی میں نیند آنا خاصا محال تھا۔ ان سب چیزوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ دراصل نیند ڈرائیور کو آئی ہوئی ہے اور یہ سارا ماحول اس نے صرف خود کو جگائے رکھنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ غالباً اپنی نیند ہی پر قابو پانے کے لئے وہ تنگ سی سڑک پر بس کو فل سپیڈ پر دوڑا رہا تھا اور "مور اوور" یہ کہ اسی سپیڈ پر بس چلاتے ہوئے وہ گردن موڑ کر کنڈیکٹر کو ہدایات بھی دیتا تھا۔ میری نشست بس کے بائیں جانب والے پہیئے کے عین اوپر واقع تھی، چنانچہ رہی سہی کسر ان جھٹکوں سے پوری ہو رہی تھی، جو ہر دو منٹ بعد میرا مقدر بنتے تھے۔ چنانچہ میں نے اپنا سر کھڑکی کے شیشے کے ساتھ ٹکا لیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اپنا سر بھی "واپس" لینا پڑا کیونکہ قدرے زوردار جھٹکے کی صورت میں سر ان دو راڈوں میں سے کسی ایک کے ساتھ جا ٹکراتا تھا، جو اس شیشے پر سے گزر رہے تھے۔ اس پر میں نے دائیں جانب سرکنے کی کوشش کی، مگر سیٹ اس قدر تنگ تھی کہ میرے ذرا سے دباؤ سے دوسرا مسافر سیٹ پر سے گرتے گرتے بچا، چنانچہ اس نے برا سا منہ بنا کر کہا "بھاجی! آرام نال بیٹھو"

اب میرے لئے نیند تو کجا، سکون سے بیٹھنے کے تمام راستے بھی مسدود ہو چکے تھے، چنانچہ میں نے سگریٹ نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو برابر والے مسافر نے ایک بار پھر برا سا منہ بنایا اور کہا "بھاجی، اپنی جیب چ ہتھ پاؤ" میں نے شرمساری کے عالم میں "سوری" کہا اور پوری احتیاط کے ساتھ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود ماچس نہ مل سکی، چنانچہ میں نے بادل ناخواستہ اپنے ہم نشست

سے ماچس مانگی اور اس نے بادل ناخواستہ جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس نکالی، اور میری پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی میری ہی طرح بیزار ہے۔ کیونکہ یہ سفر وہ بھی سہولت سے کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی نشست بھی بس کے اسی پہیئے پر واقع ہے، جہاں پر میری نشست ہے۔ ٹوٹے ہوئے راڈ، کی کھڑ کھڑاہٹ، ناہموار سڑک، پر شور گانوں، گھسی ہوئی کیسٹ کے اندر روشن تیز بتیاں اور ڈرائیور کی بے احتیاط ڈرائیونگ اسے بھی اتنا ہی ڈسٹرب کر رہی تھی۔ جتنا کہ میں اس ان سے ہو رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر ماچس اسے واپس کی اور کش لگاتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے باہر کی طرف جھانکا، مگر بس میں سے نکلتی ہوئی روشنیوں کے دائرے سے آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا

بس فیصل آباد پہنچ چکی تھی، جھنگ سے روانہ ہوتے ہوئے کنڈیکٹر نے مسافروں کو یقین دلایا تھا کہ یہ بس براہ راست لاہور تک جائے گی۔ مگر اب وہ مسافروں کو دوسری بس میں بٹھا رہا تھا کہ اس کا کہنا تھا بس خراب ہو چکی ہے۔ دوسری بس کے حالات بھی دگر گوں تھے۔ یہاں بھی پر شور گانوں کی گھسی ہوئی کیسٹ، بس کے اندر روشن تیز بتیاں ناہموار سڑک اور ڈرائیور کی بے احتیاط ڈرائیونگ مسافروں کی نیند اڑائے ہوئے تھی۔ اس بس کے مسافر بھی بس پر نہیں، بس کے پہیوں پر سفر کر رہے تھے اور اس دفعہ جو میرا ہم نشست تھا، وہ خود ہی بے چین نہیں تھا، اس کی مرغیاں بھی خود کو سخت بے چین محسوس کر رہی تھیں جن کی "نشست" اس مسافر کے پاؤں میں تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نیند کے غلبے کی وجہ سے اس کا پاؤں کسی مرغی کی گردن پر جا پڑتا اور بس کے دوسرے شور کے علاوہ ان بے زبانوں کی فریاد بھی سنائی دیتی۔ ہم جھنگ سے رات کو گیارہ بجے روانہ ہوئے تھے اور اصولاً ہمیں ڈھائی بجے لاہور پہنچ جانا چاہئے تھا، مگر اس وقت صبح کے چار بج چکے تھے۔ اور منزل کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ بس کی کھڑکیوں میں سے باہر کے موسم کا اندازہ ہوتا تھا، اور موسم کوئی اتنا سہانا نہیں تھا، آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور بجلی بار بار چمک رہی تھی۔ تھوڑی دیر ہی دیر بعد بارش شروع ہو گئی اور لگتا تھا یہ بارش بس کے باہر نہیں، بس کے اندر ہو رہی ہے۔ کیونکہ بارش کا پانی بس کی کھڑکیوں کے علاوہ چھت سے بھی ٹپکنا شروع ہو گیا تھا، چنانچہ بے آرام مسافروں کی بے آرامی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے ہم نشست مسافر کے پاؤں میں بیٹھے ہوئے مرغوں کی کڑکڑاہٹ بھی بڑھ گئی تھی، اور انہوں نے گھبرا کر بانگیں دینا شروع کر دی تھیں۔ باہر دن کی روشنی طلوع ہو چکی تھی مگر رات بھر جاگے ہوئے مسافروں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ یہاں سے لاہور سات آٹھ میل دور تھا اور بس ایک دفعہ پھر خراب ہو گئی تھی۔ بس میں بیٹھے ہوئے مرد، عورتیں، بچے بوڑھے ایک بار پھر ٹوٹے ہوئے جسموں کے ساتھ اٹھے اور تھکے تھکے قدموں کے ساتھ بس میں سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ ان کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ بارش ان کے سروں پر برس رہی تھی اور وہ ایڑیاں اٹھا کر کسی نئی بس کا انتظار کر رہے تھے، کسی ایسی بس کا، جس کا ڈرائیور انہیں ان کی گم گشتہ منزل تک پہنچا دے! ۔ ۱۱ جون ۱۹۸۳ء

اپنے جیسا اُمیدوار

بلدیاتی امیدواروں نے ووٹروں کے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے۔ چنانچہ ان دنوں وہ رابطے بحال کرنے کے لئے ڈور ٹو ڈور جارہے ہیں۔ ویسے ہمیں تو یہ انتخابات انتخابات کم رومانی فلم زیادہ لگتے ہیں۔ وہی وعدے وعید ہو رہے ہیں' پیمان وفا باندھے جارہے ہیں ڈوئٹ گائے جارہے ہیں درمیان میں ولن بھی آدھمکتا ہے۔ غلط فہمیاں بھی پیدا ہورہی ہیں' پے در پے حادثات بھی جنم لیتے ہیں۔ گویا یہ ایک مکمل رومانی فلم ہے مگر اس کا انجام فی الحال معلوم نہیں' یہ تو ڈائریکٹر پر منحصر ہے کہ وہ اسے طربیہ بنادے یا المیہ بنادے۔

جیسا کہ ہم نے ابھی کہا کہ وعدے وعید زوروں پر ہیں اور ووٹروں کا دل موم کرنے کے لئے کافرادائیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک امیدوار نے اپنے حلقے کے چیدہ چیدہ لوگوں کو اپنے گھر مدعو کیا اور عمر بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا۔ مگر "شکی القلب" ووٹروں نے مطالبہ کیا کہ یہ وعدہ قسم کھا کر کیا جائے اس پر امیدوار نے جذباتی انداز میں انہیں مخاطب کیا اور پوچھا "بھائیو! تم مسلمان ہو؟ اثبات میں جواب ملنے پر اس نے کہا" تو پھر کلمہ پڑھو! "اس پر سب نے با آواز بلند" لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" کا ورد کیا تو وہ گلوگیر ہوگیا اور کہا "بس کافی ہے اب ہم ایک دوسرے کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے"۔ واپسی پر ایک ووٹر نے دوسرے ووٹر سے کہا"۔ یار ہمارے ساتھ تو ہاتھ ہوگیا"۔ مخاطب نے پوچھا" وہ کیسے" ووٹر نے کہا" وہ ایسے کہ کلمہ پڑھ کر وعدہ تو اس نے کرنا تھا مگر اس نے الٹا ہمیں سے کلمہ پڑھوا کر ہمیں ساتھ نبھانے کا وعدہ لے لیا!"

ان وعدوں ہی کے سلسلے میں ایک حکائت یہ بھی ہے کہ کنویسنگ کے دوران ایک امیدوار اپنے ایک ووٹر کے پاس گیا اور ووٹ کے لئے وعدے پر اصرار کرنے لگا۔ ووٹر شریف آدمی تھا' اس نے وضاحت سے بتایا کہ وہ اس ضمن میں ایک دوسرے امیدوار سے وعدہ کر چکا ہے۔ یہ سن کر بھی امیدوار نے ہمت نہ ہاری اور کہا چھوڑیں جناب' وعدے کا کیا ہوتا ہے؟ اس پر امیدوار نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "اگر یہ بات ہے تو پھر آپ سے وعدہ رہا!"

اب اگر اتنی ساری باتیں ہم نے "دروغ بہ گردن راوی" والے کھلے کھاتے میں ڈال دی ہیں تو اس سلسلے کی ایک روائت اور سہی۔ اور وہ روائت یہ ہے کہ ایک امیدوار نے اپنے علاقے میں اپنے ہم مشروب لوگوں کو جمع کیا اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا" دوستو! میں نے آج تمہیں محض یہ نصیحت کرنے کے لئے زحمت دی ہے کہ اپنے ووٹ کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کرنا۔ ووٹ وہ تیر ہے جو ایک دفعہ کمان سے نکل جائے تو واپس نہیں

آتا۔ لہٰذا جب آپ ۲۵ ستمبر کو ووٹ ڈالنے جائیں تو بیلٹ بکس میں پرچی ڈالنے سے پہلے یہ اطمینان کر لیں کہ کیا آپ کسی شریف آدمی کو تو ووٹ نہیں ڈال رہے اگر ایسا ہو تو یقین جانیں کہ آپ نے اپنے ہاتھ خود کاٹ کر اس کے حوالے کر دئے ہیں۔ آپ میری بات کو مذاق نہ سمجھیں بلکہ اسے اس نقطہء نظر سے دیکھیں کہ اگر کل کلاں آپ اپنے کسی دوست کی بیٹھک میں بیٹھ کر جوا کھیلتے ہیں اور پولیس آپ کو پکڑ کر لے جاتی ہے تو آپ کو چھڑانے کے لئے تھانے کون جائے گا؟ وہ شریف آدمی! نہیں۔ میں جاؤں گا آپ میں سے کوئی چوری چکاری کے کیس میں پکڑا جاتا ہے اسے چھڑانے کے لئے تھانے کون جائے گا؟ وہ شریف آدمی؟ نہیں۔ میں جاؤں گا۔ آپ کے دفتر میں آپ پر کوئی غبن وغیرہ کا کیس بن جاتا ہے۔ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کرتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں۔ ذخیرہ اندوزی یا سمگلنگ کے الزام میں دھر لئے جاتے ہیں تو آپ کو چھڑانے کے لئے تھانے کون جائے گا؟ وہ شریف آدمی؟ نہیں میں جاؤں گا لہٰذا اپنے ووٹ کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کریں۔ ووٹ ایک قیمتی امانت ہے اور اسے اپنے ہی جیسے کسی انسان کے سپرد کریں!"۔

اخباری زنان خانے

پہلے گھروں میں "مردان خانے" اور زنان خانے" ہوتے تھے' اب یہ اخباروں میں ہوتے ہیں۔ رنگین صفحات میں "رنگین" تصویریں شائع ہوتی ہیں اور بلیک اینڈ وائٹ صفحات میں بلیک اینڈ وائٹ قسم کے مردوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں نیوز پیج پر مردوں کا قبضہ ہے اور فیچر والی سائیڈ پر اچھے "فیچر" والی خواتین قابض دکھائی دیتی ہیں۔ خبروں والے صفحات پر دوانچ تصویر کی اشاعت کے لئے بھی بڑے کڑے معیار مقرر ہیں اور یوں ہماشما کی تصویر شائع نہیں ہوتی۔ تصویر کی اشاعت کے لئے کم سے کم شرط یہ ہے کہ پاکستان اور قائداعظمؒ کے خلاف بیان دیا جائے تاہم صدر' وزیراعظم' گورنر صاحبان' وزرائے اعلیٰ اور وزرائے کرام کے لئے خصوصی رعایت ہے .... ــــــ ـ ـ یعنی ان کے لئے ان بیانات سے چشم پوشی کافی ہے۔ خبروں والے صفحات پر کبھی کبھی کسی خاتون کی تصویر بھی شائع ہو جاتی ہے مگر اس خاتون کا اغواء ہونا ضروری ہے بلکہ اگر آبروریزی کا کیس ہو تو یہ اضافی کوالیفیکیشن ہے۔ گاہے گاہے بعض سیاست دان خواتین کی تصویر بھی ان صفحات میں شائع ہو جاتی ہے تاہم اس کے لئے عمر کی حد مقرر ہے جو زیادہ سے زیادہ چالیس برس ہے اور اوور ایج خواتین کی تشہیر مشرقی اقدار کے منافی ہے!

ابھی اخبار کے "مردان خانے' کا ذکر مکمل نہیں ہوا تھا کہ درمیان میں خواتین کا ذکر آ گیا۔ "مردان خانے" یعنی خبروں والے صفحے میں تصویر کے علاوہ سرخی کے سائز کے لئے بھی کچھ قواعد و ضوابط ہیں' مثلاً اگر ایک پرامن جلوس نکلتا ہے تو اس کی سنگل کالم سرخی ہو گی' لیکن اگر کوئی چھوٹا سا جلوس دو تین بسوں کو آگ لگا دیتا ہے اور توڑ پھوڑ کرتا ہے تو یہ خبر کم از کم چار کالم سرخی کی مستحق بن جاتی ہے۔ سرخی وغیرہ کے ضمن میں یہ اصول مرحومین کے سلسلے میں بھی برتے جاتے ہیں! یعنی مرحوم نے اگر ملک و قوم کے لئے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور اس کا کوئی رشتے دار اخبار میں ملازم بھی ہے تو اس کی وفات کی خبر سنگل کالمی سرخی کے ساتھ شائع ہو سکتی ہے لیکن مرحوم اگر فلم یا ٹی وی کا اداکار ہے تو اس پر سرخی کے سائز کی کوئی حد متعین نہیں' بلکہ اس کے لئے اخبار کا خصوصی ضمیمہ بھی نکالا جا سکتا ہے۔ سرخی کے بڑا چھوٹا ہونے میں انسان کا "بڑا" "چھوٹا" ہونا بھی مدنظر رکھا جاتا ہے!

جہاں تک اخباروں کے "زنان خانے" کا تعلق ہے' یہ اخباروں کا سب سے بارونق حصہ ہوتا ہے۔ اس میں اودے اودے' نیلے نیلے اور پیلے پیلے پیرہن نظر آتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھیں تو ہر پیکر تصویر کا پیرہن

کاغذی ہوتا ہے اور تہذیب حاضر کے حوالے سے فریادی دکھائی دیتا ہے۔ اخباروں کے "زنان خانے" میں تصویر کی اشاعت کے لئے کوئی کڑا معیار مقرر نہیں، ماسوائے اس کے کہ جو شکل نظر آئے "تصویر" نظر آئے۔ البتہ سائز ضرور متعین ہے یعنی یہ تصویر آدھے صفحے سے کم نہیں ہونی چاہئے۔ اخباروں کے یہ صفحات شرفاء کے لئے مفید ہیں جو راہ چلتی خواتین کو دیکھ کر آنکھیں جھکا لیتے ہیں تاکہ قیامت والے دن ان سے اگر عورت کے سراپا کے بارے میں سوال ہو تو وہ کم از کم تصویروں کی وجہ سے ندامت سے بچ جائیں۔ ان تصویروں کا ایک افادی پہلو یہ بھی ہے کہ لوگ فراڈ قسم کے میرج بیوروز کے نرغے میں آنے سے بچ جاتے ہیں۔ خواتین کی یہ تصویریں صرف خواتین کے صفحات پر شائع نہیں ہوتیں بلکہ ان کے لئے کسی بھی صفحے کو خواتین کے صفحے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ تصویریں سیاسی سرگرمیاں کم ہونے کی وجہ سے شائع کی جاتی تھیں، ان دنوں یہ تصویریں سیاسی سرگرمیاں زیادہ ہونے کی وجہ سے شائع کی جاتی ہیں تاکہ اعصابی کھچاؤ کو کم کیا جا سکے حالانکہ سیاسی سرگرمیوں اور ان تصویروں کی بیک وقت اشاعت سے قوم کو "گرم سرد" ہو سکتا ہے۔

ویسے یہ "مردان خانے" اور "زنان خانے" اخباروں ہی میں نہیں، حکومت اور اپوزیشن میں بھی ہیں۔ البتہ ان کی صورت مختلف ہے۔ حکومتی "زنان خانے" میں بڑی بڑی مونچھوں والے مرد گھونگٹ اوڑھے بیٹھے ہیں، ان کے سامنے جتنی دفعہ بھی "قبول" کہا جائے، یہ ہر دفعہ ہاں میں سر ہلا دیتے ہیں، بس "حق مہر" کی رقم اور نان نفقہ ٹھیک ہونا چاہئے یہ بہت کم گو ہیں کچھ بھی ہو جائے بولتے نہیں کہ صاحبان اقتدار نے انہیں "پابند" کیا ہوا ہے۔ حکومتی ایوان میں ایک مردان خانہ بھی ہے، تاہم یہ شنید ہے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ جہاں تک اپوزیشن کا تعلق ہے، اس کے "زنان خانے" میں یوں تو بے نظیر بھٹو نسیم ولی خان، تہمینہ کھر اور حمیدہ کھوڑو وغیرہ موجود ہیں لیکن یہ "زنانیاں" خود کو زنان خانے تک محدود نہیں سمجھتیں، جبکہ اپوزیشن کا ایک "زنان خانہ" وہ ہے جو اگرچہ مردوں پر مشتمل ہے مگر شرعی پابندیوں کی وجہ سے سڑکوں پر نکلنے کو معیوب سمجھتا ہے اور اس میں سبھی جماعتوں کے "زنانے" شامل ہیں، اپوزیشن میں بھی مردان خانے موجود ہے، مگر یہ بھی شنید کی حد تک ہے اور یوں اس کی بھی تردید یا تصدیق بھی نہیں ہو سکتی۔ باقی احوال ۲۴، فروری ۱۹۸۷ء

عیادت کرنا منع ہے

ہمارے ایک دوست حال ہی میں طویل علالت کے بعد صحت یاب ہوئے ہیں۔ موصوف چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو پہلا "بیان" انہوں نے عیادت کرنے والوں کے خلاف داغا بولے "تمہیں پتہ ہے بیماری مجھے سب زیادہ تکلیف کس نے پہنچائی؟"۔

"کس نے؟" میں نے پوچھا

"عیادت کرنے والوں نے" دوست نے جواب دیا

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ صبح سے شام تک ان کا تانتا بندھا رہتا تھا 'ایک آتا تھا' دوسرا جاتا تھا"۔

"یہ تو اچھی بات ہے 'اپنوں اور غیروں کا پتہ ایسے مواقع ہی پر چلتا ہے!"۔

"میں نے کب کہا ہے کہ یہ اچھی بات نہیں!"

"تمہاری باتوں سے تو مجھے یہی محسوس ہوا"

"تم نے ابھی میری بات سنی کب ہے؟۔ یہ عیادت کرنے والے میری حالت دیکھ کر ایسے مغموم چہرے بناتے تھے کہ لگتا تھا مجھ سے زیادہ دکھی یہ ہیں"۔

"ظاہر ہے عزیزو اقارب کو دکھ تو ہوتا ہی ہے"۔

ہاں! تمہاری بات اصولی طور پر ٹھیک ہے۔ غلط تو یہ اس وقت ثابت ہوئی جب ان میں سے کچھ نے کہا کہ کوئی مسئلہ ہو تو ہمیں بتاؤ اس پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ نہیں ہمیں خدمت بتاؤ ہم تمہیں صحت یاب دیکھنا چاہتے ہیں!"۔

"پھر کیا ہوا؟"۔

"میں سمجھا کہ وہ خلوص دل سے اس مشکل وقت میں میرے کام آنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک سے جھجکتے جھجکتے کہا "میری علالت کی وجہ سے بچے سکول نہیں جا رہے کیونکہ انہیں لانے لے جانے والا کوئی نہیں جس سے ان کی تعلیم کا حرج ہو رہا ہے' آپ اپنے بچوں کو سکول چھوڑنے جاتے ہیں' رستے میں میرے بچوں کو بھی "پک" کر لیا کریں"۔

"تو کیا انہوں نے انکار کر دیا؟"

"نہیں! پورے ایک ہفتے تک بچوں کو لے جاتے رہے' اس کے بعد انہوں نے شکل ہی نہیں دکھائی!"
"یہ تو واقعی بری بات ہے!"
"ابھی تو میں نے تمہیں اور بھی بہت سی بری باتیں سنانی ہیں"۔
"مثلاً"
"مثلاً یہ کہ میری بیوی میری دیکھ بھال کرتے کرتے خود بیمار ہو گئی' اس پر میں نے اپنے ایک غم خوار سے کہا کہ آپ آج کی رات میری دیکھ بھال کے لئے یہیں رک جائیں' میں کل کوئی اور انتظام کر لوں گا۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے کہا
"کیوں نہیں' کیوں نہیں میں گھر اطلاع دے کر ابھی آتا ہوں"۔ مگر تھوڑی دیر بعد ان کی جگہ ان کی بیوی کا فون آیا کہ گھر آتے ہی انہیں تیز بخار ہو گیا ہے اس لئے وہ نہیں آسکیں گے!"۔
"چلو چھوڑو یار! کوئی اور بات کرو!" میں نے بدمزہ ہو کر کہا۔
"کیسے چھوڑوں! مجھے تو ان خالی عیادت کرنے والوں سے چڑ ہو گئی ہے' شکر ہے تم ان دنوں بیرون ملک تھے"
"اچھا دفع کرو' کوئی اور بات کرتے ہیں"۔
"اپنی بات تو تم نے کہہ دی......"
"میں نے ابھی اپنی بات نہیں کہی' کیونکہ یہ عیادت کرنے والے اب بھی سخت پریشان کرتے ہیں"
"وہ کیوں! تم تو ٹھیک ہو گئے ہو!"
"میں تو ٹھیک ہو گیا' یہ ٹھیک نہیں ہوئے' ابھی کل ایک صحافی دوست آئے' ملکی حالات پر سخت پریشان تھے۔ پاکستان کا نام ان کی زبان پر آتا تھا تو آب دیدہ ہو جاتے تھے۔ میں نے ان کی یہ حالت دیکھی تو کہا کہ آپ اگر چاہیں تو ملک کو ان خطرات سے نکال سکتے ہیں بولے وہ کیسے؟ میں نے کہا آپ ان تمام افراد کے چہروں پر سے اٹھائیں جو حکومت کے اندر اور حکومت کے باہر ملکی سالمیت کے خلاف کام کر رہے ہیں! کہنے لگے حتی المقدور یہ کام کرتا رہتا ہوں' میں نے کہا حتی المقدور کیا ہوتا ہے' اگر ملک بچانا ہے تو پورا سچ لکھنا ہو گا۔ کہنے لگے۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے ہیں بے عمل ضرور ہوں تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے پاکستان سے محبت نہیں...... اور پاکستان کا نام زبان پر آنے پر ایک بار پھر وہ آبدیدہ ہو گئے!"
"یہ عیادت کے ذکر میں پاکستان کہاں سے آگیا!"
"کیا تمہیں نہیں . . . . . . پتہ یہ کیسے درمیان میں آگیا؟ یہ لوگ بیمار پاکستان کی عیادت دن میں کئی بار کرتے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی اس کی صحت یابی کے لئے اپنا کردار ادا نہیں کرتا۔ صحافی سچ نہیں لکھتا۔ استاد موسیٰ کی بجائے فرعون پیدا کرتا ہے۔ سیاست دان اقتدار کے لئے ملک دشمنوں سے گٹھ جوڑ کر لیتا ہے' عالم فساد پھیلاتے ہیں' انکم ٹیکس والے لاکھوں کے لئے کروڑوں کا ٹیکس چھوڑ دیتے ہیں' صنعت کار ہوس زر میں مبتلا ہے' حکمرانوں کو حکومت کا چسکہ ہے۔ دانشور دل کی باتیں کہنے کی بجائے فیشن ایبل باتیں کرتا ہے۔ جرنیل

ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ سب لوگ پاکستان کی عیادت بھی کرتے رہتے ہیں انھیں چاہیں پاکستان کو یہ عیادت کرنے رہتے ہیں۔ یہ اس کے دکھوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ میں تو انہی دنوں میں ایک تختی لکھوا کر مینار پاکستان پر لگا رہا ہوں!"

"کونسی تختی؟"

"چند لفظوں پر مشتمل تختی...... اس پر لکھا ہو گا "عیادت کرنا منع ہے"۔

شاید یہ تختی لوگوں کو عیادت کے آداب سکھادے؟ ۔

آپ کو کیا تکلیف ہے؟

کیا زمانہ آگیا ہے کہ یاروں میں وضع داری نام کو نہیں رہی، پہلے کسی سے اس کا حال پوچھتے تھے تو وہ اگر درد سے کراہ بھی رہا ہوتا تو یہی کہتا کہ "کہ اللہ دا شکر اے۔ تُسی سناؤ" مگر اب جس سے بھی حال پوچھیں وہ آگے سے احوالِ واقعی سنانے لگتا ہے "تنخواہ بہت تھوڑی گزارا نہیں ہوتا، جوڑوں میں درد رہتا ہے، بچہ بیمار ہے، بیٹی کی شادی کی فکر ہے، داخلے کا مسئلہ اٹکا ہوا ہے، مالک مکان تنگ کرتا ہے، ٹرانسپورٹ کی بہت تکلیف ہے، بیس سال سے مقدمے کی تاریخیں بھگت رہا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اب تنگ آکر ہم نے لوگوں سے ان کا حال پوچھنا ہی چھوڑ دیا ہے، اس کے بجائے، بوقت ملاقات ہم پوچھتے ہی یہ ہیں کہ "آپ کو کیا تکلیف ہے؟" جس پر ملاقاتی اتنا خوش ہوتا کہ فرفر اپنی تکلیفیں بیان کرنے لگتا ہے۔ بلکہ ہم تو اس معاملے میں اتنے محتاط ہوگئے ہیں کہ کسی خوش باش کو بھی دیکھیں تو بھی اس سے یہ سوال کرتے ہیں کہ "آپ کو کیا تکلیف ہے" جس سے وہ اور زیادہ خوش باش سا نظر آنے لگتا ہے اور رٹے ہوئے پہاڑوں کی طرح اپنی تکلیفیں سنانے لگتا ہے، بلکہ اس کے بعد ہم ایک بات یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمیں بہت اچھا انسان سمجھنے لگتا ہے اور ہمارے اس کے تعلقات پہلے سے زیادہ خوشگوار ہوجاتے ہیں۔ متذکرہ سوال کے یہ مثبت نتائج دیکھ کر ہم نے اس رویّے کو اب اپنا وتیرہ بنالیا ہے، چنانچہ اب کسی کے ہاں مہمان جائیں اور ان کے سرخ وسفید ہٹے کٹے بچوں کو دیکھیں، تو ماشاءاللہ دل میں کہہ لیتے ہیں، مگر زبان سے یہی کہتے ہیں آپ کے بچے تو سوکھ کر کانٹا ہورہے ہیں، رنگ ہلدی کی طرح ہورہا ہے، انہیں کیا تکلیف ہے؟ اس پر صاحب خانہ خصوصاً بچوں کی والدہ کا چہرہ کھل اٹھتا ہے اور وہ کہتی ہے بس کیا بتاؤں بھائی صاحب، میں تو ان بچوں سے جلی بیٹھی ہوں، نہ کچھ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، بس ان کا دھیان ہر وقت کھیل میں لگا رہتا ہے، اسی طرح کسی نئے ماڈل کی قیمتی کار کے مڈگارڈ کے ساتھ کالی ٹاکی بندھی دیکھ کر ہم پہلے حیران ہوتے تھے کہ اتنی خوبصورت کار کو اس کے مالک نے کیا "نج" لگایا ہوا ہے، مگر جب سے معلوم ہوا کہ یہ کالی ٹاکی دراصل عالیشان کوٹھیوں کی پیشانیوں پر لکھے ہوئے الفاظ "ماشاء اللہ، نظر بد دور" کا نعم البدل ہے، تو اب ہم اس پر حیرانی کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ کار کے مالک سے کہتے ہیں کہ آپ عیالدار آدمی ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ بہت تنگ دستی کی زندگی بسر کررہے ہیں، اوپر سے آپ یہ کار خرید بیٹھے ہیں، آخر آپ کی کیا تکلیف ہے؟ اس پر کار کا مالک جس قدر خوش ہوتا ہے، وہ ہم ہی جانتے ہیں لیکن وہ بظاہر بڑے دکھ سے کہتا ہے کہ کیا کریں جناب، بیٹیوں کی شادی کرنی ہے، اس قسم کی جھوٹی شان نہ رکھیں، تو ڈھنگ کا رشتہ نہیں ملے گا!

اور اب اگر سچ پوچھیں تو ڈیل کارنیگی کے بعد ہم دوسرے آدمی ہیں' جس نے لوگوں کے دل موہ لینے کا یہ نیا طریقہ ایجاد کیا ہے' اس کے نتیجے میں دکھ درد کے مارے لوگوں کی تسکین خاطر ہوتی ہی ہے' لیکن اس سے وہ لوگ بھی خوش ہوتے ہیں' جنہوں نے اپنی بے حساب خوشیوں کے لئے باقی دنیا کو دکھی کیا ہوا ہے۔ اس ایک چھوٹے سے فارمولے کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے ہم نے قومی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ اس کے ذریعے اقتدار میں آسکیں۔ ہمیں یقین ہے اس نسخے پر عمل کرتے ہوئے ہم انشاء اللہ پانچ برس کے عرصے میں صاحب اقتدار ہوں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ عرصہ کچھ زیادہ ہے مگر ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم سویلین ہیں۔ ممکن ہے بعض دوست حیران ہو رہے ہوں کہ ہم متذکرہ نسخے پر عمل کر کے اقتدار میں کیسے آسکتے ہیں تو جہاں اقتدار بزور بازو حاصل کیا جاتا ہے' وہاں بذریعہ منت ترلے حاصل کرنے کی روایت بھی موجود ہے' چنانچہ ہمارا پلان یہ ہے کہ ہم ہر مکتب فکر کے سیاست دانوں اور صاحبان اقتدار کے آستانے پر حاضر ہوں گے اور ان سے یہی پوچھیں گے کہ آپ کو تکلیف کیا ہے۔ جس پر وہ اتنے خوش ہوں گے کہ ہمیں اس پورے مکتب فکر کی حمایت حاصل ہو جائے گی' یہ خوشامد کا تازہ ترین طریقہ ہے' جو بحمداللہ ہمارے اپنے زور فکر کا نتیجہ ہے۔ اپنے اس منصوبے کا آغاز ہم دینی جماعتوں کے سیاسی علماء سے کریں گے اور ان سے پوچھیں گے کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ جواب میں وہ فرط مسرت سے اپنے اپنے فرقے کی بالادستی کے لئے کی گئی کوششوں کا ذکر کریں گے اور اس بات پر اظہار تاسف کریں گے کہ اس کے باوجود وہ تاحال اقتدار میں نہیں آسکے اور ہم اس تمام عرصے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں گے۔ مذہبی علیحدگی پسندوں کے علاوہ ہمارا ارادہ سیاسی علیحدگی پسندوں کی حمایت حاصل کرنے کا بھی ہے۔ چنانچہ اس کے لئے ہم ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوں گے اور پکا سامنہ بنا کر پوچھیں گے کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ اس پر یہ خوانین اور وڈیرے اپنے احساس محرومی کی تفصیل بتائیں گے کہ کس طرح انہیں تاحیات اقتدار میں رکھنے کے بجائے محض چند برسوں کے لئے اقتدار کے مزے لوٹنے کا موقع دیا گیا' چنانچہ اس کے بعد سے انہوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب وہ مغربی عشرت کدوں سے روسی ٹینکوں پر بیٹھ کر ہی واپس آئیں گے۔ ہمارا ارادہ محب وطن سیاسی رہنماؤں کی حمایت حاصل کرنے کا بھی ہے' اور ان کے آستانوں پر حاضر ہونے کا پروگرام بھی ہے ان سے بھی یہی پوچھنا ہے کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ ظاہر ہے اس پر یہ حضرات بھی خوش ہوں گے اور کہیں گے کہ ہمیں ذاتی تکلیف تو کوئی نہیں' ملک کو مارشل لار کے چنگل سے آزاد کروانا چاہتے ہیں اور قائداعظم کی خواہش کے مطابق اس ملک کو ایک اسلامی فلاحی ریاست دیکھنا چاہتے ہیں' ہم ان کی ہاں میں ہاں بھی ملائیں گے البتہ اقتدار میں آنے کے بعد' اقتدار میں مسلسل رہنے کے لئے' ہمیں جہاں دوسروں سے نبٹنا پڑے گا' وہاں ان سے بھی نبٹ لیں گے ....!

اوپر بیان کئے گئے مرحلہ وار پروگرام کی آخری "شق" یہ ہے کہ ہم صاحبان اقتدار کی چوکھٹ پر بھی سجدہ ریز ہوں گے اور کورنش بجالانے کے بعد ان سے پوچھیں گے کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ یقین تو ہمیں یہی ہے کہ ہمارے اس سوال کا رد عمل خوشگوار ہو گا' مگر اس کے ساتھ ساتھ دل میں تھوڑا سا شک بھی ہے' کیونکہ اقتدار کا نشہ بہت

براہوتا ہے' چنانچہ ممکن ہے ہمارے پینٹ سوال " آپ کو کیا تکلیف ہے؟ " کے جواب میں وہ ایک بھرپور قہقہہ لگائیں اور کہیں "ہمیں کیا تکلیف ہو سکتی ہے' ہم تو مزے سے حکومت کر رہے ہیں' تکلیف تو تم جیسے کیڑے مکوڑوں کو ہوگی جو رفع بھی ہو سکتی ہے' بولو کوئی پرمٹ لینا ہے۔ کوئی نوکری لینی ہے' غیر ملکی دوروں میں ساتھ جانا ہے یا ویسے ہی زندگی سے تنگ آ گئے ہو؟" اس صورت میں غالباً یہی مناسب ہو گا کہ ہم ان کے پاؤں پکڑ لیں اور گڑگڑا کر عرض کریں کہ یہ خادم بس حضور کی زیارت کے لئے حاضر ہوا تھا' اب واپس جانے کی اجازت دیں!

بے تکلفان شہر!

دو ایک ماہ پیشتر ہم نے فوری طور پر بے تکلف ہو جانے والے لوگوں کے بارے میں ایک کالم لکھا جس سے ہماری بھڑاس تو قدرے نکل گئی، لیکن بہت سے دوستوں کی تسلی نہیں ہوئی اور اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کے "متاثرین" کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ نیز ان یک طرفہ بے تکلفان شہر کے لگائے ہوئے زخم خاصے کاری ہیں تبھی تو ایک کالم سے "پبلک" کے یہ زخم مندمل نہیں ہوئے۔ مثلاً ایک زخم خوردہ ہمیں گذشتہ روز ملے، یہ ایک فرم کے جنرل منیجر ہیں، کہنے لگے "ایک اسی قسم کے یک طرفہ بے تکلف نے میری زندگی بھی اجیرن کی ہوئی ہے، خدا کے لئے مجھے بچاؤ"۔ ہم نے ہنستے ہوئے پوچھا "کیا ہوا؟"۔ یہ دکھی شخص بولا "پوچھو کیا نہیں ہوا؟ ایک روز ان صاحب نے فون کیا اور میری سیکرٹری سے کہا "تھیلا ہے؟" اس بچاری نے حیران ہو کر پوچھا "کونسا تھیلا؟" اس پر اس مردود نے کہا "وہی تھیلا جسے تم لوگ طفیل کہتے ہو، وہ باس تمہارا ہو گا، میرا تو دوست ہے"

"تو کیا یہ تمہارا دوست نہیں ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"دوست ہوتا تو پھر شکوہ کاہے کا تھا"۔ اس مظلوم نے روہانسا ہو کر کہا "ایک دفعہ ایک ریستوران میں اس سے ملاقات ہوئی تھی، یہ وہاں میرے ایک دوست کے ساتھ بیٹھا تھا، تھوڑی ہی دیر میں یہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا اور تُو تڑاق میں پر اتر آیا۔ بعد میں میں نے اپنے دوست سے کہا اگر یہ تمہارا دوست نہ ہوتا، تو میں اسے اس طرز عمل کی اجازت نہ دیتا۔ یہ سن کر اس دوست نے خود کو دو ہتڑ رسید کیا اور کہا کہ میں تو اس روز تمہارا دوست سمجھ کر اسے برداشت کرتا چلا آرہا ہوں۔ میں نے اس کم بخت کی اس سے پہلے کبھی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ تو میرے آنے سے پہلے میرے ایک دوست کے ساتھ اس میز پر بیٹھا ہوا تھا"۔

ایک اور دوست سے ملاقات ہوئی، تو وہ بھی اسی طرح جلا بیٹھا تھا۔ دیکھتے ہی بولا "تم نے اپنے کالم میں جن یک طرفہ طور پر بے تکلف ہونے والوں کا ذکر کیا تھا، وہ تو بڑے بھلے مانس لوگ تھے، تم کسی روز میرے دفتر آؤ، میں تمہیں ایک اصلی بے تکلف دکھاؤں!"۔

"وہ کیا چیز ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"وہ؟ وہ صبح مجھ سے پہلے میرے دفتر میں پہنچا ہوا ہوتا ہے، میں جب دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں داخل ہوتا ہوں، تو وہ میری کرسی پر بیٹھا، ٹانگیں میز پر پھیلائے کسی سے ٹیلی فون پر بات کر رہا ہوتا ہے، وہ مجھے مہمانوں کے لئے بچھی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے، اس کے سامنے چائے کی پیالی دھری ہوتی ہے، وہ

گفتگو سے فراغت کے بعد گھنٹی بجا کر میرے چپڑاسی کو بلاتا ہے اور کہتا ہے۔ صاحب کو چائے پیش کرو"۔

"بھئی واہ" ہم نے اپنے اس دوست کو چھیڑنے کے لئے کہا "دوستی ہو تو ایسی ہو!"۔

"دوستی؟" اس نے ہسٹریائی انداز میں چیخ کر کہا "یہ جس محکمہ میں ملازم ہے۔ میری فرم کو ایک دفعہ اس سے کوئی پڑا تھا بس اس وقت سے یہ بد بخت مجھے چمٹا ہوا ہے' اس نے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے اور میرا مجاور بن گیا ہے۔ خدا کے لئے مجھے اس کے چنگل سے نکالو"۔

البتہ ایک دوست ایسے بھی تھے جن کا مسئلہ متذکرہ دوستوں سے قدرے مختلف تھا۔ گذشتہ روز ملے تو کہا "تم بزرگوں کے احترام کے قائل ہو؟" ہم نے کہا "یقیناً کیونکہ بالآخر ہم نے بھی بزرگی کی منزل تک پہنچنا ہے"۔ پوچھنے لگے "کیا بزرگوں کو بھی چھوٹوں کی عزت کا خیال رکھنا چاہئے"۔

ہم نے جواب دیا "یہ ان کے حق میں بہتر ہے!" اس پر وہ گلوگیر ہو گئے اور کہنے لگے "مگر ان بزرگوں نے تو اپنی بے تکلفی سے ہمارا کچومر نکال دیا ہے۔ یہ جب مجھے ملنے آتے ہیں تو میں ان کی عزت کرتا ہوں اور یہ مجھے برخودار' عزیزی اور نور چشمی وغیرہ کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ مگر اپنے کام کے سلسلے میں گاہے بگاہے ملنے والے ان سینکڑوں بزرگوں کی باتوں سے لگتا ہے جیسے ایام طفولیت میں ان سب نے باری باری مجھے اپنی گود میں پالا تھا۔ میں نے بچپن میں ان میں سے ہر دوسرے بزرگ کی گود میں "چھی" کر کے اس کے کپڑے ناپاک کئے تھے۔ میرے لئے دودھ یہ گرم کیا کرتے تھے اور فیڈر میں بھر کر مجھے پلایا بھی یہی کرتے تھے۔ میں یہ باتیں اتنے تواتر سے سنتا ہوں کہ بھول جاتا ہوں کہ اب میں خود بھی کئی بچوں کا باپ ہوں۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ بسا اوقات بیٹھے بیٹھے انگوٹھا چوسنے لگتا ہوں۔ یار خدا کے لئے مجھے اس "انجمن یک طرفہ بے تکلفان شہر" کے بزرگ اراکین سے بچاؤ' نہیں تو میں تباہ ہو جاؤں گا کیونکہ کچھ دنوں سے میرا جی چاہ رہا ہے کہ کرسی پر بیٹھنے کی بجائے پنگوڑے میں لیٹ کر ٹانگیں چلانا شروع کر دوں اور ان بزرگوں میں سے کوئی آئے تو لپک کر اس کی گود میں سوار ہو جاؤں اور پھر چپکے سے "چھی" کر دوں!"۔

۲۷ نومبر ۱۹۸۱ء

سیٹ لیس ڈے

ہم نہیں جانتے گوشت کے ناغے کے لئے منگل اور بدھ کے دن کیوں مخصوص کئے گئے ہیں۔ اتوار اور پیر کیوں نہیں یا جمعرات اور جمعہ اس ناغے کے لئے کیوں موزوں نہیں؟ ممکن ہے بعض دوست اس کے جواب میں کہیں کہ منگل اور بدھ کی بجائے گوشت کے ناغے کے لئے جونسے دن بھی مخصوص کئے جاتے ان پر یہی اعتراض وارد ہو سکتا تھا جو منگل اور بدھ کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے ان لائنوں پر سوچنے والے دوست اعتراض کی قدر و قیمت ہی سے واقف نہیں' وہ یہ جانتے ہی نہیں کہ اعتراض برائے اعتراض میں جو لذت ہے' وہ ویسی ہی ہے جو "ادب برائے ادب" میں یا ایک خاص قسم کی اپوزیشن میں ہے۔ چنانچہ اس کی لذت یا تو انتظار حسین جانتے ہیں اور پھر اپنے اصغر خاں جو گذشتہ ایک دہائی سے وقفوں وقفوں کے ساتھ اپوزیشن میں ہیں!۔

ویسے ہمیں خود معلوم نہیں کہ ہم نے بیٹھے بٹھائے یہ "میٹ لیس ڈیز" کا قصہ کیوں چھیڑ دیا۔ کیونکہ یہ وہ قصہ ہے۔ جس میں دلچسپی رکھنے والے بہت کم ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بہت بڑی اکثریت کے لئے ہفتے کے ساتوں دن عملی طور پر "میٹ لیس ڈیز" ہی میں شمار ہوتے ہیں۔ جو قدرے سفید پوش ہیں۔ یہ دو دن ان کی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے ہیں' چنانچہ وہ منگل اور بدھ کے روز پورے دھڑلے سے گھر میں سبزی پکاتے ہیں اور اگر کوئی مہمان وغیرہ آ جائے تو انہیں چنداں ندامت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا' بس انتظامیہ کو دو چار گالیاں دینا پڑتی ہیں کہ اس نے بلاوجہ یہ پابندی نافذ کر رکھی ہے' جس کی وجہ سے انہیں مجبوراً سبزی وغیرہ پر گزارا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس صورت حال میں مہمان مطمئن ہو یا نہ ہو' بہرحال خاموش ضرور ہو جاتا ہے' بشرطیکہ یہ مہمان وہ مراثی نہ ہو' جو گوشت کے ناغے والے دن ایک سفید پوش کا مہمان ہوا' تو میزبان نے اپنی بیوی سے مشورہ کرتے ہوئے کہا کہ آج دال نہ پکائی جائے بیوی نے کہا نہیں سبزی مناسب رہے گی۔ مراثی نے یہ گفتگو سنی تو صحن میں "چہل قدمی" کرتی ہوئی مرغیوں کو ایک نظر دیکھا اور کہا "آپ کو زیادہ تردد کی ضرورت نہیں' آپ میرا گھوڑا ذبح کر کے پکائیں' میں مرغی پر بیٹھ کر واپس گاؤں چلا جاؤں گا"۔

سو اگر سچ پوچھیں تو عوام الناس میں اتنی مقبولیت آج تک کسی شخصیت کو بھی حاصل نہیں ہوئی جتنی ان "میٹ لیس ڈیز" کو حاصل ہے کہ یہ دو دن ان کے لئے "ستار العیوب" ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں تو اس بحث میں پڑنے کی بجائے کہ ناغے کے لئے کون سے دو دن مناسب ہیں' الثانیہ مطالبہ کرنا چاہئے کہ "میٹ لیس ڈیز" کی طرح دو دن "سویٹ لیس ڈیز" کے بھی ہونے چاہئیں۔ یعنی ہفتے کے کسی دو دنوں میں میٹھی چیزوں

کے استعمال پر پابندی عائد کر دی جائے۔ البتہ اگر کوئی میٹھے بول بولنا چاہے یا کسی کو میٹھی نظروں سے دیکھنے پر مائل ہو، تو اسے اس پابندی سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے، چنانچہ ہمیں یقین ہے کہ اس اقدام کی برکت سے گاہے گاہے جو "چینی کا قحط الرجال" پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اس پر قابو پانا ممکن ہو جائے گا۔

اب اگر یہ تذکرہ چھڑ ہی گیا ہے تو میٹ لیس اور سویٹ لیس ڈیز کی طرح ہفتے میں دو دن "ہیٹ لیس ڈیز" کے طور پر بھی مخصوص ہونے چاہئیں، یعنی ان دنوں میں بجلی یا سوئی گیس کا چولہا جلانے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے، تاکہ بجلی اور سوئی گیس کی بچت ہو سکے، بلکہ یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ ان دو دنوں میں کسی گھر میں سرے سے ہی چولہا نہ جلے، اس سے ایک تو قومی دولت کے اس ضیاع میں کمی واقع ہو گی جو لاکھوں اور کروڑوں لوگ محض اپنے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے ہر روز بلا دریغ کرتے ہیں اور دوسرے کنواروں کا وہ پرانا گلہ بھی دور ہو جائے گا جو وہ اپنے "قومی ترانے" سے

رناں والیاں دے پکن پراٹھے تے چھڑیاں دی اگ نہ بلے

.... کی صورت میں برس ہا برس سے الاپ رہے ہیں۔ اور بالفرض محال اگر ہماری اس تجویز پر فوری عمل ممکن نہ ہو تو فی الحال ہفتے میں دو دن "ویٹ لیس ڈیز" کے طور پر مخصوص کر دیئے جائیں، یعنی ان دو دنوں میں گندم سے تیار شدہ کوئی چیز کھانے پر پابندی عائد کر دی جائے، یہ ایک طرح سے 'انسانوں کی طرف سے اپنے جد امجد آدم کی یاد منانے کا ایک طریقہ ہوگا کہ' ہمیں گندم کی وجہ سے جنت سے نکلنا پڑا تھا اور دوسری طرف اس امر کی یاد دہانی بھی ہو گی کہ اولاد آدم کو "حوا" کی باتوں میں نہیں آنا چاہئے۔

اور ہماری اس سلسلے کی آخری تجویز یہ ہے کہ میٹ لیس، سویٹ لیس اور ہیٹ لیس ڈیز ہی کی طرح ایک دن "سیٹ لیس ڈے" کے طور پر مخصوص کیا جائے، چنانچہ اس روز دفتروں میں، دکانوں میں، گھروں میں، فیکٹریوں میں اور تعلیمی اداروں میں کوئی کرسی پر نہ بیٹھے، خواہ یہ کرسی کمزور ہو یا مضبوط، کیونکہ اسی کرسی نے ہماری معاشرتی اور سیاسی زندگی میں بہت گل کھلائے ہیں، دفتروں میں اس کی وجہ سے سارے کام چوپٹ پڑے ہیں اور ایوانوں میں بے سکونی اس کی وجہ سے ہے، سو اس روز کرسی کے استعمال پر مکمل پابندی عائد کر دی جائے بلکہ یہ وضاحت بھی ضرورت ہے کہ کرسی سے مراد تمام قسم کی کرسیاں ہیں، چنانچہ یہ نہ ہو کہ کوئی حیلہ جُو اس روز کرسی سے اٹھے اور "تخت" پر جا بیٹھے اور کہے کہ الحمدللہ اس مغربی طرز کی کرسی سے جان چھوٹی اب باقی عمر تخت پر ہی بسر ہو گی۔

ریاض خر دماغ

"بھئی اقبال ٹاؤن چلو گے؟"

"بیٹھو باؤ جی بیٹھو"۔

"بیٹھ تو جائیں گے مگر پہلے پیسے طے کرلیں، تو بہتر ہے۔"۔

"جناب اس کی کیا ضرورت ہے آپ جو دیں گے، لے لوں گا"۔

"چلو ٹھیک ہے، مگر ذرا آہستہ چلانا۔"۔

"بہتر جناب، یہ رفتار ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک تو نہیں ہے۔ مگر گوارہ ہے، خیر، تم یہ بتاؤ تم نے اپنے رکشے کے پیچھے "ریاض خر دماغ" کیوں لکھا ہوا ہے؟"۔

"ریاض میرا نام ہے جی"۔

"اور خر دماغ تمہارا تخلص ہے؟"۔

"نہیں جناب نہیں۔ تخلص تو میں نے "پردیسی" رکھا تھا، مگر یہ شاعر بڑے کمینے اور ذلیل لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے ایک شاعر کو اپنی غزل سنائی تو اس نے کہا کہ شاعری تمہارے بس کا روگ نہیں، یہ "خر دماغ" کا خطاب مجھے میرے محلے کے شاعروں نے دیا تھا۔ ان کا خیال تھا میں اس سے چڑ جاؤں گا۔ لیکن میں نے اسے اپنے رکشے کے پیچھے لکھ لیا ہے۔ جی وہ شعر کیا ہے۔

تندی باد مخالف سے تو کیوں گھبراتا ہے اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھ کو اونچا اڑانے کے لئے

"ہاں ہاں، کچھ اسی قسم کا شعر ہے، مگر تم ذرا آہستہ چلو"۔

"صاحب جی مجھ سے ان شاعروں، ادیبوں کی شکل نہیں دیکھی جاتی، میں اگر چار جماعتیں پڑھا ہوا ہوتا، تو ان کو سیدھا کر دیتا! میں اخباروں میں ان لوگوں کے خلاف لکھتا"۔

"اخباروں میں اور بہت سے لوگ یہی کام کر رہے ہیں، لہٰذا تمہیں مطمئن ہو جانا چاہئے، مگر تم ان لوگوں کے خلاف کیا لکھتے کہ یہ تمہیں دانشور نہیں مانتے، "خر دماغ" کہتے ہیں؟"۔

"نہیں جناب نہیں، خر دماغ ضرور ہوں مگر اتنا بھی نہیں، لکھتے وقت تو میں کوئی اور بات لکھتا مخالفت کی اصل وجہ کا تو لوگوں کو پتہ ہی نہ چلتا۔ وہ آپ نے شعر نہیں سنا ہوا۔

تپش سورج کی ہوتی ہے جلنا دل کو پڑتا ہے
قصور تو آنکھوں کا ہوتا ہے تڑپنا دل کو پڑتا ہے

"بہت اچھے، تم تو خاصے چالاک آدمی ہو، تمہارے دوستوں کو تو واقعی تمہیں دانشور مان لینا چاہئے"۔

"بس صاحب جی، یہ سب تحسین باہمی میں پڑے ہوئے ہیں، ہمیں کون مانتا ہے ہمیں تو یہ ڈنگر سمجھتے ہیں!"۔

"یہ ان کی زیادتی ہے، تم جیسے "بڑبولے" لوگ دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ نیک نیت ہوتے ہیں، ایماندار ہوتے ہیں، میں تو تم جیسے لوگوں کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ میرا ایک دوست بالکل تم جیسا ہے، بہت کڑوی باتیں کرتا ہے، لیکن میرے دل میں اس کے لئے بہت احترام ہے، کیونکہ اس کے بعد اس کا دل آئینے کی طرح صاف ہو جاتا ہے"۔

"جناب! یہ تو آپ کی اپنی نیک دلی ہے، ورنہ سب لوگ کب اس طرح سوچتے ہیں۔ اب آپ نے ذکر چھیڑا ہے تو یقین جانیں میں ملک و قوم کے حالات دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا ہوں، ہماری قوم کے لوگ لالچی ہو گئے ہیں، ان کی نیتیں ٹھیک نہیں رہیں، ہم لوگ حسد بھی بہت کرتے ہیں اور اپنے کسی بھائی کو آگے بڑھتے دیکھ نہیں سکتے سر جی، ہماری قوم کا کیا بنے گا؟"۔

"اللہ بہتر کرے گا ہم سب کو چاہئے کہ ہم اپنی اپنی اصلاح کی کوشش بھی کریں، ان باتوں پر صرف کڑھنے سے کام نہیں چلے گا!"۔

"جی وہ تو ٹھیک ہے، مگر لوگ تو یہاں سیدھی بات کا بھی غلط مطلب لیتے ہیں، میں پچھلے دنوں بیمار ہوا، تو میرا ایک دوست میری خبر لینے آیا، وہ میرے لئے "فُول" بھی لایا تھا۔ جس پر اللہ کی قسم میرا دل بہت خوش ہوا، چنانچہ میں نے فوراً یہ شعر پڑھا۔

فول نے جب فول بھیجا فول کر میں نے کہا
فول کیوں لائے میری جاں فول تو تم خود ہی ہو

مگر صاحب جی وہ مجھ سے ناراض ہو گیا، کہنے لگا تم نے مجھے "فُول" کیوں کہا ہے؟"۔

"وہ تو ٹھیک ہی ناراض ہوا، تمہیں "پھول" کہنا چاہئے تھا"۔

جناب! میں نے فُول ہی تو کہا تھا"۔

"تم پھر "فُول" کہہ رہے ہو"۔

"میں جناب! "فُول" نہیں "فُول" کہہ رہا ہوں فول...... فول!

"چلو چھوڑو، تم یہ بتاؤ پھر کیا ہوا؟"۔

"پھر کیا ہونا تھا میں نے اسے منانے کی بہت کوشش کی مگر اس کا غصہ کم ہی نہ ہوا۔ میں نے تو اسے اپنا یہ شعر بھی سنایا۔

تو بول نہ بول تیرے بولنے کا غم نہیں
تیرا ایک ہی دیدار تیرے بولنے سے کم نہیں

"یار تم تو خاصے مزیدار آدمی ہو' تمہارے دوست تو تم سے خواہ مخواہ بیزار ہیں"۔

"بس جی رونا تو یہی ہے' خلوص کی تو کوئی قدر ہی نہیں رہی لوگوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہیں اور ساتھ ساتھ ان کی جیبیں بھی کترتے رہیں تو وہ خوش رہتے ہیں۔ صاحب جی میرا قصور یہ ہے کہ میں منافق نہیں ہوں!"۔

"اچھا یار تم سے پھر ملاقات ہوگی' کتنے پیسے ہو گئے؟"۔

آپ جی صرف ۲۳ روپے دے دیں"۔

"۲۳ روپے؟ میٹر پر تو ۱۵ روپے بنے ہیں"۔

"آپ کمال کرتے ہیں جناب' آپ کو مجھ سے زیادہ میٹر پر اعتبار ہے۔ آپ آرام سے ۲۳ روپے مجھے دے دیں"۔

"ریاض میاں تم تو دھمکیاں دینے لگے ہو"۔

"بابو میرا نام ریاض میاں نہیں "ریاض خر دماغ" ہے۔ آپ سیدھے ہاتھ سے ۲۳ روپے میری ہتھیلی پر رکھ دیں میں تو آپ کو بہت بھلا آدمی سمجھا تھا' مگر آپ بھی دوسری سواریوں جیسے نکلے' ذرا جلدی کریں میرے پاس فالتو ٹیم نہیں ہے"۔

ڈکار

ہم اور آپ تو کھانا کھاکر زیرلب "الحمد للہ" کہہ لیتے ہیں۔ اگر ہم میں سے کچھ زیرلب بھی نہیں کہتے تو کم از کم دل میں اللہ تعالیٰ کے لئے خیر سگالی کے جذبات ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو سرے سے ان "تکلفات" میں پڑتے ہی نہیں بلکہ وہ کھانا کھا کر اپنے "ڈولوں" کو تھپکی دے لیتے ہیں تاہم ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کا شمار ان احسان ناشناسوں میں نہیں ہوتا جو کھانا کھا کر اپنے ڈولوں کو تھپکی دیتے ہیں یا سرگوشی کے انداز میں الحمد للہ کہتے ہیں بلکہ اس طبقے کے افراد خدا کا شکر ادا کرنے کا حق ادا کر دیتے ہیں اور بعد از طعام اپنی پوری آواز کے ساتھ "الحمد للہ" کہتے ہیں تاہم ان کی آواز کا "والیم" گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ یعنی ان کی "الحمد للہ" کی "کوالٹی" کھانے کی "کوالٹی" سے متعین ہوتی ہے مثال کے طور پر اگر مرغ پلاؤ کھایا ہے تو ان کی "الحمد للہ" سے علاقے کے در و بام ہل گئے ہیں اور یوں وہ خداوند تعالیٰ کے لئے شکریے کے یہ الفاظ براہ راست خداوند تعالیٰ تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر انہیں کھانے میں دال وغیرہ ملے تو ان کا چہرہ کھنچ جاتا ہے اور ہونٹ ہلنے لگتے ہیں۔ ان لمحوں میں پتہ نہیں چلتا کہ وہ خدا کا شکر ادا کر رہے ہیں یا بڑبڑا رہے ہیں!

لیکن ان تین طبقوں کے علاوہ ایک طبقہ اور بھی ہے اور ہمارے نزدیک کھانا کھا کر خدا کا شکر ادا کرنے والے گروہوں میں یہ گروہ صاحب اسلوب واقع ہوا ہے متذکرہ "فرقے" کے لوگ اس ضمن میں زبان یا ہونٹوں سے کام نہیں لیتے بلکہ شکر ادا کرنے کی یہ ذمہ داری اپنے حلق کو سونپ دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک زوردار ڈکار مار کر وہ اپنے اس فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ ہم نے ان لوگوں کو اپنے اس فرض کے سلسلے میں کبھی کوتاہی کرتے نہیں پایا اور نہ ہی کبھی یہ محسوس کیا ہے کہ اس ضمن میں وہ معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہوں بلکہ وہ ڈٹ کر کھاتے ہیں۔ کھل کر ڈکار مارتے ہیں اور محفل سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ با اصول آدمی ہیں اور یہ اس لئے کہ وہ اپنے ڈکار کے راستے میں کسی کو حائل نہیں ہونے دیتے یعنی یہ لوگ کھانے کے بعد کسی سے گفتگو کے دوران اگر بحث میں الجھ جائیں تو ڈکار مار کر حریف کو میدان خالی کر دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ جلوت کی ذمہ داریوں بلکہ خلوت کی نزاکتوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور ڈکار مار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کومیٹ منٹ والے لوگ ہیں۔ تاہم یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی کومیٹ منٹ خدا کا شکر ادا کرنے کے فریضے کے ساتھ ہے یا ڈکار کے ساتھ ہے؟۔

اب اگر ڈکار مارنے والوں ہی کا ذکر چھڑ گیا ہے۔ تو لگے ہاتھوں ایک اور طبقے کا احوال بیان کرتے چلیں گو

اس طبقے کی تعداد زیادہ افراد پر مشتمل نہیں ہے۔ لیکن یہ مٹھی بھر لوگ اپنے نعرہ ہائے مستانہ سے بڑے بڑوں کا منہ پھیر دیتے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جو نہاد منہ ڈکار مارتے ہیں اور پورے محلے کو دہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ اس طرح کے ایک بزرگ ہمارے علاقے میں بھی موجود ہیں جو ہمارے گھر سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ وہ علی الصبح بیدار ہوتے ہیں اور ڈکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ جس کی دھمک ہمارے گھر تک پہنچتی ہے۔ جب سے یہ بزرگ ہمارے علاقے میں آباد ہوئے ہیں۔ محلے والوں کو گھڑیوں کے الارم لگانے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ بزرگ جب کسی سے ملنے جائیں تو دروازے پر لگی گھنٹی نہیں بجاتے' ڈکار مارتے ہیں۔ بچے کو ڈرانا مقصود ہو تو ڈکار مارتے ہیں۔ بچے کی ماں کو دھمکانا ہو تو ڈکار مارتے ہیں۔ اور تو اور کوئی جلسہ الٹانا ہو تو ایک ڈکار سے وہ کام لیتے ہیں جو امن وامان قائم رکھنے والی کسی فورس کے بس کی بھی بات نہیں غرضیکہ اس بزرگ کا ڈکار بہت کثیر المقاصد واقع ہوا ہے۔ ہمیں اگر کوئی پریشانی ہے تو صرف یہ کہ متذکرہ بزرگ ہمارے گھر کے بہت قریب واقع ہوئے ہیں!۔

ممکن ہے ہم اس بزرگ اور ان کی متذکرہ سرگرمیوں کے معاملے میں کچھ مبالغے سے کام لے گئے ہوں' لیکن ان کے نعرہ ہائے مستانہ کی گونج بہر حال اپنی جگہ ایک حقیقت ہے چنانچہ ہم نے اپنی حیرت رفع کرنے کے لیے اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے بات کی اور متذکرہ بزرگ کے محیر العقول ڈکاروں کا ذکر کیا تو دوست نے بتایا کہ یہ ایک بیماری ہے اور پھر اس نے اس کی بہت سی طبی وجوہ بھی گنوائیں لیکن ہمیں ان طبی وجوہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی چنانچہ ہم نے اس دوست سے اپنی اصل الجھن بیان کی اور وہ یہ کہ جو لوگ پیٹ بھر کر کھاتے ہیں اور پھر باآواز بلند ڈکار مارتے ہیں تو اس سے ان کی خاندانی نجابت کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ نہار منہ ڈکار مارنے والے آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ مگر ہمارا یہ دوست اس وقت کج بحثی کے موڈ میں تھا' چنانچہ اس نے ہماری یہ بات سنی ان سنی کر دی اور کہا "پتہ نہیں یار تم کیا باتیں کر رہے ہو' میری سمجھ میں تو آج تک وہ لوگ نہیں آئے جو قوموں کو لوٹ کر کھا جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں مارتے میری مانو تم ان نہار منہ ڈکار مارنے والوں کو غنیمت سمجھو!"۔

۲۴ نومبر ۱۹۸۰ء

چوہدری اللہ وسایا

کھیلوں سے ہمیں زیادہ دلچسپی نہیں چنانچہ ہم ان مقبول زمانہ کھلاڑیوں سے بھی پوری طرح متعارف نہیں جن کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے لیکن ایک اتھلیٹ ایسے بھی ہیں جنہیں صرف ہم یا ان کے حلقے کے کچھ دوسرے لوگ جانتے ہیں سچ پوچھیں تو ان کے نام کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجنا چاہئے کہ وہ جس فیلڈ کے اتھلیٹ ہیں' اس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ یہ ہمارے دوست چودھری اللہ وسایا ہیں یہ کھانے کے اتھلیٹ ہیں۔ ہم نے بہت سی نجی اور اجتماعی دعوتوں میں انہیں فن کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہے اور ہربار دانتوں میں انگلی داب کر رہ گئے ہیں۔ کھاتے وقت ان پر استغراق کا عالم کچھ یوں طاری ہوتا ہے کہ انہیں گردوپیش کی کچھ خبر نہیں ہوتی بالکل اسی طرح جیسے ایک فطری شاعر شعر کہتے وقت ایک خود فراموشی کے عالم میں نظر آتا ہے اور ایک ستار نواز ستار بجاتے ہوئے دنیاو مافیہا سے غافل ہوتا ہے دراصل چودھری اللہ وسایا موت کو ایک اٹل حقیقت سمجھتے ہیں چنانچہ وہ ہر کھانے کو اپنی زندگی کا آخری سمجھ کر کھاتے ہیں۔ چودھری صاحب میں ایک صفت یہ ہے کہ وہ اس زمین پر اگنے والی ہر چیز کو اللہ تبارک وتعالی کی قابل قدر نعمت خیال کرتے ہیں' چنانچہ ان میں سے جو چیز بھی دسترخوان پر آجائے' وہ اس سے منہ نہیں موڑتے کہ ان کا خیال ہے انسانوں کی طرح کھانے پینے والی چیزوں کے بھی جذبات ہوتے ہیں اور ان سے منہ موڑ کر ان کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگانا چاہئے۔ چنانچہ اگر دو من لکڑیاں بھی ابال کر ان کے سامنے رکھ دی جائیں تو وہ نمک چھڑک کر کھا جائیں گے۔

تاہم ہمارے اس بیان سے یہ مفہوم بھی اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ چودھری اللہ وسایا خوش خوراک نہیں' نہیں ایسی کوئی بات نہیں' دراصل معاملہ خوراک کی دستیابی کا ہے چونکہ ان کا موٹو "جیسی مل جائے' جہاں سے مل جائے" ہے' لہٰذا وہ چوزی "   " صرف اسوقت نظر آتے ہیں جب ان کے سامنے چوز کرنے کے لئے کوئی ورائٹی ہو۔ ان کی مرغوب غذا مرغ ہے جسے وہ بزبانِ پنجابی "ککڑ" کہتے ہیں اور یہ لفظ زبان سے ادا کرتے وقت ان کے سارے چہرے پر دانت اگ آتے ہیں۔ ایک محفل خوردونوش میں ان کے ساتھ شریک ہونے کا اعزاز ہمیں بھی حاصل ہوا۔ "یہ اعزاز" کا لفظ ہم نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ جس محفل خوردونوش میں وہ شریک ہوں' اس کے دیگر شرکاء کے حصے میں کھانا نہیں' بس اعزاز ہی آتا ہے۔ اس روز ہم حیران ہوئے کہ لوگوں نے کھانا بھی شروع کر دیا لیکن چودھری اللہ وسایا پوری بے نیازی سے اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو بولے "میں پرہیزی کھانا کھاتا ہوں"۔ تھوڑی دیر بعد بیروں نے یہ پرہیزی کھانا بھی میزوں پر سجانا

شروع کر دیا۔ اور یہ "کگو" تھا جو ابھی "سرد" ہونا باقی تھا اور چودھری صاحب اس راز سے واقف تھے ان کے پرہیزی کھانے کی ایک شق یہ بھی سامنے آئی کہ وہ ایسے مواقع پر شوربے سے پرہیز کرتے ہیں اور صرف بوٹیوں پر گذارا کرتے ہیں سو اس روز ہم نے دیکھا کہ آخری آدمی جوان کے پاس کھڑا تھا وہ بیرا تھا اور وہ پلیٹ کے خالی ہونے کا منتظر تھا۔ چودھری اللہ وسایا برابر میں رکھی ہوئی پلیٹ میں ہڈیاں ڈال رہے تھے ہم نے پلیٹ دیکھی تو چنگیز خان کے لگائے ہوئے کھوپڑیوں کے مینار یاد آ گئے!

چودھری اللہ وسایا صرف کھانے پینے کے حوالے ہی سے قابل ذکر شخصیت نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا روشن پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ہر کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں خصوصاً شادی بیاہ کی تقریب میں شرکت کو وہ ایک انسانی فریضہ سمجھتے ہیں بلکہ اس ضمن میں وہ خاصے ذمے دار واقع ہوئے ہیں لہذا کسی باقاعدہ دعوت نامے کی وصولی کو بھی ضروری نہیں سمجھتے چنانچہ وہ کسی ضروری کام سے بھی جا رہے ہوں اور انہیں رستے میں کوئی بارات نظر آئے تو اپنے اس انسانی فریضے کی تکمیل کی خاطر وہ سب کام چھوڑ دیتے ہیں اور باراتیوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنا شروع کر دیتے ہیں اس ضمن میں ان کا موقف یہ ہے کہ کسی کے غم میں شریک ہونے سے زیادہ اس کی خوشی میں شریک ہونا ظرف کی بات ہے تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ لوگوں کے دکھ میں شریک نہیں ہوتے کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ اگر ساتویں محلے میں بھی کوئی مرگ ہو جائے اور وہ اگر جنازے میں شریک نہ ہو سکے ہوں تو قل اور چہلم میں ضرور شرکت کریں گے خواہ وہ ذرا تاخیر ہی سے پہنچیں یعنی قرآن خوانی کا مرحلہ گزر چکا ہو اور اب مرحوم کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے غرباء و مساکین میں، جو بصورت مہمان وہاں جمع ہوتے ہیں کھانا تقسیم کیا جا رہا ہو اس صورت میں بھی مرحوم کی روح کو سب سے زیادہ ثواب چودھری اللہ وسایا ہی کی وساطت سے پہنچتا ہے۔

چودھری اللہ وسایا لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے علاوہ دیگر امور میں بھی بہت سوشل واقع ہوئے چنانچہ انہیں شعر و شاعری سے گو کوئی شغف نہیں مگر مشاعروں میں بھی شرکت کرتے ہیں اور اس موقع پر سامعین کی بجائے شعراء کی صحبت کو پسند کرتے ہیں۔ تاہم کبھی مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے اٹھ آتے ہیں اور کبھی مشاعرے کے اختتام تک محفل میں موجود رہتے ہیں لیکن اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ منتظمین نے شعراء کے کھانے کا انتظام مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے یا اس کے اختتام پر کیا ہے۔ چودھری اللہ وسایا کسی زمانے میں بڑی باقاعدگی سے بڑے بڑے کلبوں کے عشائیوں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے مگر اب گیٹ پر دعوت ناموں کی چیکنگ بہت سخت ہو گئی ہے۔ موصوف کے متعلق شنید ہے کہ ایک دفعہ کسی ہال میں ریسلنگ کے مقابلوں کے دوران یہ ناظرین کی صفوں میں بیٹھے تھے۔ مختلف النوع مقابلوں کے دوران یہ بیچ بیچ میں دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لیتے اور کہتے "ساڈا آئیٹم نیئں آیا" ان کے ڈیل ڈول اور بے چینی کو دیکھ کر ناظرین بھی بڑی بے چینی سے ان کی باری کا انتظار کرنے لگے لیکن اس دوران تمام مقابلے ختم ہو گئے حتیٰ کہ سٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ اب ناظرین چائے کے لئے برابر والے ہال میں تشریف لے چلیں اس پر موصوف نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے انگڑائی لی اور کہا "ساڈا آئیٹم آگیا جے!"

لیکن اللہ کو جان دینی ہے اور چونکہ اس واقعہ کے ہم عینی شاہد نہیں ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے' وہ یہ ہے کہ چودھری اللہ وسایا جب دسترخوان پر ہوتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کھانوں میں بھگدڑ مچ گئی ہے اور وہ اپنے دفاع میں ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔ گو یہ سارا منظر نظر نہیں آتا لیکن چودھری اللہ وسایا کے دونوں ہاتھ "دشمن" کے تعاقب میں جس طرح ادھر ادھر لپک رہے ہوتے ہیں۔ اس سے ہمارے خدشے کی تصدیق ہوتی ہے۔ موصوف کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ کھانا کھاتے ہوئے پتلون کی بیلٹ ڈھیلی کر لیتے ہیں اور اوپر کے دو بٹن بھی کھول دیتے ہیں۔ تاہم ایک احتیاط وہ یہ برتتے ہیں کہ اس دوران لمبا سانس نہیں لیتے لیکن ایک دفعہ خواتین و حضرات سے بھری محفل میں ان سے یہ بے احتیاطی ہو ہی گئی جس کا مردوں نے بہت برا مانا۔ بہر حال چودھری صاحب کو ایک تشویش جو بہت بری طرح لاحق ہے وہ یہ ہے کہ موصوف اپنے حکیم صاحب کی ہدایت پر عمل نہیں کر پاتے۔ انہیں حکیم صاحب کی ہدایت یہ ہے کہ کھانے کے دوران اگر ڈکار آ جائے تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لینا چاہئے لیکن انہیں ڈکار نہیں آتا اس کے باوجود ایک مرحلے میں انہیں مجبوراً کھانے سے ہاتھ کھینچنا پڑتے ہیں اور یہ مرحلہ وہ ہوتا ہے جب محفل کے اختتام پر بیرا یا میزبان ان کے پاس کھڑا انہیں خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔

ہاں ایک محفل ہمیں ایسی یاد ہے جس میں آخر تک ایک شخص ان کے ساتھ شانے سے شانہ ملائے کھڑا رہا اور کھانے کے اس مقابلے میں وہ انہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا رہا۔ بالاخر چودھری اللہ وسایا نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے اور اس وقت ان کے چہرے پر وہی تشویش تھی جو حکیم صاحب کی ہدایت پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے انہیں لاحق رہتی ہے جب کہ ان کے برابر میں جو صاحب کھڑے تھے بلکہ ڈٹے تھے' وہ خاصے بزرگ تھے اور کھانے کے دوران مسلسل ڈکار رہے تھے۔ تاہم ان کے چہرے پر تشویش کی بجائے شانتی ہی شانتی تھی۔ کیونکہ ان کے حکیم صاحب نے انہیں غالباً یہ بتایا تھا کہ ڈکار کا مطلب یہ ہے کہ پہلا کھانا ہضم ہو گیا ہے اس روز چودھری اللہ وسایا نے ہمارے ساتھ ایک جگہ جانا تھا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد جب ہم نے انہیں چلنے کو کہا تو انہوں نے اس بزرگ کے کاندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا اور "اباجی اب چلیں' قاسمی صاحب کو دیر ہو رہی ہے"!

اختر ممونکا

میں نے آج ہی اخبار میں بچوں کے صفحے پر ایک لطیفہ پڑھا ہے اور وہ لطیفہ کچھ یوں ہے کہ ایک آدمی زمین پر سیدھا لیٹا ہوا گانا گا رہا تھا' ایک اور آدمی اس کے پاس سے گزرا۔ جب وہ آدمی پھر سے واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ وہی آدمی الٹا لیٹا گانا گا رہا ہے۔ اس نے پوچھا "کیوں میاں' پہلے تو تم سیدھا لیٹ کر گا رہے تھے اور اب الٹے لیٹ کر گا رہے ہو" وہ آدمی بولا "بھائی یہ کیسٹ کی دوسری طرف ہے"

تھوڑی دیر بعد پہلے جب میں اختر ممونکا کے سفرنامے "پیرس ۲۰۵ کلومیٹر کے مطالعے سے فارغ ہوا اور اس پر کچھ لکھنے کے لئے کاغذ قلم ہاتھ میں پکڑا تو اس سفرنامے کے حوالے سے جو بات سب سے پہلے میری سمجھ میں آئی وہ اسی لطیفے کی صورت میں تھی جو میں نے ابھی ابھی آپ کو سنایا ہے۔ دراصل یوسف کمبل پوش سے محمود نظامی تک اور محمود نظامی سے افضل حسین علوی تک جتنے سفرنامے بھی لکھے گئے ہیں۔ اختر ممونکا کا سفرنامہ ان سب سے مختلف ہے۔ آپ اسے کیسٹ کی دوسری طرف کہہ لیں کیسٹ کی دوسری طرف جو گانے ہوتے ہیں ان میں موسیقی' جذبے' بول اور فضا کیسٹ کی پہلی طرف کے گانوں سے مماثلت بھی رکھتی ہے اور مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ اختر ممونکا کا سفرنامہ بھی اپنے جدید پیشروؤں کے سفرنامے سے بیک وقت مختلف بھی ہے اور مماثلت بھی رکھتا ہے۔ تاہم اس کا اختلافی پہلو بہت "سڑانگ" ہے اور وہ اختلافی پہلو یہ ہے کہ یہ سفرنامہ سفر کی تمام صعوبتوں اور راحتوں کے مراحل طے کرنے کے بعد لکھا گیا ہے۔ اختر ممونکا گھر سے ۱۴۱ ڈالر یعنی قریباً چار سو روپے جیب میں ڈال کر نکلا تھا اور ان چار سو روپوں میں اس نے ۲۵ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا اور ۱۸ دیسوں کی سیاحت کی۔ سو میں نے اگرچہ بہت سے سفرنامے پڑھے ہیں مگر اختر ممونکا کا سفرنامہ پڑھ کر مجھے لگا کہ وہ سفر پر نہیں ایڈونچر پر نکلا تھا۔ اس ایڈونچر کے دوران اس نے کیسے کیسے موذیوں سے لفٹ لی۔ راتیں کس کسمپرسی کے عالم میں بسر کیں۔ ان چیزوں کا یہ بیان آپ کو اردو کے کسی سفرنامے میں نہیں ملے گا۔ میرے خیال میں اختر ممونکا سیاحت نگاروں کی موجودہ صف میں کھرا اور سچا سیاح ہے۔ کیونکہ سفر کی یہ صعوبتیں اسے سفر سے روکتی نہیں' بلکہ مزید سفر پر اکساتی ہیں۔

اختر ممونکا کے اس سفرنامے کا دوسرا "اختلافی" پہلو یہ ہے کہ اس میں حسیناؤں کا بیان تو بہت ہے۔ اختر ممونکا ان کا ذکر بہت چسکے لے لے کر کرتا ہے حتیٰ کہ اس کی باقاعدہ رال ٹپکنے لگتی ہے۔ چنانچہ مجھے لگتا ہے کہ اس نے یہ سفرنامہ گلے میں "ببّ" باندھ کر لکھا ہے۔ مگر اس کے باوجود ۲۵ ہزار کلومیٹر کی مسافت اور ۱۸ دیسوں کی

سیاحت کے دوران کوئی بیبی اس پر عاشق نہیں ہوئی جس سے ہم سیاحت نگاروں کی نیک نامی پر بہت حرف آیا ہے۔ یہ باہمی خیر سگالی کے فروغ کے لئے جگہ جگہ مذاکرات کرتا نظر آتا ہے۔ مگر مشترکہ اعلامیہ جاری کرنے کی نوبت پانچ سو صفحے کی اس کتاب میں صرف چار پانچ مقامات ہی پر آتی ہے۔ ایک سوئٹزر لینڈ میں مگر یہ سوئس خاتون بھی جس کا نام ”الزبتھ“ ہے اپنی سیاحت کے دوران پاکستان میں اختر ممو نکا سے متعارف ہوئی تھی اور یہاں اختر ممو نکا نے پورے ایک سال تک اس کی میزبانی کے فرائض انجام دیئے تھے۔ سو یہ لین دین خالص کاروباری اصولوں کے مطابق ہے۔ لہٰذا اختر ممو نکا نے یہاں بھی خود کو ہیرو اسٹیبلش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دوسری بی بی ایک پاکستانی رقاصہ ہے، جو فرانس میں ضیاءالدین کے طائفے کے ساتھ آئی تھی۔ یہ عفیفہ بھی ایک نظر میں گھائل نہیں ہوئی۔ بلکہ اختر ممو نکا کے ساتھ اس کی پاکستان میں قیام کے زمانے سے شناسائی تھی۔ تیسری ایک حبشن مسلمان ہے، جو فرانس کے ایک ریستوران میں ویٹرس ہے اور وہ بھی اسلامی بھائی چارے کے تحت ہمارے اس سیاح کی حسب توفیق دلجوئی کرتی ہے اور چوتھی ایک خانہ بدوش لڑکی ہے جس سے ملنے کے بعد اختر ممو نکا کو ”وحدت الوجود“ کا فلسفہ سمجھ میں آتا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

اس سفرنامے کا ایک ”اختلافی“ پہلو اس میں داستان گوئی کی عدم موجودگی ہے۔ اختر ممو نکا کے ساتھ اس سیاحت میں، جو واقعہ پیش آیا۔ اس نے اسی طرح بیان کر دیا اپنی طرف سے نمک مرچ نہیں لگایا حالانکہ اس میں کئی واقعات ایسے ہیں جنہیں پھیلا کر کئی داستانوی ابواب لکھے جاسکتے تھے۔ مگر اختر ممو نکا نے اس تھوڑے لکھے کو ”بوتا“ سمجھا' البتہ اس داستان طرازی کی کمی اختر ممو نکا نے اپنی بے پناہ حسِ ظرافت سے پوری کی ہے ”پیرس۔ ۲۰۵ کلومیٹر“ میں کئی مقام ایسے آتے ہیں کہ قاری اپنے قہقہوں پر قابو نہیں پاسکتا۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے کردار ایسے ہیں، جو حافظے میں محفوظ رہ جاتے ہیں ان میں سب سے موثر کردار ایک پاکستانی فراڈ مرتضیٰ فتنے کا ہے جو پشاور سے کابل کی سرحد عبور کرنے والے پاکستانی سیاحوں اور مسافروں کو مشورہ دیتا ہے کہ دو دو کاٹن کے۔ ٹو سگریٹ کے ساتھ رکھ لو کابل میں ان کی بہت مانگ ہے سفر کا خرچ نکل آئے گا چنانچہ سب مسافر اس کے مشورے پر عمل کرتے ہیں مگر کابل پہنچ کر جب وہ لوگ سگریٹ فروخت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کوئی دکاندار ان کی اصل قیمت بھی ادا کرنے پر تیار نہیں ہوتا جس پر مرتضیٰ فتنہ آدھی قیمت پر یہ سارے سگریٹ خرید لیتا ہے اور اختر ممو نکا کو راز داری سے بتاتا ہے کہ وہ کے ٹو کے علاوہ کوئی سگریٹ پی ہی نہیں سکتا اور چونکہ وہ اکیلا کے ٹو کا اتنا ذخیرہ اپنے ہمراہ نہیں لے جاسکتا تھا لہٰذا اسے یہ سارا کھیل رچانا پڑا اختر ممو نکا کے اس سفرنامے کا دوسرے سفرناموں سے ایک ”اختلاف“ یہ ہے کہ ہم سیاحت نگار جس ملک میں بھی جائیں بڑی رواں انگریزی میں وہاں کے مکینوں سے گفتگو کرتے ہیں اور ہمیں کہیں بھی ”لینگویج پرابلم“ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ حالانکہ دو ایک ملکوں کو چھوڑ کر یہ پرابلم ہر جگہ موجود ہوتا ہے کیونکہ تمام قوموں کے لوگ اپنی قومی زبان میں ہی گفتگو کرتے ہیں وہ لوگ انگریزی سے واقف نہیں ہیں اور اگر کچھ واقف ہیں بھی تو وہ اس راز کو راز ہی رہنے دیتے ہیں اختر ممو نکا نے دوسرے سیاحت نگاروں کے برعکس' ایسے مقامات پر فصاحت و بلاغت کے دریا نہیں

بہائے۔ بلکہ وہ یہاں گونگا بن گیا ہے اور چونکہ یہ "مقاماتِ آہ و فغاں" قریباً ہر ملک میں پیش آتے ہیں۔ اس لئے اختر ممونکا پانچ سو صفحات کی اس کتاب میں صرف چند مقامات پر بولا ہے۔ جس سے اس کے ہاں حقیقت کا رنگ زیادہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ چنانچہ اگر اسے سیاحت نگاروں کا "گونگا پہلوان" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اور خواتین و حضرات! مجھے اس کتاب کے بارے میں ابھی بہت سی باتیں کرنا تھیں' مثلاً یہ کہ اختر ممونکا اس کتاب میں مجھے "اسلام پسند" بھی نظر آتا ہے اور "خواتین پسند" بھی چنانچہ وہ صرف انہی دو حوالوں پر جذباتی ہوتا ہے۔ سوان دونوں میں سے کسی کا بیان شروع ہو جائے' اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے' بالکل میرے اس دوست کی طرح جو امریکہ میں قیام کے دوران ایک روز آدھی رات کو میرے فلیٹ پر آیا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت تھا اور اس کی بغل میں ایک "پٹی کیٹ" تھی میرے دروازہ کھولنے پر اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا "یار! بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے۔ سارا شہر چھان مارا ہے' مگر ذبیحہ گوشت کہیں سے نہیں ملا' تمہیں کسی ایسی دکان کا پتہ ہے تو میرے ساتھ چلو" اور ایک بات یہ کہ اختر ممونکا اپنی اس سیاحت کے دوران رتبہ' منصب' ذات' مقام سب کچھ بھول کر سفر کرتا ہے اور سیاح اور مسافر میں یہی ایک امتیازی فرق ہے یہ دراصل ایک فقیرے سیاح کا سیاحت نامہ ہے۔ جو

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

کی مجسم تصویر بنا' ٹرکوں' ٹریلروں' کاروں اور گدھوں تک پر لفٹ لے کر سفر کرتا ہے اور فٹ پاتھوں' سٹیشن کی سیڑھوں' کاروں کے ڈھانچوں اور خشک برساتی نالوں تک میں سلیپنگ بیگ بچھا کر شب بسری کرتا ہے۔ ایک بندرگاہ کے قریب کسی پل کے نیچے شب بسری کے دوران ادھر سے گزرنے والے نشے میں دھت ملاح اسے لڑکی سمجھ کر بار بار جگاتے ہیں اور جب وہ سلیپنگ بیگ کی زپ کھول کر اپنا منہ باہر نکالتا ہے تو وہ اسے گالیاں دیتے آگے نکل جاتے ہیں۔ البتہ ایک ملاح تو اس کی رونمائی کے باوجود اس سے سودے بازی کی کوشش کرتا ہے اور اس بار اختر ممونکا اسے گالیاں دیتا ہے۔ تاہم یہ اس کا اپنا بیان ہے۔

۲۱ دسمبر ۱۹۸۳ء

داستان سرائے میں

ادیبوں میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی "جوڑی" ایسی ہے جنہیں دیکھ کر یہ خیال 'خیالِ خام لگنے لگتا ہے کہ اگر عورت اور مرد دونوں ادیب ہوں تو انہیں آپس میں شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ بس علمی مباحثوں پر گذارا کر لینا چاہیئے کیونکہ یہ میاں بیوی ایسے ہیں جنہیں خوش و خرم دیکھ کر الٹا شہ ملتی ہے کہ ایک لکھنے والا ایک لکھنے والی ہی سے شادی کرے گذشتہ دنوں ادیبوں کی اس مشہور جوڑی نے ہاجرہ مسرور کے اعزاز میں ایک تقریب اپنے گھر "داستان سرائے" میں منعقد کی اور اس تقریب کے "مندرجات" سے یہ بات سامنے آئی کہ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ صرف خود ہی خوش و خرم زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ وہ دوسروں کو بھی خوش و خرم دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ یہاں انہوں نے چشم زدن میں اچھے خاصے ثقہ ادیبوں کو ایک کھلنڈرے بچے کے روپ میں سامنے لا کھڑا کیا!

دراصل ہوا یوں کہ جب مہمانوں نے چائے وغیرہ سے فراغت حاصل کی اور رواج کے مطابق وہ میزبانوں سے اجازت حاصل کر کے رخت سفر باندھنے لگے تو بانو قدسیہ لان میں دائرے کی صورت بچھی ہوئی کرسیوں کے درمیان میں آن کھڑی ہوئیں اور کہا کہ خواتین و حضرات آج کی ملن پارٹی کا اختتام نہیں ہوا بلکہ آغاز ہوا ہے۔ ابھی آپ کے ہاتھوں میں ایک تکیہ آئے گا' آپ اسے ایک دوسرے کی طرف اچھالتے جائیں۔ اس دوران میوزک بجتا رہے گا میوزک تھمنے پر یہ تکیہ جس کے ہاتھ میں ہو گا اسے لائن سے باہر کھڑا ہونا ہو گا۔ سو ہوا یوں کہ ادیبوں نے اپنی اپنی نشستیں سنبھالیں اور تکئے کو افراتفری کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف اچھالنے لگے مگر وہ جو کسی نے کہا کہ

جن پہ تکیہ تھا وہی تکئے ہوا دینے لگے

سو جو ادیب تھے' وہ کچھ دیر بعد ایک ایک کر کے لائن کے باہر نظر آئے اور وہ جو اپنے اظہر جاوید ہیں وہ اس معرکے میں سرخرو ٹھہرے!

دوسری بار بانو قدسیہ نے مہمانوں کو "بریف" کرتے ہوئے کہا کہ ابھی ایک بسورتی ہوئی بلی ان کے پاس آئے گی آپ اسے پیار کریں اور چپ کرانے کی کوشش کریں مگر اس کوشش کے دوران چہرے پر مسکراہٹ نہیں آنی چاہیئے۔ بصورت دیگر آپ کو لائن سے باہر کھڑا ہونا پڑے گا۔ اور پھر مہمانوں نے دیکھا کہ بلی کی بجائے ایک "بلا" ان کے پاس آیا اور یہ بلا منہ بسورتا ہوا ہی نہیں تھا بلکہ خاصا ستم ظریف تھا۔ یہ دراصل خالد احمد تھے

اور موصوف ایک مخصوص بیت گذرائی کے ساتھ جس ادیب کے پاس گئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی اور یوں انہوں نے دیکھتے دیکھتے سب کو "لائن حاضر" کر دیا۔

لیکن اس ہنستی مسکراتی تقریب کا سب سے دلچسپ "آئیٹم" وہ تھا جس کے مطابق کوئی ایک ادیب کسی دوسرے ادیب کو مخاطب کر کے کسی شہر کا نام لیتا تھا اور پھر مخاطب کو اس شہر کے پہلے لفظ سے شروع ہونے والے چار فقرے بولنے پڑتے تھے۔ یہاں ہم نے بڑے بڑے جغادری ادیبوں کی گھگی بندھتی دیکھی' وہ جو ایک نشست میں صفحوں کے صفحے لکھتے چلے جاتے ہیں یہاں انہیں ایک فقرہ بولنا بھی جان جوکھوں کا کام لگتا تھا۔ تاہم بعض باتیں یہاں بہت دلچسپ ہوئیں مثلاً صلاح الدین محمود نے احمد ندیم قاسمی کو مخاطب کر کے کہا "قاسمی صاحب میں علی گڑھ گیا۔ قاسمی صاحب نے جواب میں "علی' علی' علی!" کا نعرہ مستانہ بلند کیا اور میدان مار لیا۔ انتظار حسین نے منیر نیازی سے کہا "منیر نیازی میں "ٹمبکٹو" گیا منیر نیازی نے کہا ٹمبکٹو میں میں نے ٹوٹ بٹوٹ کو ام الخبائث کی چسکیاں لیتے دیکھا!" پھر منیر نیازی نے محمد خالد اختر کو مخاطب کیا اور کہا کہ محمد خالد اختر میں خانپور گیا! محمد خالد اختر نے کہا "خانپور کے خان بڑے خونخوار ہوتے ہیں!" سائرہ ہاشمی نے انتظار حسین سے کہا "انتظار صاحب! میں لاہور گئی" انتظار حسین نے کہا "لاحول ولا قوۃ الا باللہ!" ذوالفقار احمد تابش نے کشور ناہید کو مخاطب کیا اور کہا "کشور! میں کمالیہ گیا" کشور نے کہا "کمالیہ میں کتے بہت تھے جو کائیں کائیں کرتے تھے وہاں کامران بھی تھا"

بس تک کوملاتی تقریب کے آخر میں امجد اسلام امجد نے صاحب خانہ کو یہ تجویز پیش کی کہ جس ادیب نے جس شہر کا نام لیا ہے اسے کچھ عرصے کے لئے وہاں بھیج دیا جائے اس پر خالد احمد نے کہا "بالکل ٹھیک ہے یہ ٹمبکٹو کون گیا تھا؟"

حُور جنّت میں کانپ جاتی ہے

جن لوگوں کو صدر ضیا سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ صدر ضیا سے ملاقات کے کیا معنی ہیں؟ آپ یقین جانیں کہ ایک دفعہ تو بندہ "پیروں" نکل جاتا ہے' صدر کچھ اس تپاک سے ملتے ہیں کہ۔

کچھ اس ادا سے آپ نے پوچھا ہمرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا

والی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ ملنے والے کو یقین ہی نہیں آتا کہ اس کی ملاقات صدر مملکت سے ہو رہی ہے صدر کی طبیعت میں جو انکسار ہے' وہ اس قدر فطری ہے کہ ملاقاتی کسی موقع پر بھی "ان ایزی" محسوس نہیں کرتا' چنانچہ وہ ذاتی احوال کے بیان کے ساتھ ساتھ قومی اور بین الاقوامی مسئلوں پر بھی رائے دینا شروع کر دیتا ہے اور صدر مملکت اس کی یہ گفتگو بھی کچھ اس توجہ سے سنتے ہیں جیسے اس ماہر کو اسی کام کے لئے بلایا ہو' چنانچہ ملاقاتی جب ایوان صدر سے باہر نکلتا ہے تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے ہوتے وہ اس وقت ہما شما سے ہاتھ ملانا بھی پسند نہیں کرتا اور پھر اس انتظار میں رہتا ہے کہ

افغانستان کے مسئلے کو ملاقاتی کے مشوروں کی روشنی میں کب ہینڈل کیا جاتا ہے' ریگن اور گورباچوف وغیرہ کی گوشمالی ملاقاتی کے مشورے کے مطابق کب ہوتی ہے' لیکن۔

وہی ہوتا ہے جو "منظور ضیا" ہوتا ہے

چنانچہ ملاقاتی بقیہ عمر ساحر لدھیانوی کا یہ قطعہ گنگناتے گزار دیتا ہے۔

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محو یاس رہتا ہوں
تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

سو صورت حال یہ ہے کہ اس وقت الف لیلہ کے بہت سے ابوالحسن ملک میں مارے مارے پھر رہے ہیں جنہیں بادشاہ وقت سوتے میں جھونپڑی سے اٹھا کر محل میں پہنچا دیتا ہے۔ اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو محل میں پاتا ہے جہاں اس کی ہر بات مانی جا رہی ہے مگر رات کو خواب گاہ سے دوبارہ اسے جھونپڑی میں بھیج دیا جاتا ہے

اور وہ صبح آنکھیں مل مل کر باندیوں اور کنیزوں کو ڈھونڈتا ہے حالانکہ ۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

یہ ساری تفصیل ہم نے اس لئے بیان کی ہے کہ خود ہمیں بھی صدر صاحب سے شرف ملاقات حاصل ہوا ہے اور وہ ہر دفعہ کچھ اس طرح ملے کہ دل موہ لیا بلکہ ہماری عدم موجودگی میں انہوں نے تین دفعہ اپنی پبلک سٹیٹمنٹ میں ہمارے کالم کا ذکر کیا جسے ذِکر خیر ہی کہا جا سکتا ہے' فیصل آباد میں ٹیلی ویژن بوسٹر کا افتتاح کرتے ہوئے انہوں نے ہمارے کالم کی رینج کا مقابلہ ٹیلی ویژن سے کیا تو یقین جانیں ۔

اسد خوشی سے مِرے ہاتھ پاؤ ں پھول گئے

والی کیفیت پیدا ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی سفارشیوں کی لائن بھی لگ گئی اور سفارشی بھی ایسے خوش فہم کہ شروع یہاں سے ہوتے تھے کہ ذرا ضیا کو فون تو کرو' ہم انہیں بتاتے کہ ضیا صاحب کے ہاں فون نہیں ہے' یہ تو ہمیں بعد میں پتہ چلتا کہ وہ ہمارے حیدر آباد میں مقیم برادر بزرگ کا نہیں بلکہ صدر ضیا کا ذکر کر رہے تھے' سو ہم نے پے در پے ایسے کالم لکھے کہ ان سفارشیوں سے پیچھا چھوٹ گیا ۔

یہ جو ہم درمیان میں اپناذکر لے آئے تو دراصل یہ "تشبیب" کے بعد "گریز" تھا کیونکہ ذکر ہم نے ان تمام لوگوں کا کرنا ہے جن کا کہنا ہے کہ انہیں صدر ضیا کی سمجھ نہیں آتی مثلاً سیاست دانوں کو بھی یہی گلہ ہے حالانکہ انہیں یہ گلہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اگر صدر اتنی آسانی سے سمجھ آسکتے تو یار لوگ انہیں جنرل کے عہدے سے آگے نہ بڑھنے دیتے۔ انہیں تو ذوالفقار علی بھٹو جیسا زیرک سیاست دان بھی نہیں سمجھ سکا بلکہ ان کے بیٹی بند بھائی بھی انہیں نہ سمجھ سکے یقین نہ آئے تو جنرل چشتی سے لے کر جنرل فضل حق تک سے پوچھ لیں' ویسے صدر ضیا کو بھی گلہ ہے کہ انہیں ان سیاست دانوں کی سمجھ نہیں آتی' خود ہی "پہلے احتساب' پھر انتخاب" کا نعرہ لگایا اور خود ہی انہیں مورد الزام بھی ٹھہرایا' مارشل لا کا خیر مقدم بھی کیا اور بعد میں سارے ان کے خلاف محاذ بنا کر بھی بیٹھ گئے۔ جہاں صدر ضیا کو سیاست دانوں اور سیاست دانوں کو صدر ضیا سے گلے ہیں' وہاں علما بھی صدر ضیا کے سلسلے میں بہت پریشان ہیں' انہیں پریشانی یہ ہے کہ ایک طرف صدر رمضان المبارک کا مہینہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بسر کرتے ہیں اور ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں ملکہ ترنم کا گانا بہت پسند ہے جبکہ ہمارے نزدیک "خدا کا گھر" اور "خدا کی شان" بیک وقت نہ سہی باری باری تو دیکھی جا سکتی ہے۔

صدر ضیا کو نہ سمجھ سکنے کا اقرار کرنے والے وہ محب الوطن طبقے بھی ہیں جو کسی سیاسی جماعت سے باقاعدہ وابستہ نہیں' وہ کہتے ہیں کہ جی ایم سید اور غفار خاں کو حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ صدر صاحب نے دیا فیلڈ مارشل ایوب خان مرحوم کی یادگار اسلام آباد میں تعمیر کرنے کے منصوبے بناتے رہے۔ یحیٰی خاں کو پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ دفنایا گیا دہلی اور ماسکو کے منظور نظر ولی خاں' ممتاز بھٹو' حفیظ پیرزادہ کو ملکی سالمیت کے خلاف کام کرنے کی کھلی چھٹی انہوں نے دی لیکن دوسری طرف دہلی اور ماسکو کو بھی صدر ضیا کی سمجھ نہیں آتی اور ان کی حکومت کے خلاف تند و تیز بیانات دینے میں لگے رہتے ہیں۔ امریکہ غالباً ایسا ملک ہے جو صدر ضیا کو صحیح سمجھتا ہے۔

اور صدر ضیا اسے صحیح سمجھتے ہیں' تاہم ہمارے نزدیک یہ صورت بھی زیادہ دیر نہیں رہ سکتی' جلد یا بدیر دونوں کو ایک دوسرے سے یہ شکایت پیدا ہوگی یا یوں سمجھیں کہ منظر عام پر آ جائے گی کہ وہ ایک دوسرے کی سمجھ میں نہیں آ رہے۔

یہاں تک پہنچ کر ہمیں یہ خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں ہمارا یہ کالم لوگوں کی سمجھ ہی میں نہ آئے لہٰذا ہمارے خیال میں گول مول باتوں کی بجائے صاف صاف بات کرنا چاہئے' کیونکہ ہمارے ہاں صدر ضیا کے حوالے سے گومگو کی کیفیت میں مبتلا لوگ کم ہیں ان کے مقابلے میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو واضح طور پر دو الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں' ان میں سے ایک گروہ کو صدر ضیا کی ذات میں ایک بھی خوبی نظر نہیں آتی اور دوسرے گروہ کو صدر کی ذات میں ایک خامی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ چنانچہ یہ دونوں گروہ صدر کے بارے میں کوئی "درمیانی رائے" سننے کو تیار نظر نہیں آتے جو لوگ صدر ضیا کی ذات کو خوبیوں سے خالی سمجھتے ہیں' وہ ان کی ہربات کو مورد تنقید بناتے ہیں' بالکل اس سردار جی کی طرح جس نے پطرس بخاری کو ٹرین سے اترتے دیکھ کر کہا "لو' اب ٹرین سے اتر رہے ہیں" پطرس اس تبصرے پر گھبرائے اور تیز تیز چلنا شروع کر دیا" سردار جی نے کہا "لو' اب تیز تیز چل رہے ہیں!" پطرس ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور اخبار پڑھنے لگے۔ سردار جی نے کہا "لو' اب اخبار پڑھ رہے ہیں!" پطرس نے چائے منگوا کر پینا شروع کی سردار جی نے کہا "لو' اب چائے پی رہے ہیں!" "اس پر پطرس کا پارہ چڑھ گیا اور غصے سے کہا "سردار جی بات کیا ہے؟" "اس پر سردار جی نے اسی طنزیہ لہجے میں کہا "لو' اب پوچھ رہے ہیں بات کیا ہے؟" بس یہی حال صدر ضیا کے مخالفین کا ہے' وہ ان پر بلاوجہ بھی معترض ہوتے ہیں' حالانکہ صدر ضیا کی ذاتی خوبیوں کے علاوہ ان کی حکومت کی خارجہ پالیسی کے بہت سے رنگ بھی قابل داد ہیں نیز انہوں نے اپنے اقتدار کے تمام عرصے میں آزادئ تحریک خواہ نہ دی 'مگر آزادئ تحریر ضرور دی ہے اسی طرح صدر ضیا کے حامی بھی ایک دوسری انتہا پر ہیں' وہ صدر ضیا کے چھینکنے پر بھی داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے لگتے ہیں' حالانکہ صدر نے بہت سے کام ایسے کئے ہیں جو نہ کرنے کی صورت میں بہتری کے زیادہ پہلو سامنے آ سکتے تھے جن میں سے سرفہرست مارشل لا کو نوے دنوں سے ۸ سال سے زائد طول دینا ہے' سو ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو صدر کے کسی غلط اقدام میں سے بھی خیر کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش کریں اور نہ ان لوگوں میں سے ہیں جو صدر کے کسی صحیح کام کو بھی غلط نمبر کی عینک سے دیکھیں البتہ ہم صدر کو اب مکمل باور دی سیاست دان سمجھتے ہیں اور یوں ان کے کسی بھی کام کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے قبل ایک ہزار مرتبہ سوچنا ضروری سمجھتے ہیں' چنانچہ ہم صدر کو سجدہ ریز بھی دیکھیں تو فوراً کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے بلکہ اس سے پہلے یہ شعر ہمارے ذہن میں کلبلانے لگتا ہے۔

شیخ مسجد میں سر جھکاتا ہے
حور جنت میں کانپ جاتی ہے

امریکہ کی غلامی

وزیر اعظم جونیجو ترکی اور مغربی جرمنی کے دورے کے بعد ان دنوں امریکہ کے دورے پر ہیں، ہم نے انہیں ٹیلی ویژن پر امریکہ کے صدر ریگن سے گفت و شنید کرتے اور ملتے ملاتے دیکھا اور ان لمحوں میں ہمارا دل گہری اداسی کی زد میں آ گیا۔ یہ اداسی اس قوم کے فرد کی تھی جس قوم کو دنیا کی امامت کرنا تھی، لیکن جو ایک فاسق و فاجر طاقت کی مقتدی بنی ہوئی ہے۔ ہم نے اس کالم میں جو کہنا ہے، وہ ہم اس وضاحت کے بعد کہیں گے کہ یہ کالم وزیر اعظم جونیجو کی ذات کے حوالے سے نہیں بلکہ یہ اس بے بسی کا نوحہ ہے جس کی زد میں پاکستان سمیت تمام کمزور قومیں ہیں، خدا جانے یہ ہم جیسے لوگوں کی مجبوری ہے کہ جو لوگ اسرائیل کے دست و بازو ہیں اور عالم اسلام کے دشمن نمبر ایک ہیں، ہم ان سے معانقہ کریں اور اپنی ساری نفرتیں ڈپلومیٹک مسکراہٹوں میں دفن کر دیں......
اور یا یہ پالیسی کمزور اقوام کے مفاد میں ہے کہ جب تک اپنے پاؤں پر کھڑی نہ ہو جائیں، اس وقت تک وہ کبڑے عاشق کا کردار ادا کرتی رہیں! وجہ جو کچھ بھی ہو، دل اس صورتحال پر روتا ہے اور جو آنسو آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے ہیں، انہیں پونچھنے والا کوئی نہیں، یہ آنکھوں سے گرتے ہیں اور زمین کا رزق بن جاتے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر جونیجو ریگن ملاقات میں کہیں یہ تاثر نہیں ابھرتا کہ دنیا کی ایک سپر پاور کا صدر ایک حاجت مند ملک کے وزیر اعظم سے مل رہا ہے بلکہ یہی احساس ہوتا ہے کہ دو ملکوں کے سربراہ، برابری کی سطح پر ایک دوسرے سے مل رہے ہیں، بلکہ صدر ریگن کی اضافی خوش اخلاقی اور پروٹوکول کے تمام تر تقاضے پورے ہوتے دیکھ کر عام آدمی یہی سمجھتا ہے امریکہ اور پاکستان دو لنگوٹئے دوست ہیں اور ان کے تعلقات کسی سیاسی یا معاشی اونچ نیچ سے بالکل ماورا ہیں۔ وزیر اعظم جونیجو بھی یہی تاثر دیتے نظر آتے ہیں کہ وہ ایک آزاد اور خود مختار قوم کے وزیر اعظم ہیں اور یوں وہ امریکہ کی بالادستی سے قطعاً مرعوب نہیں ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ صورتحال، حقیقت حال پر مبنی ہے؟ حقیقت حال تو یہ ہے کہ امریکہ شروع سے ہمارا "ان داتا" ہے پہلے وہ ہماری ضروریات میں اضافہ کرتا ہے، پھر یہ ضروریات پوری کرتا ہے، اور پھر ہم سے وہ باتیں منواتا ہے جو وہ منوانا چاہتا ہے۔ ہمیں مارشل لاء بھی پاکستانی عوام سے زیادہ امریکہ کو مطمئن کرنے کے لئے اٹھانا پڑتا ہے۔ پورے عالم اسلام کی بقا اور انا کی جنگ لڑنے والے افغان مجاہدین پر دست شفقت رکھنے میں بھی امریکہ کی خوشنودی شامل ہے کہ کہیں روس اس علاقے میں نہ آ جائے۔ ہر آنے والی حکومت امریکہ سے این او سی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور ہر جانے والی حکومت کے زوال کا ایک باعث اس این او سی کی واپسی بھی ہوتی ہے۔ ہماری تمام حکومتیں یہ ذلتیں برداشت کر

رہی ہیں، جس میں پورے عالم اسلام کے خلاف امریکہ کی توہین آمیز پالیسیوں کی ذلت بھی شامل ہے۔ فلسطینی مسلمانوں کا قاتل امریکہ ہے اور مسجد اقصیٰ کو آگ لگانے والوں کا پشت پناہ بھی امریکہ ہے، لیکن ہم میں اتنی سکت نہیں کہ اس کی دوستی کے منافقانہ ہاتھ کو جھٹک دیں۔ شاید سیاست میں اس طرح ممکن بھی نہیں، کیونکہ عالم اسلام کے بعض انقلابی اور امریکہ دشمن رہنما روس کی دوستی میں اسی قسم کی ذلتوں کا شکار ہوتے ہیں اور اس کی تمام ظالمانہ کارروائیوں پر اوتھ کمشنر کی طرح مہر تصدیق ثبت کرتے چلے جاتے ہیں! یعنی ہم لوگ دو ظالموں میں سے ایک ظالم کا ساتھ دینے کے جبر میں مبتلا ہیں!

تو پھر سوال یہ ہے کہ اس صورتحال کا حل کیا ہے؟ حل تو شاید اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے ملک کے دس کروڑ لوگوں کے دلوں میں وطن کے لئے اتنی شدید محبت کے جذبات پیدا کر دیں کہ وہ بڑے سے بڑے ظالم کی بالادستی قبول کرنے سے انکار کر دیں اور اپنے وطن کی حرمت کے لئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ تاہم وطن سے محبت ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے ملی نغموں، چودہ اگست کی پر شکوہ تقریبات اور جذباتی اور کھوکھلے نعروں سے پیدا نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کے لئے ٹھوس بنیادوں پر عادلانہ نظام نافذ کرنا پڑے گا، ایسا عادلانہ نظام جو تاریک گھروں کو روشن کر دے، جو پچکے ہوئے گالوں کو بھر دے، جو بے رنگ ہتھیلیوں میں رنگ حنا بھر دے اور جو خمیدہ کمر سرو کے بوٹے کی طرح سیدھا کر دے۔ اس عادلانہ نظام کے قیام کے نتیجے میں دس کروڑ لوگوں کو یہ احساس ہو گا کہ ہندو کے چنگل سے چھٹکارا پانے کے بعد ایک اسلامی ریاست میں انہوں نے دوبارہ جنم لیا ہے اور اس اسلامی ریاست میں انسانوں کو وہ تمام ضروری آسائشیں یکساں طور پر فراہم کی جا رہی ہیں جنہیں انسانوں نے باہمی گٹھ جوڑ سے خورد برد کر لیا تھا۔ پھر ان کے دل میں یہ احساس جنم لے گا کہ اگر اس خطہ امن پر کوئی آنچ آتی ہے تو ان کی آئندہ نسلیں احترام آدمیت کے ساتھ زندہ رہنے کی نعمت سے محروم ہو جائیں گی، چنانچہ اس قومی احساس کے نتیجے میں دس کروڑ انسان اپنے وطن کی آزادی اور اس کی سالمیت کے لئے اتنی بڑی طاقت کے طور پر ابھریں گے کہ کوئی سپر پاور ان کی راہ میں آنے کی جرات نہیں کرے گی۔ یہ عادلانہ نظام بیرونی دشمنوں کی کمر بھی توڑ کر رکھ دے گا اور یوں وطن عزیز میں نہ کسی علیحدگی پسند کی دال گلے گی اور نہ فرقہ پرست قوتیں سر اٹھانے کے قابل رہیں گی اس صورت میں اقوام عالم کے ساتھ ہمارے تعلقات ہمارے اپنے مفادات کے تابع ہوں گے اور ہم ان سے اس طرح نہیں ملیں گے جس طرح ایک غریب رشتے دار، اپنے کسی امیر رشتے دار سے ملتا ہے!

۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء

چوتھے مارشل لا کی پہلی تقریر

پیر پگارا کی روحانی قوت کا ہمیں اندازہ نہیں، بلکہ ان کی سیاسی قوت سے بھی ہم پوری طرح آگاہ نہیں، البتہ ماضی میں ان کی کچھ پیش گوئیاں جس طرح درست نکلی ہیں، ان کے نتیجے میں ہم نے انہیں سیاسی منجم بہر طور مان لیا ہے۔ البتہ پیر صاحب نے دو تین روز پیشتر ایک ایسی پیش گوئی کی ہے کہ ہم پر لرزہ طاری ہو گیا ہے دراصل پیر صاحب نے ہمارے نمائندے سے گفتگو کے دوران چوتھے مارشل لاء کی طرف اشارہ کیا ہے جبکہ گذشتہ چند ماہ کے دوران ہم بمشکل اپنے بچوں کو یہ بتانے میں کامیاب ہو سکے ہیں کہ انتخابات کیا ہوتے ہیں، وزیر اعظم کسے کہا جاتا ہے، وزیر اعلیٰ کیا ہوتا ہے اور ایم این ایز اور ایم پی ایز کسے کہتے ہیں۔ اب اگر خدانخواستہ پیر صاحب کی پیش گوئی درست نکلی تو جمہوریت کے بارے میں ہمارے بچوں کی تازہ معلومات دھری کی دھری رہ جائیں گی اور پھر ایک طویل عرصے کے بعد اس موضوع پر ان کے ساتھ دوبارہ مغز ماری کرنا پڑے گی۔ اب بار بار "خدانخواستہ" کہنا اچھا نہیں لگتا، لیکن اگر خدانخواستہ چوتھا مارشل لاء لگ گیا تو صدیق سالک یا ان کی جگہ کسی اور کو اس چوتھے مارشل لاء کی پہلی تقریر تیار کرنا پڑے گی، دوسروں کی ہمیں پرواہ نہیں، لیکن صدیق سالک چونکہ ہمارے دوست ہیں۔ لہٰذا اگر کبھی انہیں یہ زحمت کرنا پڑی، تو ان کی سہولت کے لئے ہم نے ایک تقریر پیشگی تیار کی ہے تاکہ بوقت ضرورت ان کے کام آئے۔ اس تقریر کی تلخیص ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، میرے عزیز ہم وطنو اسلام علیکم! میں آج بہت مشکل حالات میں آپ سے مخاطب ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ بار بار مارشل لاء کا نفاذ کوئی اچھی بات نہیں، مارشل لاء ایک لعنت ہے، مگر اس کی ضرورت ہر بار ایک ناگزیر برائی کے طور پر پڑتی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، فوجی حکومت نے جمہوریت کے بارے میں اپنے تمام وعدے پورے کئے، منصفانہ انتخابات منعقد ہوئے، جن کی گواہی عالمی پریس نے بھی دی اور اس کے نتیجے میں عنان حکومت قوم کے منتخب نمائندوں کے سپرد کر دی گئی۔ جمہوری حکومت کے قیام کے نتیجے میں شہری آزادیاں بحال ہوئیں، صحافت پر سے تمام پابندیاں ہٹالی گئیں، سیاست دانوں کو یہ موقع فراہم کیا گیا کہ وہ اپنی سابقہ غلطیوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہوں اور آئندہ کے لئے پورے خلوص سے ملک و قوم کی خدمت کریں، مگر آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ سیاست دانوں نے صحافیوں نے اور دوسرے متعلقہ طبقوں نے اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کیا بلکہ انہوں نے حالات کو اس درجہ بگاڑ دیا کہ مجھے آج آپ کے سامنے آ کر یہ تقریر کرنا پڑ رہی ہے۔ ہمیں

حکومت کرنے کا کوئی شوق نہیں، لیکن ہم اپنی ذمہ داریوں سے بہر حال غافل نہیں ہو سکتے اور اس وقت جبکہ ملک کے استحکام کو خطرہ درپیش ہے اور قوم سولِ وار کے دہانے پر کھڑی ہے، ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ہم اس ناخوشگوار فریضے سے عہدہ بر آ ہوتے، میرے عزیز ہم وطنو! آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس عرصے میں سیاست دانوں نے ذاتی اغراض کے لئے ملک و قوم کے مفاد کو کس طرح داؤ پر لگایا۔ میں اس کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا کیونکہ آپ خود تمام حالات سے پوری طرح واقف ہیں تاہم ایک سانحے کا ذکر ضرور کروں گا، میرا اشارہ نہری پانی کے مسئلے کی طرف ہے۔ سیاست دانوں نے اس مسئلے کی آڑ میں پنجاب اور سندھ کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیا، اس نازک موضوع پر انتہائی غیر ذمہ دارانہ اور اشتعال انگیز بیان دیئے گئے، بلکہ اس مسئلے پر دونوں صوبائی حکومتیں بھی ایک دوسرے کے مد مقابل آ گئیں۔ میں اگرچہ اخبارات کا بڑا احترام کرتا ہوں مگر مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس موقع پر انہوں نے بھی ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا، چنانچہ سندھ سے نکلنے والے اخباروں نے پنجاب کے خلاف اور پنجاب سے نکلنے والے اخباروں نے سندھ کے خلاف شہ سرخیاں جمائیں اور یوں محسوس ہوا جیسے یہ تنازعہ دو صوبوں کے درمیان نہیں، دو دشمن ملکوں کے درمیان ہے۔ مگر ہم یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتے رہے، اگرچہ ہم پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ یہ سب کچھ سول حکومت کو ناکام بنانے کے لئے کیا جا رہا ہے، لیکن اس کے باوجود ہم نے مداخلت نہیں کی، کیونکہ ہم سول حکومت کو پوری آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع دینا چاہتے تھے۔ پھر آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ سیاست دانوں کو کھلی چھٹی ملتے ہی کنفیڈریشن کے ملک دشمن نعرے کھلے بندوں لگائے گئے اور اخبارات نے شہ سرخیوں کے ساتھ یہ بیانات شائع کئے، مگر ہم پھر بھی خاموش رہے اور ہماری اس خاموشی کو بھی معنی خیز قرار دیا گیا۔ اسی طرح سیاست دانوں نے بابائے قوم حضرت قائداعظمؒ کی کردار کشی کی مہم شروع کی، ان پر انتہائی رکیک اور نازیبا حملے کئے گئے لیکن کسی سیاست دان کو ان کی مذمت کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس موقع پر ایک بار پھر ہم پر الزام تراشی کی گئی کہ سول حکومت کے بحال ہوتے ہی یہ مہم اگر شروع ہوئی تو ایسے ہی نہیں ہوئی، مگر ہم نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا اور میرے عزیز ہم وطنو! کراچی میں رونما ہونے والے روح فرسا واقعات تو آپ کو ابھی تک نہیں بھولے ہوں گے۔ ٹریفک کے ایک حادثے کو بہانہ بنا کر جس طرح قومی املاک کو نقصان پہنچایا گیا، بے گناہوں کا قتل عام ہوا، بہاریوں اور پٹھانوں کو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے متنفر کیا گیا، یہ سب کچھ ہمارے لئے انتہائی تکلیف دہ تھا، مگر ہم پھر بھی خاموش رہے اور اس ضمن میں بھی سارے طعنے پورے صبر و تحمل سے برداشت کئے۔ رمضان المبارک کے مہینے میں عین سحری اور افطاری کے وقت لوڈ شیڈنگ کر کے لوگوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا گیا۔ اسی طرح مہنگائی، کرپشن اور بداخلاقی کو فروغ حاصل ہوا۔ ملکی سلامتی اور استحکام کو طرح طرح کے خطرات درپیش ہوئے، ان سب باتوں سے آپ خود پوری طرح واقف ہیں۔ چنانچہ میں ان کی تفصیل میں جائے بغیر عرض کروں گا کہ جس طرح مارشل لاء لگانا ایک قومی گناہ ہے، اسی طرح ان حالات میں مارشل لاء نہ لگانا قومی گناہ تھا۔ میں جانتا ہوں کہ خود غرض سیاست کی بساط لپیٹے جانے پر آپ بہت خوش ہیں، ملک میں چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی، اس کے

ٹھنڈا ہونے پر آپ کو خوشی حاصل ہوئی ہے' لیکن میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا کام حکومت کرنا نہیں ہے بلکہ ملکی سرحدوں اور اس ملک کے بنیادی نظریئے کی حفاظت ہے۔ چنانچہ ہم ضرورت سے ایک منٹ زیادہ بھی مارشل لاء برقرار نہیں رکھیں گے' بلکہ اپنے فریضے سے عہدہ بر آ ہوتے ہی واپس بیرکوں میں چلے جائیں گے' کیونکہ ہم پوری دیانت داری سے محسوس کرتے ہیں کہ ملک پر حکومت کا حق صرف قوم کے منتخب نمائندوں کو ہے تاہم اپنی ان معروضات کے آخر میں' میں سیاست دانوں کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی مذموم سرگرمیوں سے باز آجائیں' ورنہ ان سے سختی سے نبٹا جائے گا۔ اسلام زندہ باد' پاکستان پائندہ باد!

۱۸ جون ۱۹۸۵ء

فیض صاحب!

فیض صاحب گزشتہ دنوں ملکوں ملکوں پھرتے رہے، کبھی لندن، کبھی ماسکو، کبھی واشنگٹن کبھی بیروت، آج یہاں کل وہاں، مگر وطن کی مٹی نے انہیں بالآخر اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ گزشتہ بدھ کو اس کی گود میں سر رکھ کر سو گئے۔ فیض احمد فیض کے افکار سے اختلاف کرنے والے لوگ ہمارے ہاں بے شمار ہیں مگر ان کی دلربا شخصیت اور بے پناہ خوبصورت شاعری سے انکار کرنے والے لوگ بہت کم ہیں۔ بہت سے ترقی پسند شاعروں نے شاعری کے نام پر جس طرح واویلا اور نعرے بازی کو فروغ دیا، فیض کی شاعری عملی طور پر اس کے خلاف ایک احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک عجیب طرح کی نرمی اور لطافت ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ چنانچہ یہ ان کی شیریں لبی کا اعجاز ہے کہ "رقیب" بھی گالیاں کھا کر کبھی بے مزہ نہیں ہوا۔ اقبالؒ کے بعد جن شاعروں نے پرانے لفظوں کو نئے مفاہیم دیئے، ان میں فیض کا نام سرفہرست ہے۔ وہی گل و بلبل، دار، صیاد، صبا، جنوں، رقیب، شیخ، ساقی، جام، قاتل، ناصح، قفس، آشیانہ، مگر ان لفظوں میں ایک نیا جہانِ معنی آباد!

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو
بیداد گر سے شکوہء بیداد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا
رنگیں لہو سے پنجہء صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو
گر تن نہیں، زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو
دشنام، نالہ، ہاؤ ہو فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو

بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

روزِ عدل ابھی نہیں آیا اور یہ آواز خاموش ہو گئی ہے۔ "نوائے وقت" کے لئے انٹرویو کے دوران اس "عدل" کے مسئلہ پر فیض صاحب سے بہت باتیں ہوئیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ عدل کے قیام کے لئے خالص سوشلزم کے نفاذ پر زور دیں گے۔ مگر انہوں نے کہا کہ سوشلزم کوئی امرت دھارا نہیں کہ ہر جگہ یہی نسخہ استعمال کیا جائے ہر ملک کا اپنا اپنا نسخہ ہے۔ اپنے حالات اور روایات ذہن میں رکھنے چاہئیں۔ اب ظاہر ہے پاکستان اسلامی ملک ہے تو بنیادی اصول بھی اسلامی ہوں گے"۔ فیض صاحب کے اس بیان سے بہرحال یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سوشلزم کے قائل نہیں تھے مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ اس معاملے میں خود کو مولانا حسرت موہانی کا پیرو کہتے تھے۔

فیض صاحب کی ایک بات" جس نے مجھے ہمیشہ بہت متاثر کیا' وہ ان کی کشادہ دلی اور انکساری تھی۔ وہ اپنے مخالفین کو اختلاف کا حق دیتے تھے اور اس پر کبھی برہمی کا اظہار نہیں کرتے تھے اور جہاں تک انکساری کا تعلق ہے۔ اعجاز حسین بٹالوی راوی ہیں کہ ایک دفعہ فیض صاحب ان کے گھر لائبریری میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کی نظر بک شلف پر پڑی جس میں رومی' سعدی اور اقبال کے دواوین سجے ہوئے تھے اور ان کے برابر میں "دست صبا" کا ایک نسخہ رکھا ہوا تھا۔ فیض کہنے لگے بھئی شاعر تو یہ لوگ ہیں۔ مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے ہم کیا ہیں۔ اسی طرح فیض نے کبھی ہیرو بننے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ ایسے کئی مواقع ان کی زندگی میں آئے۔ مثلاً جب وہ کچھ عرصے کے لئے بیرون ملک گئے تو اس دوران یہ کہا گیا کہ فیض ملکی حالات سے دل برداشتہ ہو کر جلا وطن ہو گئے ہیں مگر جب ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان کی "جلاوطنی" کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے' بھئی کیسی جلاوطنی ہمارے پاس یہاں کوئی تعمیری کام نہیں تھا پھر ہم نے کچھ کام شروع کر رکھے تھے۔ جس کے لئے ہم باہر چلے گئے۔ اس کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہم مایوس وغیرہ ہو کر نہیں گئے تھے۔ فیض صاحب سکول کے زمانے میں کلاس کے مانیٹر تھے ان کے ذمے یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ ماسٹر صاحب کے حکم کے مطابق شریر لڑکوں کی ناک پکڑ کر ان کے منہ پر طمانچہ ماریں' مگر فیض صاحب طمانچہ مارنے کے بجائے گال سہلا دیتے تھے میں نے ان سے کہا کہ فیض صاحب لوگ ہر دور میں آپ سے توقع رکھتے ہیں کہ آپ حکومتوں کی ناک پکڑ کر ان کے منہ پر طمانچہ ماریں گے' مگر آپ ان کے گال ہی سہلا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ جواباً ایک شاندار سی بڑھک لگائیں گے مگر انہوں نے یہاں بھی ہیرو بننے کا موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔ کہنے لگے۔ بھئی ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جو کام خوش اسلوبی سے ہو' وہی اچھا ہے' یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات حقوق کے تحفظ کے لئے لڑائی بھی کرنا پڑتی ہے لیکن بیشتر اوقات لڑائی بے مقصد ثابت ہوتی ہے اور کبھی کبھار لڑنا بھی پڑ جائے تو وہ لڑائی نفرت کے لئے نہیں کی جاتی بلکہ محبت کے لئے کی جاتی ہے

فیض صاحب کشمیر کو پاکستان کا اٹوٹ انگ سمجھتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ کشمیر کے بغیر پاکستان کا نقشہ مکمل نہیں ہو سکتا وہ یہ بھی کہتے تھے کہ کم از کم ملکی سالمیت کی حد تک دائیں اور بائیں بازو میں اتحاد ضرور ہونا چاہئے مگر فیض صاحب کے حوالے سے جہاں ایسی بہت سی باتیں ہیں جن سے اتفاق کیا جا سکتا ہے' وہاں کچھ امور میں اختلاف کے پہلو بھی نکل سکتے ہیں۔ سو اس سے قطع نظر اصل بات یہ ہے کہ ایک بہت بڑا شاعر ہم سے جدا ہو گیا ہے۔ جس کی شخصیت دلربا تھی اور جو باہر کی دنیا میں پاکستان کی ادبی پہچان تھا۔

فیض صاحب! ہم آپ کو یاد کرتے ہیں

۲۴ نومبر ۱۹۸۶ء

حقِ دوستی

"یار تم نے اپنا گھر بہت خوبصورت بنایا ہے!"

"بھئی تم جانتے ہو' اس پر میری کتنی دولت اور کتنا وقت صرف ہوا ہے!"

"اس کا نقشہ تم نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟"

"حاصل کیا تھا؟ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ یہ نقشہ ایک بین الاقوامی شہرت کے ماہر تعمیرات سے بنوایا تھا۔ دس لاکھ روپے تو صرف اس کی فیس ادا کی تھی!"

"دس لاکھ روپے صرف نقشے کی فیس کے طور پر ادا کئے تھے؟"

"ہاں اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے' تم جانتے ہو اس مکان کی تعمیر پر کتنی لاگت آئی ہے؟"

"کتنی لاگت آئی ہے؟"

"چلو چھوڑو' تم سن کر بیہوش ہو جاؤ گے بس اتنا جان لو کہ اس میں جو کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے' وہ سب کا سب امپورٹڈ سٹف ہے!"

"کیا تم اس گھر میں خوش ہو؟"

"کیا مطلب؟ خوش کیا بہت خوش ہوں!"

"یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ تم نے یہ گھر رزق حلال سے نہیں بنایا!"

"ہاں جانتا ہوں۔ مگر پھر؟"

"کیا تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہیں کرتا؟"

"ضمیر؟ ضمیر انسان کو گناہوں سے روکتا نہیں! بس ان گناہوں کا مزا کرکرا کرتا ہے سو کبھی کبھی میرا مزا بھی کرکرا ہو جاتا ہے!"

"اگر تم کبھی اینٹی کرپشن والوں کی نظروں میں آ گئے؟"

"تو کیا ہو گا؟"

"پکڑے جاؤ گے اور کیا ہو گا؟"

"تم بھی بہت بھولے آدمی ہو۔ کوئی اور بات کرو!"

"کیا تم نے کبھی سوچا کہ اتنے کروفر سے رہنے کے باوجود معاشرہ تمہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا؟"

"کون سا معاشرہ؟"

"ارے بھئی' وہی معاشرہ جس میں تم رہتے ہو۔ جس میں تمہارے عزیز و اقربا' تمہارے محلے دار اور تمہارے دوست احباب بھی شامل ہیں؟"

"یہ سب لوگ تو مجھے دیکھ کر سجدے میں چلے جاتے ہیں"۔

یہ سب کچھ اوپر اوپر سے ہے' اندر سے وہ لوگ تمہیں پسند نہیں کرتے!"

"اندر کی بات جب تک اندر ہی رہے' اس سے ہمیں کیا نقصان پہنچتا ہے؟"

"اچھا چلو ضمیر کو بھی چھوڑو' انٹی کرپشن والوں کو بھی چھوڑو' معاشرے کو بھی چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ کہ مذہب پر ایمان رکھتے ہو!"

"ہاں ہر مہینے باقاعدگی سے گیارہویں شریف کا ختم پڑھاتا ہوں!"

"لیکن اگر تمہارے رزق میں حرام کی ملاوٹ ہے' تو یہ نذر و نیاز تمہارے کسی کام نہیں آئے گی!"

"یار کیوں مجھے ڈراتے ہو؟"

"نہیں اس میں ڈرانے والی کوئی بات نہیں' میں امر واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ ان لوگوں کے لئے سخت وعید ہے، جو حرام مال سے اپنے لئے گھر بناتے ہیں اور دنیا کی آسائشیں خریدتے ہیں!"

"یار تم کیوں مجھے خوفزدہ کرنے پر تل گئے ہو؟"

"میں تمہیں خوفزدہ نہیں کر رہا۔ صرف بطور دوست اپنا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ قبر جو پہلے ہی تنگ ہوتی ہے' ایسے لوگوں کے لئے اور زیادہ تنگ ہو جائے گی"۔

"اور...... اور کیا ہو گا؟"

"اور یہ کہ دوزخ کے فرشتے ایسے بدبختوں کو جلتے ہوئے الاؤ میں پھینک دیں گے اور جب ان کے جسم جل کر راکھ ہو جائیں گے تو انہیں نیا جسم عطا کیا جائے گا اور اس کے بعد دوبارہ الاؤ میں ڈال دیا جائے گا اور یہ عمل کروڑوں سال تک جاری رہے گا"۔

"کیا تم یہ سچ کہہ رہے ہو؟"

"میں نے اس معاملے میں جھوٹ بول کر خود جہنم کی آگ میں جلنا ہے؟ تم اب عمر کے آخری حصے میں ہو۔ طرح طرح کے عوارض میں گرفتار ہو کسی بھی وقت سانس تمہارا ساتھ چھوڑ سکتی ہے کیوں چند لمحوں کی آسائش کے لئے خود کو کروڑوں سال کے عذاب میں ڈالتے ہو' قارون کتنا امیر آدمی تھا؟ لیکن جب وہ مرا تو اس کا مال و دولت اس کے کام نہیں آیا اس وقت وہ پڑا دوزخ کی آگ میں جل رہا ہو گا!"

"تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ تم میرے محسن ہو۔ مجھ سے اب اس گھر میں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں بیٹھا جا رہا' تم مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟"

"خدا کاشکر ہے کہ تم نے میری باتوں کو دھیان سے سنا اور ان کا اثر بھی قبول کیا۔ اب تم اس عذاب سے اسی صورت میں نکل سکتے ہو کہ اپنے رزق حلال میں سے ایک چھوٹی سی کٹیا خرید کر یا کرائے پر لے کر اس میں رہو یقین جانو تمہیں اس کٹیا میں زیادہ سکون ملے گا!"

"اور موجودہ گھر کو کیا کروں؟"

"یہ تم میرے نام کر دو، میں تمہاری خاطر سارے عذاب سہہ لوں گا آخر حق دوستی تو ادا کرنا ہی پڑتا ہے!"

۱۴ مئی ۱۹۸۴ء

شاہی دنگل

ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ بتاریخ ۲۸ دسمبر ۱۹۸۱ء بروز سوموار بمقام خاص روڈی ضلع میانوالی شاہی دنگل منعقد ہو گا۔ منصف دنگل امیر اعظم خان رئیس آف پپلاں ہوں گے۔ جبکہ سر پرستوں میں ملک حاجی احمد نواز بندیال، رئیس اعظم بندیال اور انور خان رئیس اعظم روڈی شامل ہیں۔ اس شاہی دنگل میں سرگودہا، جھنگ، ڈیرہ اسماعیل خان، عیسیٰ خیل، مظفر گڑھ، کندیاں اور میانوالی اضلاع سے ٹیمیں شرکت کر رہی ہیں۔
اس دنگل کے منتظم حاجی غلام حیدر بھرو آنہ ہیں!

اور خواتین و حضرات! واضح رہے کہ جس شاہی دنگل کی نوید ہم نے ابھی ابھی سنائی ہے، اس کی خبر ہمیں بذریعہ ایک پوسٹر کے ہوئی ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ متذکرہ شاہی دنگل پہلوانوں کی کشتیوں پر مبنی نہیں، بلکہ یہ کتوں اور ریچھوں کی لڑائی ہے۔ چونکہ اس پوسٹر میں زیادہ وضاحت نہیں بلکہ "شاہی دنگل" کی سرخی کے نیچے صرف "ڈبل پروگرام" لکھا ہوا ہے، لہٰذا ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ "اس شاہی دنگل" میں کتے، کتوں سے بھی لڑیں گے اور کتوں اور ریچھوں کی لڑائی بھی ہو گی۔ اس کا ثبوت ان تصویروں سے بھی ملتا ہے، جو اس پوسٹر پر کسی "ماہر فن" نے بنائی ہیں۔ اس باتصویر پوسٹر میں سب سے اوپر ایک تصویر ہے جس کے نیچے "کتی...... چیمپئن پنجاب" لکھا ہوا ہے، اس کتیا کی دم اوپر کو اٹھی ہوئی ہے۔ ایک دوسری تصویر میں دو کتے اپنی اگلی دو ٹانگیں اٹھائے کھڑے ہیں، ایک کا نام "فجو" اور دوسرے کا نام "ہیرا" ہے اور ان کے نیچے "محمد اعظم والی جوڑی" لکھا ہوا ہے، اسی طرح کی دو اور کتی قسم کی تصویروں پر "محمد ایوب خاں والی جوڑی" اور "نصرت خاں والی جوڑی" کے الفاظ درج ہیں۔ نیچے دو تصویریں اور بھی ہیں، جن میں ریچھوں اور کتوں کو ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے دکھایا گیا ہے۔ اس "شاہی دنگل" میں جن معززین کے کتے اور ریچھ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوں گے، ان کے ناموں کی ایک طویل فہرست بھی ضلع وار اس پوسٹر میں درج ہے، بلکہ ایک سرخی "لڑنے والے ریچھوں کے نام" کی بھی ہے، جس کی ذیل میں غوثو عاشق، ریشم، لالو اور گلو وغیرہ ایسے نام لکھے ہوئے ہیں!

یہ پوسٹر جب ہم نے سرسری طور پر دیکھا تو پہلی نظر میں یہ ہمیں علامتی محسوس ہوا، چنانچہ ہم ان جانوروں کی تصویروں میں سے انسانوں کے چہرے پہچاننے کی کوشش کرتے رہے اور "شاہی دنگل" کی سرخی سے تو عجیب عجیب خیال ہمارے ذہن میں آئے۔ کیونکہ ہمارے ہاں بڑے بڑے عظیم الشان "شاہی دنگل" منعقد ہوتے رہے ہیں، اور عوامی دور میں ہوتے رہے ہیں، مگر وہ تو بھلا ہو کامران رشید صاحب کا کہ جب ہم یہ پوسٹر سامنے

رکھے اس کے علامتی مفاہیم تلاش کر رہے تھے تو وہ ہماری طرف آ نکلے۔ کامران رشید سرگودھا کے رہنے والے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا بھی سرگودھا کے ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کا شمار سرگودھا کے جاگیرداروں میں ہوتا ہے، اور وہ جو انور سدید کی ناز برداری کرتے رہتے ہیں تو یہ ان کے طبقے کی صدیوں پرانی روایتی بندہ پروری ہے۔ بہرحال کامران رشید نے بتایا کہ جناب یہ خوفناک قسم کے کتے جو آپ کو پوسٹر میں نظر رہے ہیں، ان کی علامتی نہیں، حقیقی حیثیت ہے اور سرگودھا کے کئی جاگیردار ایسے ہیں جنہوں نے یہ کتے پالے ہوئے ہیں۔ کامران رشید نے بتایا کہ ان کتوں کی بے حد ناز برادری کی جاتی ہے اور انہیں عمدہ سے عمدہ غذا کھلائی جاتی ہے ان کی دیکھ بھال پر مامور ملازم صبح سویرے انہیں کسی کھلے میدان میں لے جاتا ہے جہاں انہیں دوڑنے اور شکار پر لپکنے کی پریکٹس کروائی جاتی ہے۔ ان کتوں کے ساتھ ملازم کو بھی باقاعدہ دوڑنا پڑتا ہے، اس سلسلے میں جو ایک عبرتناک بات کامران رشید نے بتائی وہ یہ تھی کہ کچھ عرصے کے بعد ان کتوں اور ان سدھانے والے انسانوں کی شکلوں میں ایک حیرت انگیز قسم کی مماثلت پیدا ہو جاتی ہے مگر جو لوگ کتے پالتے ہیں انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اس سے کسی انسان کی اپنی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی ہے، کیونکہ انہیں تو کچھ عرصے کے بعد ان کتوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا ہوتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ سن کر ہم خاصے پریشان ہوئے اور یہ سوچ کر اس سے بھی زیادہ کہ بمقام خاص روڈی ضلع میانوالی میں جو شاہی دنگل منعقد ہونے والا ہے، وہ ہماری پریشانی سے منسوخ نہیں ہو جائے گا، لہٰذا ہم نے اپنے دل کو تسلی دے لی ہے کہ اس طرح کے دنگل پہلے بھی ہوا کرتے تھے، آج بھی ہو رہے ہیں اور شاید آئندہ بھی ہوتے رہیں گے، لہٰذا ہمیں ان کے بارے میں زیادہ "جذباتی" ہونے کی ضرورت نہیں، بس ان کے لئے دعا کرنی چاہئے جو پالتو ہیں اور ان کے لئے بھی جو پالنے پر مامور ہیں کہ ان ہر دو صورتوں میں جانور ہو یا انسان، اس کی اپنی شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔

۲۸ دسمبر ۱۹۸۱ء

چندے آفتاب

ایک بھارتی اخبار کے مطابق صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق جب گذشتہ دنوں بھارت کے دورے پر گئے تو ایک فقیران کے سامنے آگیااور اس نے انہیں دیکھ کر ساز پر۔

چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو
تم جو بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہو

گانا شروع کر دیا۔ جس پر صدر مملکت نے خوش ہو کر اس فقیر کو انعام دیا!

ہم نے اس خبر کو خصوصی طور پر کالم کا موضوع اس لئے بنایا ہے کہ صدر مملکت جب اختیارات کے عروج پر تھے تو پاکستان میں بھی بہت سے "فقیر" انہیں دیکھ کر یہ گانا گایا کرتے تھے اور من کی مرادیں پاتے تھے بلکہ صدر مملکت کی اس غریب پروری کے تو کئی سیٹھ بھی قائل ہیں، خود ہم نے کئی دفعہ یہ گانا گانے کی کوشش کی مگر بے سُرے ہونے کی وجہ سے الٹا اپنا کیس خراب کر بیٹھے، ایک بار ہم نے سونف ملتھی والا پان کھا کر سر لگائی تو صرف دوسرا مصرعہ۔

تم جو بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہو

صحیح طور پر ادا کر سکے، مگر آدھے سُر کا کیا فائدہ، چنانچہ یہ کمال نے نوازی ہمارے کچھ کام نہ آیا! حالانکہ ایمان کی بات یہ ہے کہ صدر مملکت کا اقتدار آج بھی چودھویں کے چاند کی طرح اور ان کا مقدر آفتاب کی طرح ہے۔ چنانچہ انہیں چندے آفتاب، چندے ماہتاب کہنا حقیقت کے منافی بھی نہیں ہے، باقی رہی یہ بات کہ۔

تم جو بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہو

تو اس میں تو ان کے دشمنوں کو بھی کلام نہیں۔ اب دیکھ لیں پاک بھارت جنگ انہوں نے کس طرح رکوائی ہے، ایک شاعر کا شعر ہے۔

اس نقش پا کے سجدہ نے اتنا کیا "خراب"
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

سو ہمارے صدر مملکت محض قیام امن کی خاطر کوچہ رقیب میں سر کے بل گئے اور کم ظرف رقیب کی کسی بے التفاتی کو خاطر میں نہیں لائے۔

آج کے اخبار میں صدر مملکت کی ایک تصویر شائع ہوئی ہے جس سے ہمارے متذکرہ دعوے کو مزید تقویت ملتی

ہے۔ یہ تصویر چودھری شجاعت حسین کے بھائی چودھری وجاہت حسین کی دعوت ولیمہ کی ہے اور صدر ضیاء الحق اس تصویر میں پیر پگاڑا کی پلیٹ میں سالن ڈال رہے ہیں' اب سیدھی سی بات ہے کہ جب صدر ضیاء کسی کی پلیٹ میں کچھ ڈالتے ہیں تو وہ خوش ہوتا ہے اور اس خوشی میں۔

چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو
تم جو بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہو

والا گانا گانے لگتا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ ان کے مدمقابل پیر پگاڑا ہیں جو صرف ایک دفعہ پلیٹ میں سالن ڈالنے سے خوش نہیں ہوتے چنانچہ تصویر میں ایک طرف وہ صدر ضیاء الحق سے پلیٹ میں سالن ڈلوا رہے ہیں اور دوسری طرف ان کا اپنا ہاتھ بھی ڈونگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ویسے ایک پلیٹ خود صدر ضیاء الحق کے ہاتھ میں بھی ہے' یعنی دوسروں کو کھلانے کا مقصد یہ نہیں کہ انسان خود بھوکا رہ جائے' سو دونوں بھائی مل کر کھا رہے ہیں تاہم صدر ضیاء الحق کا اپنے ہاتھ سے پیر پگاڑا کی پلیٹ میں بوٹیاں ڈالنا ایک ایسا اقدام ہے' جس سے پیر صاحب' کم از کم بطور پیر تو ضرور خوش ہوئے ہوں گے۔

ابھی تک اوپر کی سطور میں ہم نے صدر ضیاء الحق کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے' وہ محض اخباری خبروں اور تصویروں کے حوالے سے نہیں لکھا بلکہ اس میں ہمارا ذاتی تاثر بھی شامل ہے' گذشتہ نو دس برسوں میں ہمیں صدر صاحب کو متعدد مواقع پر قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے' سیاستدانوں کو تو چھوڑیئے' ہم نے انہیں پانچ برس تک اہل قلم کانفرنس کے دوران ادیبوں سے بھی اس طرح گھلتے ملتے دیکھا ہے کہ بہت سے ادیب وہیں کھڑے کھڑے سالن کی پلیٹ میں "گھل مل" گئے۔ گذشتہ برس اہل قلم کانفرنس میں صدر صاحب کے ساتھ وزیر اعظم کو بھی مدعو کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت صدر مملکت نے فرمائی اور اختتامی اجلاس میں وزیر اعظم تشریف لائے' لیکن مے گساروں کا ہجوم "پیر مغاں" کے گرد رہا اور اس دفعہ جو اہل قلم کانفرنس منعقد ہو رہی ہے' اس میں شنید ہے کہ صرف وزیر اعظم تشریف لا رہے ہیں' ہم نے دو میں سے ایک کی آمد کے سلسلے میں جو افواہیں سنی ہیں' ان کا ذکر نہیں کریں گے۔ کیونکہ لوگ پہلے ہی جنرل عارف اور جنرل رحیم الدین کی ریٹائرمنٹ کے حوالے سے بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ البتہ لگتا یوں ہے کہ وزیر اعظم محمد خان جونیجو کو اب صدر ضیاء الحق کے "چندے آفتاب' چندے ماہتاب" ہونے میں شبہ نہیں تو تھوڑا بہت تامل ضرور ہے کیونکہ آئین کی رو سے انتظامی سربراہ وزیر اعظم محمد خان جونیجو ہیں اور یوں بہت سے فقیر ہاتھ میں اکتارہ لئے وزیر اعظم کے جھروکے کے نیچے کھڑے ہیں اور۔

چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو
تم جو بھی خدا کی قسم لاجواب ہو

والا گیت چھیڑنا چاہتے ہیں۔ وہ صرف اشارے کے طلب گار ہیں اور کہہ رہے ہیں حضور! اجازت دیجئے' شام ڈھلنے والی ہے!

۲۶ مارچ ۱۹۸۷ء

مسافر نواز بہتیرے

امریکہ میں سرکاری طور پر گزرے ہوئے چار ہفتے اور اپنے طور پر گزارا ہوا ایک ہفتہ شدید ترین مصروفیات کے باوجود اچھا کیونکر گزرا' اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ہمارے امریکی میزبانوں نے "جبری خواندگی" سے قطع نظر ہمارے آرام و آسائش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہمارا قیام امریکہ کے بہترین ہوٹلوں میں تھا جو مجھے ذاتی طور پر اپنی طبیعت کی سادگی کی وجہ سے اتنا پسند نہیں تھا اور ویسے بھی ہوٹل کا کرایہ اس یومیہ میں سے خود ادا کرنا پڑتا تھا جو امریکی حکومت ہم مہمانوں کو ادا کرتی تھی۔ ایک آسائش یہ بھی تھی ہمیں یہاں بیمار و بیمار ہونے میں کوئی تردد نہیں تھا' کیونکہ امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہمارے ہاتھ میں ایک کاغذ تھما دیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ یہ آپ کی ہیلتھ انشورنس ہے چنانچہ آپ میں سے جو معزز مہمان بیمار ہونا چاہے' وہ تکلف سے کام نہ لے' اسے صرف ابتدائی پچیس ڈالر ادا کرنا پڑیں گے باقی رقم انشورنس والے ادا کریں گے البتہ آپ کو دو باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا' ایک تو یہ کہ آپ اس تاریخ سے بیمار ہوں جس تاریخ سے آپ ہمارے مہمان ہیں' کیونکہ سابقہ تاریخوں میں بیمار ہونے کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے' نیز مہمان نوازی کی تاریخ گزرنے کے بعد بھی بیمار ہونے کی کوشش نہ کریں' اگر آپ بیمار ہوں گے تو اپنی "گور گردن" پر ہوں گے' دوسری ہدایت یہ تھی کہ بیماری کا انتخاب سوچ سمجھ کر کریں' زیادہ مہنگی بیماری کا انتخاب چنداں مفید نہ ہو گا کیونکہ انشورنس والوں نے صرف دو ہزار ڈالر تک کا بل ادا کرنے کی حامی بھری ہے۔ بہر حال امریکہ میں تقریباً مفت ہیلتھ انشورنس ایک بہت بڑی نعمت سے کم نہیں اگر امریکہ میں لوگوں کی صحتیں بہتر نظر آتی ہیں تو اس کی وجہ بہتر خوراک نہیں' بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ انتہائی مہنگے علاج کے خوف سے بیمار نہیں ہوتے۔ چنانچہ انشورنس کے کاغذات ہاتھ لگنے کے بعد مجھے ایک نئی فکر لاحق ہو گئی اور وہ یہ کہ اگر خدانخواستہ بیمار ہونے کا موقع نصیب نہ ہوا' تو میں اس ہیلتھ پالیسی کے فوائد سے محروم رہ جاؤں گا اور شومئی قسمت ملاحظہ فرمائیں کہ ایسا ہی ہوا۔ ہمارے ساتھ وی آئی پیز ایسا سلوک یہ بھی کیا گیا تھا کہ ایک تعارفی کارڈ ہمیں دیا گیا' جس پر درج تھا کہ حامل رقعہ ہذا امریکی حکومت کا مہمان ہے چنانچہ حامل رقعہ کے ساتھ آپ کا خصوصی سلوک قابل تعریف امر سمجھا جائے گا' مگر افسوس کہ راقم کو یہ پرچی "کسی" کو دکھانے کی ہمت ہی نہیں پڑی' ایک خصوصی سلوک یہ بھی تھا کہ وطن واپسی کے وقت مقررہ وزن سے قریباً تیس پاؤنڈ اضافی سامان لے جانے کی سہولت بھی فراہم کی گئی تھی' جس کا کرایہ پین ایم والوں نے ادا کرنا تھا مگر میں اس سہولت سے بھی محروم رہا کیونکہ سفر کے دوران اپنا سامان بڑھانے کی بجائے میں مسلسل کم کرتا رہا' چنانچہ میں نے اپنی دو قیمتی جیکٹیں جو خاصی وزنی تھیں' عنایت خسروانہ سے کام لیتے ہوئے دو امریکی کارندوں کو عنایت کر دیں' یہ جیکٹیں "امریکہ" ہی سے آئی تھیں چنانچہ میں انہیں امریکہ ہی چھوڑ آیا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

پاکستان سے امریکہ اور امریکہ سے پاکستان تک برٹش ائر ویز اور پین امریکن میں ہماری نشستیں امتیازی کلاسوں میں بک تھیں' جہاں دیگر سہولتوں کے علاوہ مفت بادہ نوشی کا وافر مقدار میں انتظام تھا لیکن ساقی کا اصرار تھا کہ نظروں سے پینے کی بجائے براستہ پیالہ و ساغر پی جائے مگر افسوس کہ ساقی کی خواہش کا احترام نہ کر سکا چنانچہ۔

میں نظر سے پی رہا تھا کہ یہ اس نے بد دعا دی
تیرا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے

سو دوران سفر میرا ہاتھ جام تک نہ پہنچ سکا اور یوں میں اس سہولت سے بھی محروم رہا۔ تاہم کسی سہولت سے استفادہ نہ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ خصوصی سہولتوں کا نشہ نہیں ہوتا' وی آئی پی ہونے کا اپنا نشہ ہے چنانچہ امریکہ میں قیام کے دوران یہ وہ نشہ تھا جسے صبح چھ بجے سے شام چھ بجے تک مسلسل مشقت کی ترشی بھی نہ اتا سکی۔

امریکہ میں قیام کو دلچسپ بنانے والی دوسری چیز میرے وہ ساتھی تھے' جن کا تعلق پندرہ مختلف ممالک سے تھا' ان میں سے فلپائن کے ماناروس' اردن کے محمد حلال شاہ' کویت کے احمد قلندر' ترکش سائپرس کے حسین اور سوڈان کے ڈاکٹر عراقی مسلمان تھے اور ان میں سے حلال شاہ کو چھوڑ کر باقی سب کے سب نوجوان تھے۔ انڈیا کا اینڈرین کیتھولک عیسائی تھا' یہ بھی نوجوان تھا اس کا تعلق مدراس سے تھا وہ مجھے "الحق" کہتا تھا۔ موصوف سرزمین امریکہ پر قدم رکھنے کے بعد سے کسی ایسی امریکی خاتون کی تلاش میں تھے جس سے شادی کر کے وہ گرین کارڈ حاصل کر لیں' دورے کے آخری دنوں میں وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے جب میں نے انہیں ایک ایسی امریکہ "دوشیزہ" کے ساتھ دیکھا' جس کی عمر کم از کم پچپن برس تھی' یہ اتنے پرانے ماڈل کی "کار" تھی جس کے اسپیئر پارٹس بھی مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھے' ظاہر ہے شادی تو فوری طور پر نہیں ہو سکتی تھی اور اس میں زیادہ تاخیر بھی مناسب نہ تھی کیونکہ خاتون کی عمر کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ رسک نہیں لیا جا سکتا تھا' بہر حال اللہ جانے ان کی شادی ہوئی کہ نہیں ہوئی' مگر موصوف کا "تواّ" بہت لگتا رہا۔ ہمارے دورے کو دلچسپ بنانے میں یونانی قبرص کے کیریانی کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ یہ بہت دلچسپ شخص تھا۔ مجھے "قیس می" کہتا تھا' اس کی انگریزی بہت کمزور تھی' ایک دن مجھے کہنے لگا "قیس می' میں جب صبح اٹھتا ہوں تو تازہ دم ہونے کی وجہ سے میری انگریزی قدرے بہتر ہوتی ہے۔ دوپہر تک اس انگریزی میں لاغری پیدا ہو جاتی ہے اور شام کو یہ بالکل دم توڑ دیتی ہے" اور وہ صحیح کہتا تھا چنانچہ شام کے بعد میں اس کے ترجمان کے فرائض انجام دیتا تھا۔ فلپائن کا ماناروس ہر وقت کسی نہ کسی "بھسوڑی" میں ہوتا تھا۔ چنانچہ جب تعلیمی سیشن میں شرکت کے لئے روانگی کی خاطر سب لوگ وین میں بیٹھ چکے ہوتے' وہ سب سے آخر میں گھبرایا گھبرایا سا نمودار ہوتا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی کوئی چیز اور برابر سے گزرتے ہوئے کسی شخص کو گراتا ہوا وین میں داخل ہوتا۔ اس کی ایک ادا جو سب کو بہت پسند تھی وہ یہ تھی کہ سیشن شروع ہوتے ہی وہ کرسی کے ساتھ ٹیک لگاتا اور سو جاتا' بلکہ تھوڑی دیر بعد ہلکے ہلکے خراٹے بھی لینے لگتا۔

ایک بڑی میز جس کے گرد صرف پندرہ بیس لوگ بیٹھے ہوں' ان میں سے ایک "بر سرِ عام" سویا ہوا شخص جتنا نمایاں لگ سکتا تھا' اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ لیکن سونے سے زیادہ مانا روس کا اصل کمال یہ تھا کہ قریباً پینتالیس منٹ کی گہری نیند کے بعد وہ نیم غنودگی کے عالم میں اپنا ہاتھ کھڑا کرتا اور کوئی سوال داغ دیتا۔

سوال کرنے والوں میں کولمبیا کے وکٹر کا بھی کوئی جواب نہیں تھا' یہ حلقہ اربابِ ذوق کا کوئی پیشہ ور "بحثیا" لگتا تھا' اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی' خاصا پڑھا لکھا آدمی تھا اس کی شکل تحسین فراقی سے بہت ملتی تھی' مگر جو لوگ تین چار لیکچر سن کر تھک کر چور ہوئے ہوتے' اس وقت یہ "دستِ سوال" دراز کرتا اور تابڑ توڑ سوال کر کے سیشن کو ایک گھنٹہ مزید طویل کر دیتا۔ ایک روز کپریانی کہنے لگا "قیس می میری ایک درخواست ہے کہ تم وکٹر کے برابر والی کرسی پر بیٹھا کرو" میں نے وجہ پوچھی کہنے لگا "وجہ کوئی خاص نہیں' بلکہ صرف مشورہ ہے کہ جب وکٹر سوال کرنے لگے' تم اس کے پاؤں پر اپنے جوتے کی ایڑی کس کر مارو۔ تاکہ اس کے سوالوں سے نجات مل جائے!" کویت کا احمد قلندر بہت خوب صورت عادات مالک تھا' مگر بہت "شائی" تھا' چنانچہ زیادہ لوگوں کے سامنے کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ فینیکس کے میئر' مسٹر ڈرنک واٹر کی طرف سے دیئے گئے عصرانے میں ہم سب غیر ملکی مندوبین کو مائیک پر آ کر اظہارِ خیال کرنا تھا' چنانچہ ہم قطار میں راسٹرم کے پاس کھڑے تھے اور باری باری مائیک پر جا کر اظہارِ خیال کرتے تھے' احمد قلندر میرے برابر میں کھڑا تھا اور جوں جوں اس کی باری قریب آ رہی تھی' اس کے ذہنی تناؤ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا حتیٰ کہ جب اس کا نام پکار گیا تو وہ سیدھا منہ کے بل فرش پر گر گیا!

سوڈان کا ڈاکٹر عراقی ہر وقت اداس اداس رہتا تھا' بس اس کے چہرے پر رونق اس وقت آتی تھی جب اس کے سامنے سفید فام کیرولین کا ذکر ہوتا تھا۔ اس وقت وہ ٹھنڈی آہ بھرتا اور کہتا تھا "کوئی ہے جو میرے جذبات اس تک پہنچائے" اردن کا محمد حلال شاہ انتہائی دلچسپ آدمی تھا' بہت بذلہ سنج' اس کے گیارہ بچے تھے' جب کوئی اس سے پوچھتا کہ تم اردن میں کیا کام کرتے ہو' تو وہ اپنی ننھی منی سفید داڑھی کو کھجلاتے ہوئے کہتا "میں نے تمہیں بتایا نا کہ میرے گیارہ بچے ہیں"۔ پیرو کا الفانسو تصویریں کھینچنے کا شوقین تھا' بسا اوقات وہ خالی دیوار کی تصویریں بنانے لگتا تھا۔ قبرص کا حسین ہر وقت ڈالروں کا حساب کرتا رہتا کہ کتنے ڈالر خرچ ہو گئے ہیں اور کتنے ابھی مزید ملنے کی توقع ہے۔ ڈنمارک کا پال صحیح معنوں میں ایک نستعلیق آدمی تھی' اس کا مزاج انتہائی شستہ ہوتا تھا۔ ڈنمارک کی بی بی بیٹن اس سے زیادہ نستعلیق تھی' عمر چالیس کے قریب' خوبصورت' دراز قد' تیکھے نین نقش' مگر انتہائی ریزرو رہتی تھی' وہ جانتی تھی کہ مردوں سے عزت کس طرح کرائی جاتی ہے' چنانچہ ان چار ہفتوں میں کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ اس کے بارے میں کوئی جعلی "کلیم" ہی داخل کر سکے۔ بس یہ وہ لوگ تھے اور یہ وہ فضا تھی' جس میں چار ہفتے مختلف النوع مسائل کے باوجود بہت اچھی طرح گزرے۔ اور ہاں کویت کا احمد قلندر اور ڈنمارک کا پال ہوٹل کے "سالم" کمرے میں رہتے تھے۔ ڈنمارک کی بیٹن بھی کسی کے ساتھ کمرہ شیئر نہیں کرتی تھی۔

سفر آسان نہیں ہے

پاکستان میں میکدے ویران تھے۔ تشنہ لب ہونٹوں پر زبان پھیرتے تھے کہ ۲ر اپریل کو اچانک لندن سے ایک ساقی کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ یہ ساقی فاروقی تھے اور "رندوں" نے انہیں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور گھیر گھار کر ہوٹل ڈی پیرس لے گئے جہاں شہر کے ادیب اور آج کی اس محفل کے میزبان سراج منیر موجود تھے واضح رہے کہ لاہور میں چند دوستوں نے "حلقہ احباب" کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے جہاں یار لوگ باری باری میزبانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہاں دوستوں نے ساقی فاروقی سے جی بھر کر ان کا کلام سنا ساقی خوبصورت اور مختلف قسم کے شاعر ہیں اور ان کے پڑھنے کا انداز تو بہت ہی مختلف ہے وہ جب شعر سناتے ہیں تو ان پر وجد طاری ہو جاتا ہے وہ آنکھیں اور مٹھیاں بھینچ لیتے ہیں اور لفظوں کو اتار چڑھاؤ کے ساتھ ادا کرتے ہوئے گردن کو خم دیتے چلے جاتے ہیں یہاں احباب نے ان سے اوپر تلے کئی نظمیں اور غزلیں سنیں اور اسی کیفیت میں سنیں!

اور جب وہ اپنا کلام سنا چکے تو انہوں نے حاضرین محفل سے کچھ سنانے کی فرمائش کی جب ان کا اصرار بڑھا تو شعراء نے اپنی نمائندگی کیلئے محفل میں سے احمد ندیم قاسمی، انجم رومانی صلاح الدین محمود اور اختر حسین جعفری کے نام پیش کئے کہ "ہاتھیوں" کے پاؤں میں سب کے پاؤں۔ اور پھر وہ محفل جمی کہ روئے رب داناں! خصوصاً ساقی فاروقی پر تو ویسی ہی کیفیت طاری ہو گئی، جیسی کیفیت اپنے شعر سناتے وقت ان پر طاری ہو جاتی ہے یہ "ساقی" لندن سے تشنہ لب آیا تھا۔ اور خوب سیر ہو کر لوٹا!

یہ مرحلہ طے ہوا تو خوش گپیاں شروع ہو گئیں ساقی فاروقی نے اس محفل میں دوستوں کی فرمائش پر اپنی ایک مشہور نظم "خالی بورے میں زخمی بلا" بھی سنائی شعروشاعری کے دور کے اختتام پر گپ شپ کے دوران امجد اسلام نے خالد احمد کو با آواز بلند مخاطب کیا اور کہا "تم اپنے مجموعے کا نام سوچ رہے تھے میری مانو تو "خالی بورے میں زخمی بلا" رکھ لو کہ خاصا حسب حال نام ہے!' خالد احمد نے خوش طبعی سے کہا "درست ہے مگر یہ ایک مجموعے کا نہیں دو علیحدہ علیحدہ مجموعوں کے نام ہیں ان میں سے "زخمی بلا" میرے مجموعے" کیلئے ٹھیک ہے "خالی بورا" تمہارے مجموعے کیلئے مناسب رہے گا"

محفل میں ایک دوست نے ماضی قریب میں منعقد ہونے والی اقبال کانگریس کے حوالے سے ایک لطیفہ سنایا کہ فیض احمد فیض ایک مندوب کی حیثیت سے اس میں شرکت کیلئے انٹر کانٹی نینٹل پہنچے تو انہوں نے "استقبالیہ" کی طرف رجوع کیا یہاں پر متعین کارکن نے رجسٹر کے اوراق پلٹتے ہوئے پوچھا" آپ کا نام"

"فیض احمد فیض!" فیض صاحب نے جواب دیا

"فیض احمد فیض" کارکن نے رجسٹر کے اوراق پر نظریں جماتے ہوئے یہ نام دہرایا اور پھر پوچھا "کیا کرتے ہیں؟" اس لطیفے پر حاضرین کی ہنسی تھمی تو ایک ستم ظریف نے ہولے سے کہا "اور فیض صاحب کی مجبوری دیکھیں کہ بیچارے یہ بتا بھی نہیں سکتے وہ کیا کرتے ہیں؟"

اشفاق احمد ایک جید افسانہ نگار ہی نہیں پارٹ ٹائم شاعر بھی ہیں جب اس محفل میں دوستوں نے ان سے کلام کی فرمائش کی تو انہوں نے کہا مجھے یاد نہیں! ذرا سوچنے دیں اور جب انہیں سوچتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تو گلزار وفا چودھری نے کہا "اشفاق صاحب شائد تازہ غزل کہنے میں مشغول ہو گئے ہیں!"

کسی زمانے میں انتظار حسین بھی شاعر ہوا کرتے تھے اور بقول احمد مشتاق ان کا اس دور کا کلام آج بھی حضرت ایم اسلم کے ناولوں میں بکھری شکل میں موجود ہے یہاں انتظار حسین سے بھی فرمائش کی گئی کہ وہ اپنے لڑکپن کا کوئی شعر سنائیں مگر انہوں نے جواب میں انجم رومانی کا ایک شعر سنا دیا اس پر انجم رومانی نے کہا "تم سے فرمائش یہ کی گئی تھی کہ اپنے لڑکپن کا کوئی شعر سناؤ تم نے میرے لڑکپن کا شعر سنا دیا!"

حضرت سعادت سعید بھی اس محفل میں موجود تھے جب گردونواح کی فضا دیکھ کر انہوں نے بھی ظریفانہ جملے اچھالنے کی کوشش کی تو ان کے برابر میں بیٹھے ایک بغلی گھونسے نے ایک نظر انہیں دیکھا اور کہا

"ایں سعادت بزور باز نیست"

اس محفل کے خاموش سامعین میں کراچی سے الگ الگ آئے ہوئے مہمان سجاد میر اور فاطمہ حسن بھی شامل تھے ساقی فاروقی نے سجاد میر کو دیکھا تو کہا "ارے تم سے بھاگ کر ہم لاہور آئے تھے تم یہاں بھی پہنچ گئے ہو!"

اور ظاہر ہے کہ عالمی سطح پر موجود نفسانفسی اور اعصابی کھچاؤ کے اس دور میں اگر کچھ احباب اس طرح جمع ہو جاتے ہیں اور ہنس بول لیتے ہیں تو یہ بہت غنیمت ہے ورنہ تو وہی مصیبتیں ہیں، وہی پریشانیاں ہیں اور وہی خالی بوروں میں زخمی بجتے ہیں۔

تم کو اپنے بورے
اپنے خالی بورے کی پہچان نہیں ہے جان محمد خان
سفر آسان نہیں ہے......!

۶ر اپریل ۱۹۷۹ء

خواتین

اگر رکشوں کے پیچھے "پپو یار تنگ نہ کر" یا "او بلا جانی جار یا ای" قسم کی عبارتیں درج ہوتی ہیں تو بسوں کے اندر بھی بہت کچھ لکھا ہوتا ہے مثلاً

اپنے سامان کی خود حفاظت کریں

جسم کا کوئی حصہ باہر نہ نکالیں!

کنڈیکٹر کے ساتھ تعاون کریں!

ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر سونا منع ہے!

سگریٹ نوشی سے پرہیز کریں وغیرہ وغیرہ

گذشتہ دنوں ہم نے بھی ایک بس میں سفر کیا اور اس میں بھی کھڑکیوں پر یہی عبادتیں درج تھیں، بلکہ اس میں تو ایک گھپلا بھی تھا اور وہ یہ کہ یہ کہ متذکرہ ساری ہدایات خواتین کیلئے مخصوص نشستوں پر لکھی گئی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہر ہدایت کے آگے لفظ "خواتین" بھی لکھا تھا۔ جس کا مطلب اگرچہ یہ تھا کہ یہ سیٹ خواتین کیلئے مخصوص ہے، مگر یہ لفظ متذکرہ ہدایت کے عین ساتھ لکھنے سے یہ تاثر ملتا تھا جیسے ان ہدایات کی مخاطب صرف خواتین ہیں۔ چنانچہ اس صورت میں ان ہدایات کی نوعیت کچھ یوں ہو گئی تھی۔

جسم کا کوئی حصہ باہر نہ نکالیں۔ خواتین!

کنڈیکٹر کے ساتھ تعاون کریں۔ خواتین!

ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر سونا منع ہے۔ خواتین!

سگریٹ نوشی سے پرہیز کریں۔ خواتین!

وہ تو خدا کا شکر ہے کہ بس میں آزادی نسواں کی کوئی لیڈر سفر نہیں کر رہی تھیں۔ ورنہ ان ہدایات کے ساتھ سہواً پیوست شدہ "خواتین" کے لفظ پر وہ سیخ پا ہو جاتیں کہ عورتوں کے ساتھ یہ امتیازی سلوک دانستہ روا رکھا گیا ہے۔ چنانچہ وہ ان "پابندیوں" کو چیلنج کو بیٹھتیں اور آستینیں چڑھا کر کہتیں کہ وہ اپنے سامان کی حفاظت نہیں کریں گی۔ وہ جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور باہر نکالیں گی۔ وہ کنڈیکٹر کے ساتھ تعاون نہیں کریں گی اور ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ضرور سوئیں گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسی ناخوشگوار صورت حال پیدا نہیں ہوئی کیونکہ بس میں خواتین سفر کر رہی تھیں خواتین کی لیڈر کوئی نہیں تھی!

بس میں اگرچہ ایسی کوئی خاتون سفر نہیں کر رہی تھی لیکن ہمارے ساتھ ہمارا ایک دوست ضرور سفر کر رہا تھا جو خواتین کا خواتین سے زیادہ ہمدرد ہے۔ اس نے یہ ہدایات پڑھیں تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "یہ ملک ترقی نہیں کر سکتا!" ہم نے حیران ہو کر پوچھا "وہ کیوں؟" بولا "اس ملک میں خواتین کا جینا حرام کیا جا رہا ہے!" ہم نے پوچھا "وہ کیسے؟" بولا "وہ ایسے کہ ہر قسم کی پابندیاں عورتوں کیلئے ہیں۔ عورت کو اگر گھر سے باہر شام ہو جائے تو خود اس کے گھر والے اس کی نسوانیت کے بارے میں مشکوک ہو جاتے ہیں اور اگر مرد بھی شام کو گھر آ جائے تو گھر والے اس کی مردانگی پر شبہ کرنے لگتے ہیں!" ہم نے کہا "یہ تم ٹھیک کہتے ہو!" کہنے لگا "میں باقی باتیں بھی ٹھیک کہتا ہوں' مثلاً یہ کہ ملازمت پیشہ خواتین ارد گرد پھرنے والے بھیڑیوں سے خود کو محفوظ رکھنے کی کوششوں میں لگی رہتی ہیں۔ مگر بہر صورت الزام انہی کے سر آتا ہوتا ہے!" ہم نے کہا "یہاں بھی جناب بجا فرماتے ہیں!" بولے "ابھی اور سنو! شادی سے پہلے عورت باپ اور بھائیوں کے احکامات کے عین مطابق زندگی بسر کرتی ہے اور شادی کے بعد اسے شوہر کی غلامی کرنا پڑتی ہے!" ہم نے عرض کیا "یہاں تم سے تھوڑے بہت اختلاف کی گنجائش موجود ہے' مگر بنیادی طور پر تم یہاں بھی صحیح ہو"

ہمارے اس دوست نے غالباً گفتگو کو ابھی طول دینا تھا لیکن وہ اچانک جھنجلا اٹھا اور بولا "یہ تم کیا ہاں میں ہاں ملاتے جا رہے ہو' کہیں اختلاف کرو تو گفتگو آگے بڑھے!" ہم نے عرض کیا "تمہاری کسی بات سے اختلاف ہو تو کروں۔ میں تم سے اس مسئلے کا صرف حل دریافت کرنا چاہتا ہوں!" بولا مغربی معاشرے نے پیش کر دیا ہے۔ تم تو وہاں سے ہو کر بھی آئے ہو!" ہم نے کہا "تبھی تو میں اس مسئلے پر کنفیوز بھی ہوں کیونکہ وہاں یہ مسئلہ ایک طرح سے مزید پیچیدہ ہو گیا ہے" دوست نے پوچھا "وہ کیسے؟" ہم نے کہا "وہ ایسے کہ عورت سے گھر کی ڈیوٹی واپس نہیں لی گئی اور دفتر کی ڈیوٹی بھی اسے سونپ دی گئی۔ حتیٰ کہ قدرت نے بھی اس سلسلے میں کوئی خاص رعائت نہیں دی۔ چنانچہ مغرب میں بھی عورت اور مرد کی برابری کے باوجود بچے عورت ہی کو جننا پڑتے ہیں۔ وہاں بھی مردوں کیلئے بننا سنورنا عورت ہی کو پڑتا ہے۔ مغرب کی عورت بھی برابری کے دعویٰ کے باوجود نفسیاتی طور پر مرد کی ڈومینینشین (برتری) چاہتی ہے حرامی بچے کی ماں آج بھی وہاں مسئلہ ہے، حرامی بچے کا باپ نہیں۔ عورت کو برابر کے حقوق مل جانے کے بعد اب بسوں اور ٹرینوں میں احترام کی علامت کے طور پر خواتین کیلئے سیٹ کوئی خالی نہیں کرتا۔ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی قطار میں کھڑے ہونا پڑتا ہے۔ خواتین کیلئے کار کا دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ نائٹ کلبوں میں عورتوں کو مردوں کی تفریح طبع کے لئے برہنہ کیا جاتا ہے' بلکہ سٹیج پر "زنہ شو" بھی ہوتے ہیں۔ گویا مغرب میں عورت گھر کے کام بھی سنبھالتی ہے۔ سرعام مرد کے سفلی جذبات کی تسکین بھی کرتی ہے۔ خصوصی مراعات سے بھی محروم ہو گئی ہے اور دلوں سے اس کا احترام بھی رخصت ہو گیا ہے۔ سو خواتین کے حقوق کے ضمن میں مغرب کا حوالہ تو نہ دو کہ۔

طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

البتہ اگر کوئی اور معاشرہ ذہن میں ہے تو اس کی بات کرو!" یہ سن کر دوست نے ایک لمحے کے لئے تامل کیا

اور کہا "سوشلسٹ" معاشرے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" ہم نے عرض کی "سوشلسٹ معاشرہ اگر انسانی معاشرہ ہے تو پھر وہاں بھی صورت حال زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جتنا سوشلسٹ لٹریچر میں نے پڑھا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے!"

ہم نے اور ہمارے دوست نے گندے نالے کے سٹاپ پر اترنا تھا...... گندہ نالہ آ گیا تھا ہم دونوں ناک پر رومال رکھ کر اس کے کنارے کنارے چلنے لگے!

۱۴ر جولائی ۱۹۸۶ء

عزیزی جارج فورمین

جارج فورمین نے کہا ہے کہ وہ آئندہ باکسنگ کو مسیحیت کی تبلیغ کیلئے استعمال کریں گے بک اپ فورمین!

لیکن میرے پیارے فورمین، تمہیں اس سلسلہ میں ایک دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ دشواری صرف اس قدر ہے کہ تمہارے حریف مار مار کر تمہارا ابھرکس نکال دیں گے اور تم آگے سے "اف" تک کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوگے۔ کیونکہ یسوع مسیح نے کہا ہے کہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو اپنا بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو۔ سو تم مبلغ کی حیثیت سے اپنا بایاں گال آگے کرو گے تو تمہیں تمہارا "بے دین" مدمقابل بلا تامل ایک ہاتھ جھاڑ دے گا، دایاں آگے کرو گے تو وہ ایک گھونسہ وہاں بھی جڑ دے گا اور یوں تمہارا بے رحم حریف دو منٹوں میں تمہارے "کھنے" سینک دے گا اس کے بعد شائد تم باکسنگ کو مسیحیت کی تبلیغ کیلئے استعمال نہ کر سکو

میرے پیارے جارج فورمین، تمہارے اس فیصلے کا ایک پہلو اور بھی ہے جو تمہاری نظروں سے غالباً اوجھل ہے، وہ یہ کہ تم نے اگر محبت اور امن کے پیغمبر حضرت عیسیٰ ع کی تعلیمات کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا اور دائیں گال پر گھونسہ کھانے کے بعد بایاں گال آگے کر بیٹھے، تو باقی کسر رنگ کے باہر بیٹھے ہوئے وہ تماشائی پوری کر دیں گے جنہوں نے تمہاری کامیابی کی شرطیں باندھی ہونگی، سو تم اگر رنگ میں صحیح سلامت رہے بھی، رنگ کے باہر بہر حال صحیح سلامت نہیں رہو گے۔ معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ مزید آگے بڑھے گا۔ مثلاً یہ کہ مسیحیت کی تبلیغ کیلئے گھونسے کھانے کا فنی مظاہرہ شائد تم صرف ایک ہی بار کر سکو۔ کیونکہ اس کے بعد باکسنگ کے مقابلے کرانے والے "بے دین" ادارے یا افراد آئندہ کسی مقابلے کیلئے تمہارے ساتھ رابطہ قائم نہیں کریں گے کہ وہ تبلیغی جذبے سے سرشار نہیں ہیں بلکہ مکروہات دنیا میں الجھے ہوئے لوگ ہیں۔ ان بے دینوں کی وجہ سے تم باکسنگ کے میدان سے "آؤٹ" ہو جاؤ گے اور تمہیں اپنی بقیہ زندگی مکتی فوج میں "کرنل" وغیرہ کے عہدے کے ساتھ بسر کرنا پڑے گی۔ اگر ایسا ہوا تو یہاں مبلغ بھائیوں کے ساتھ میل جول کے دوران، خدا کیلئے بھول جانا کہ تم کبھی باکسر بھی رہے ہو۔ یہ مشورہ میں اس لئے دے رہا ہوں، کہ تم باکسنگ کے دوران مبلغ بن گئے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تبلیغ کے دوران تم باکسر بن جاؤ!

لیکن جان برادر! اس گفتگو کے دوران مجھے ایک حوالہ ایسا یاد آگیا ہے، جس پر عمل پیرا ہو کر نرم بیگ۔۔ تت

مبلغ اور باکسر کے طور پر زندگی بسر کر سکتے ہو! یعنی دین دنیا دونوں میں سرخرو ہو سکتے ہو۔ یہ واقعہ ایک پادری کا ہے۔ جسے ایک شخص نے جھگڑے کے دوران تھپڑ مارا تو پادری نے یسوع مسیح کی تعلیمات کی روشنی میں اپنا بایاں گال آگے کر دیا، مد مقابل نے ایک گھونسہ بائیں گال پر بھی جڑ دیا۔ دوسرا گھونسہ کھانے پر پادری نے اپنے کپڑے جھاڑے اور بھرپور، سکون اور اطمینان سے اپنے مخالف کو پے در پے تین چار گھونسے جڑ دیئے جس پر وہ چکرا گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے کہا "پادری صاحب، مجھے آپ سے ایسے رویئے کی توقع نہ تھی آپ یسوع مسیح کا نام لیتے ہیں اور یسوع کی تعلیمات کے خلاف عمل پیرا ہوتے ہیں!" اس پر پادری نے جواب دیا "یسوع مسیح کا فرمان یہ ہے کہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا بایاں گال بھی اس کے آگے کر دو چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن یسوع نے یہ وضاحت نہیں کی کہ اس کے بعد اگر کوئی بے حیا تمہارے بائیں گال پر بھی مکہ مار دے تو تمہیں کیا کرنا چاہئے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد تم جو رویہ مناسب سمجھو اختیار کرو۔ سو میں نے اس معاملہ میں اجتہاد سے کام لیا ہے۔ اگر تمہیں زیادہ چوٹیں آئی ہوں تو میں معافی چاہتا ہوں!"

سو جارج فورمین! تمہیں بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ اگر تبلیغ اور باکسنگ ساتھ ساتھ کرنی ہے تو اجتہاد سے کام لو یعنی تمہارا حریف جب تمہیں مکہ رسید کرے تو تم اپنا گال دوسرے مکے کیلئے اس کے سامنے پیش کر دو اور اس کے بعد بھی اگر وہ تم پر اپنے ریک حملے جاری رکھتا ہے تو "خداوند" کا نام لے کر اس پر پل پڑو۔ لیکن عزیزی، اس سلسلہ میں میرا آخری مشورہ یہ ہے کہ پہلے دو مکے رضا کارانہ طور پر کھانے سے پہلے اپنے حریف کے کان میں یہ گزارش ضرور کرو کہ "برادر! ان دو مکوں کے دوران ذرا ہاتھ "ہولا" رکھنا"۔ یہ درخواست اس لئے ضروری ہے کہ پہلے دو مکوں کے دوران ناک آؤٹ ہو جانا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ جارج فورمین! تم جو مناسب سمجھو کرو!

۱۲ مارچ ۱۹۷۸ء

صاحبِ کار اور صاحبِ اقتدار

ایک وقت تھا کہ ہم سڑکوں پر پیدل پھرا کرتے تھے۔ مگر پھر ہم نے پیدل چلنا چھوڑ دیا اس کی چند وجوہ تھیں جن میں سے سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ کیڑے مکوڑے ہمارے پاؤں کے نیچے آ کر کچلے جاتے تھے جو ہم ایسے رحم دل انسان کو گوارہ نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ خود ہمیں بھی کیڑا مکوڑا ہی سمجھا جاتا تھا۔ اور ہم ایسے منصف مزاج شخص کو یہ بات اچھی نہ لگتی تھی کہ ہمیں کیڑوں مکوڑوں کے ہم پلہ قرار دے کر اس معصوم مخلوق کی دل شکنی کی جائے۔ چنانچہ ہم نے جیسے تیسے ایک سائیکل خرید لیا مگر سائیکل کے ضمن میں ایک پرابلم یہ تھی کہ چلتے چلتے اس کے کتے فیل ہو جاتے تھے' عام حالات میں اگر کتے فیل ہو جائیں تو چنداں فرق نہیں پڑتا لیکن اگر کتے پیچھے لگے ہوں' تو سائیکل والے کتوں کے "فیل" ہونے کا مطلب اصلی کتوں کا "پاس" ہونا ہے' چنانچہ ہم نے تنگ آ کر موٹر سائیکل خرید لیا' موٹر سائیکل میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں لیکن ایک برائی بہت بڑی ہے کہ جتنی قوت اس کے ایکسیلیٹر میں ہے اتنی اس کی بریکوں یا و ھیلز میں نہیں چنانچہ قوت کے اس عدم توازن کی وجہ سے ہم کئی بار موٹر سائیکل کا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور یوں راہ گیروں کو ہم پر ہنسنے کا موقع ملتا رہا جبکہ ہم کسی کو ہنستے نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ ہم نے موٹر سائیکل بھی بیچ دیا اور اس کی جگہ کار خرید لی۔

کار کے "فضائل" تو بعد میں بیان کریں گے پہلے موٹر سائیکل کے بارے میں کچھ باتیں اور کر لیں مثلاً یہ کہ ہم کسی بڑے صاحب سے ملنے اس کے بنگلے پر جاتے تھے تو وہ ہمیں معزز شخص سمجھ کر ہماری آؤ بھگت کرتا' چائے پلاتا اور پھر اپنے ملازم کو بلا کر کہتا کہ باہر ان کے ڈرائیور کے لئے بھی چائے لے جاؤ بس یہ موقع ایسا تھا کہ ہمارے ہاتھوں پاؤں پھول جاتے مگر ہم اپنے حواس پر قابو پا کر بمشکل اسے اس بات کے قائل کرتے کہ ڈرائیور کے لئے چائے بھجوانے کی چنداں ضرورت نہیں' اس سے لوگوں کے معدے اور دماغ خراب ہو جاتے ہیں تاہم اصل مسئلہ اس وقت پیش آتا جب وقت رخصت یہ صاحب اصرار کرتے کہ میں آپ کو کار تک چھوڑ کر آؤں گا۔ اور آگے کار کی بجائے موٹر سائیکل اپنا بھاڑ سا منہ کھولے کھڑا ہوتا۔ یہ موٹر سائیکل ایک کک میں اسٹارٹ ہو جاتا تو بھی شرمندگی کا وقفہ کم ہو سکتا تھا' مگر اس بدبخت کو تو دھکے دینا پڑتے تھے ان سب مراحل سے گزرنے کے بعد صاحب لوگوں کی نظروں میں ہماری جو عزت رہ جاتی اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں' بس صاحب لوگوں کی نظروں میں اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ہمیں کار خریدنا پڑی اور بحمد اللہ اب ہم صاحب عزت ہوں نہ ہوں صاحب کار ضرور ہیں!

اور اب سچی بات یہ ہے کہ جتنی خوشی ہمیں کار خرید کر ہوئی اس کا ہمیں پہلے سے کوئی اندازہ ہی نہیں تھا۔ سائیکل یا موٹر سائیکل پر ہوتے تھے تو ہمیں کتوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ چنانچہ ہم انہیں دیکھ کر ادھر ادھر ہو جاتے تھے اب کتے ہمیں دیکھ کر ادھر اُدھر ہو جاتے ہیں کار خریدنے کے بعد سے ایک عجیب طرح کا اعتماد ہم میں پیدا ہوا ہے۔ پہلے ہم ہر راہ چلتے شخص کو سلام کیا کرتے تھے' اب ہم انہیں سلام کا موقع دینے کے لئے انتظار کرتے ہیں اور پھر جواب میں صرف گردن ہلا دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے سلام وصول پایا' بلکہ اب تو ہماری خود اعتمادی کا یہ عالم ہے کہ سڑک پر خواہ کتنا ہی رش ہو اور ہمیں روکنے کے لئے لال پیلے کتنے ہی بورڈ کیوں نہ لگے ہوں' ہم ان سب کو کراس کرتے ہوئے گزرتے چلے جاتے ہیں کہ جانتے ہیں یہ قوانین کن لوگوں کے لئے ہوتے ہیں۔ جن دنوں ہمارے پاس سائیکل یا موٹر سائیکل ہوتا تھا بارش کے دوران ہم پر ہسٹریا کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ کیونکہ کاروں میں بیٹھے ہوئے لوگ ہم پر کیچڑ اچھالتے ہوئے گزر جاتے تھے' حالانکہ اب ہم سوچتے ہیں تو ہمیں ان کی یہ حرکت بہت معصوم سی لگتی ہے۔ چنانچہ بارش کے دوران ہم بطور خاص گھر سے نکلتے ہیں اور اپنی یہ معصوم سی خواہش پوری کرتے ہیں۔ بعض معلمین اخلاق اپنے کالموں میں اکثر یہ بات دہراتے ہیں کہ اگر کار میں بیٹھے لوگ بس اسٹاپوں پر کھڑے لوگوں کو اپنی کاروں میں لفٹ دینے کے سلسلے کا آغاز کریں تو اس سے ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے' ہمارے نزدیک یہ بات ٹھیک نہیں کیونکہ اس سے کئی اور مسائل پیدا ہو جاتے ہیں خود ہم نے ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل کرنے کی نیت سے بس سٹاپوں پر کھڑے کچھ لوگوں کو لفٹ دینے کی کوشش کی مگر بس اسٹاپوں پر کھڑے کچھ معلمین اخلاق ہی کی وجہ سے بڑے پیچیدہ قسم کے مسائل پیدا ہو گئے۔ لاحول ولاقوۃ اب ہم نے اس نوع کے سماجی کاموں میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دی ہے۔

کار کی خریداری کے بعد سے اب تک کے دلی تاثرات تو ہم نے لگی لپٹی رکھے بغیر بیان کر دیئے ہیں' تاہم کچھ باتوں کے بیان میں ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی ہے اور یہ باتیں دراصل وہ خواہشات ہیں جو ان دنوں ہمارے دل میں پیدا ہو رہی ہیں مثلاً سڑک پر جاتے ہوئے کاروں کے ہجوم میں کچھ کاریں ایسی بھی نظر آتی ہیں' جن پر نمبر پلیٹ کی بجائے موٹے موٹے لفظوں میں ایم پی اے یا ایم این اے لکھا ہوتا ہے یعنی باادب باملاحظہ ہوشیار عوام کے نمائندے آ رہے ہیں۔ ٹریفک پولیس منہ نہ لگے عوام کے نمائندے آ رہے ہیں۔ حکومت کی کوئی ایجنسی راستہ نہ روکے عوام کے نمائندے آ رہے ہیں بس ان عوام کے نمائندوں بلکہ "نمیندون" کو دیکھ کر ہمارا جی بھی چاہتا ہے کہ چالیس پچاس لاکھ روپے خرچ کر کے اسطرح کی پلیٹ ہم بھی اپنی کار پر لگوائیں' پیسوں کا کیا ہے ایک دفعہ یہ پلیٹ لگ جائے پیسے خود بخود پورے ہو جائیں گے۔ اسی طرح بسا اوقات سڑک پر چلنے والا سارا ٹریفک روک دیا جاتا ہے۔ اور پھر کوئی کار سائرن والی جیپ اور موٹر سائیکلوں کے جلو میں چلتی ہوئی زن سے برابر سے گزر جاتی ہے' بس اسطرح کی کاریں ہیں جنہیں دیکھ کر ہمیں اپنا سائیکل کا زمانہ یاد آ جاتا ہے جب ہمیں خود پر کوئی کیڑا مکوڑا ہونے کا گمان گذرتا تھا۔ انسان اگر صاحب اقتدار نہ ہو تو کار "ایک بے کار بے معنی" سی چیز لگنے لگتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

جو لوگ ڈاکٹر سلیم اختر کو ذاتی طور پر نہیں جانتے بلکہ انہیں صرف ان کی تحریروں کے حوالے سے جانتے ہیں وہ میری یہ تحریر پڑھ کر بہت حیران ہوں گے کیونکہ جب میں پہلی دفعہ ڈاکٹر صاحب سے ملا تو خاصا حیران ہوا۔ حیرانگی کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ان کی کتاب " عورت جنس اور جذبات " کچھ افسانے اور کچھ تحلیل نفس والے مضامین پڑھ رکھے تھے۔ سو میں ڈاکٹر صاحب کی بھولی بھالی شکل دیکھتا تھا اور سوچتا تھا کہ یہ سب کچھ واقعی اس شخص نے خود لکھا ہے؟ یہ حیرانی اس وقت اور بڑھی جب ڈاکٹر صاحب سے واقفیت دوستی میں بدل گئی اور پتہ چلا کہ موصوف عورت جنس اور جذبات کے حوالے سے جو کچھ بھی لکھتے ہیں بس اپنے علم، مشاہدے اور زور قلم کے بل بوتے پر لکھتے ہیں ورنہ عملی طور پر اتنے بھلے مانس ہیں کہ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔ میں معافی چاہتا ہوں کہ انہوں نے اپنی جو ریپوٹیشن ایک طویل عرصہ کی ریاضت کے بعد بنائی تھی میں اسے بیٹھے بٹھائے " خراب " کر رہا ہوں مگر کیا کیا جائے۔ اصل صورتحال یہی ہے کہ جس طرح ریاض خیر آبادی مرحوم نے ساری عمر شراب کی شکل نہیں دیکھی مگر ساری شاعری شراب کے حوالے سے کی کچھ یہی حال ہمارے سلیم اختر کا بھی ہے موصوف کم از کم گذشتہ ربع صدی سے اتنے سلیم الطبع ہو گئے ہیں کہ اب آئندہ کے لئے بھی ان سے کوئی توقع قائم نہیں کی جا سکتی اور یوں ہم انہیں بآسانی نقادوں اور افسانہ نگاروں کا ریاض خیر آبادی کہہ سکتے ہیں۔ ان سطور میں میں نے ڈاکٹر سلیم اختر کی شرافت اور بھلے مانسی کا اتنا ڈھنڈورا پیٹ دیا ہے کہ خود گھبرا گیا ہوں حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ وہ اپنی حدود و قیود سے بخوبی واقف ہیں اور جہاں تک ان کی حدود کا تعلق ہے وہ وہاں ختم ہو جاتی ہیں جہاں سے " حدود " شروع ہوتی ہیں۔

خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، پہلے میں آپ کو یہ بتا تا چلوں کہ میں نے اپنے دوستوں میں ڈاکٹر صاحب سے زیادہ سگھڑ شخص اور کوئی نہیں دیکھا۔ مجال ہے ہوٹل بازی پر وقت اور پیسہ ضائع کریں اس کی بجائے وہ اپنا وقت گھر پر گزارتے ہیں، چنانچہ اس طرح جو وقت بچتا ہے وہ اس میں تنقید، افسانہ اور طنز و مزاح لکھ کر ادب میں نام کماتے ہیں اور جو پیسہ بچتا ہے اس سے گاہے گاہے دوستوں کی پر تکلف دعوت اپنے گھر پر کرتے ہیں، حالانکہ اگر وہ چاہیں تو یہ ترتیب الٹ بھی ہو سکتی ہے یعنی جو وقت بچے اس میں پیسہ کمایا جائے اور جو پیسہ کمائیں اسے ڈاکٹر وزیر آغا کی طرح ادب میں نام کمانے کے لئے انویسٹ کر دیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ مشورہ اب خاصا بعد از وقت ہے کیونکہ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ سات برس کی عمر تک بچے کی شخصیت مکمل ہو جاتی ہے اس کے بعد ساری

عمر اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آتی، بس چھوٹی چھوٹی "آئینی" اور "غیر آئینی" ترمیمیں ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ میرے خیال میں سلیم اختر کو بدلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے کیونکہ سلیم اختر کی شکل میں جو چیز بن گئی ہے وہ اتفاق سے اچھی چیز ہے۔ لہٰذا اسے جوں کا توں رہنے دینا چاہئے، ورنہ ترمیمات سے اس کی شکل بھی ۱۹۷۳ء کے آئین جیسی ہو سکتی ہے۔

سلیم اختر کی ایک خصوصی صفت تو میں نے ابھی تک بیان ہی نہیں کی اور وہ دوستوں سے ان کی محبت ہے وہ دوستوں کو ان کی خامیوں سمیت قبول کرتے ہیں، بلکہ میرے جیسے دوستوں کی موجودگی میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ خامیوں کو دوستوں سمیت قبول کرتے ہیں۔ ان کی دوستی کا صرف ایک معیار ہے کہ "مدمقابل" پر خلوص ہونا چاہئے چنانچہ جب انہیں اس کے خلوص کا یقین ہو جاتا ہے تو پھر اس کے سات خون معاف کر دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ذاتی دوستی میں نظریات کو بھی آڑے نہیں آنے دیتے اور یوں احمد ندیم قاسمی سے لے کر ڈاکٹر وحید قریشی تک ان کے دوستوں یا یوں کہہ لیں کہ بزرگ دوستوں میں شامل ہیں۔ سلیم اختر کی دوستی کا دائرہ جتنا وسیع ہے مجھے یقین ہے کہ وہ اگر آئندہ الیکشن میں کھڑے ہوں تو ان کے مخالف کی ضمانت ضبط ہو جائے ممکن ہے یہ سطور پڑھتے ہوئے سلیم اختر الیکشن میں کھڑے ہونے کے بارے میں واقعی سنجیدہ ہو جائیں اگر ایسا ہو تو انہیں اپنا انتخابی نشان سائیکل منتخب کرنا چاہئے، کیونکہ اب لاہور میں سائیکلوں والے ادیب بس دو چار ہی رہ گئے ہیں! ان میں سے سلیم اختر اور سائیکل تو لازم و ملزوم ہیں بلکہ صبح سے شام تک وہ جتنی سائیکل چلاتے ہیں اس کے مطابق سلیم اختر اور سائیکل کو لازم و ملزوم نہیں بلکہ ظالم و مظلوم قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہر حال اگر ڈاکٹر صاحب ہماری ان چکنی چپڑی باتوں میں آجائیں یعنی الیکشن میں کھڑے ہونے کا واقعی پروگرام بنالیں تو ان سے ہماری ایک گذارش بھی ہے اور وہ گذارش یہ ہے کہ وہ لاہور سے اسلام آباد تک دو چار دفعہ سائیکل پر آئیں جائیں اور پھر ہمیں حتمی طور پر بتائیں کہ الیکشن واقعی ہو رہے ہیں کہ نہیں؟ الیکشن کے بارے میں ہم نے شبہے کا اظہار اس لئے کیا ہے کہ الیکشن اور ایف اے کے امتحان کی مجوزہ تاریخیں ایک ہی ہیں جس سے ایف اے کے امتحانات متاثر ہو سکتے ہیں اور ہماری حکومت تعلیم کو جتنی اہمیت دیتی ہے اس سے ہمیں خدشہ ہے کہ کہیں وہ امتحان کے پیش نظر انتخابات ملتوی نہ کر دے کہ علم کی فضیلت تو جگہ جگہ بیان ہوئی ہے ان موئے مغربی انتخابات کا ذکر کہیں نہیں آیا۔

دوستوں سے سلیم اختر کی محبت کے حوالے سے ایک بات بتانے کی یہ بھی ہے کہ آج کے دور میں ایسے شخص کو منافق کہا جاتا ہے، جو ہر ایک کا دوست ہو چنانچہ اصغر ندیم سید ایسے پیارے دوست کے بارے میں یار لوگ کیسی بری بری باتیں کرتے ہیں اور لگتا ہے کہ سلیم اختر کو یہ الزام گوارا نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی صورت میں اپنا ایک دشمن ڈھونڈا کہ جس کی مخالفت اور جس سے مخالفت بہر حال معنی رکھتی ہے ورنہ یار لوگ تو اتنے "نکھد" قسم کے دشمن پالتے ہیں کہ اس سے بہتر ہے آدمی بغیر دشمن کے زندگی گزار دے، سو ڈاکٹر سلیم اختر نے ڈاکٹر وزیر آغا سے دشمنی بھی کیا وضعداری سے نبھائی ہے مجال ہے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش آئی ہو اور یوں ہمارے نزدیک ان کی ادھوری شخصیت مکمل ہو گئی ہے اب سنا ہے کہ مشفق خواجہ ان دنوں ڈاکٹر

وزیر آغا اور سلیم اختر کے مابین صلح کروانے کے درپے ہیں۔ سبحان اللہ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے مگر مشفق خواجہ کو چاہئے کہ وہ اس دوران سلیم اختر کے لئے کسی متبادل دشمن کا انتظام ضرور کر دیں۔ اگر چہ ہم ایسے دوست کے ہوتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر کو کسی دشمنی کی ضرورت نہیں مگر پھر بھی احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے۔

سلیم اختر کے دوستوں اور دشمنوں کا ذکر چھڑا ہے تو یہاں ڈاکٹر طاہر تونسوی کا ذکر ناگزیر ہو گیا ہے۔ طاہر تونسوی سلیم اختر کا شاگرد عزیز ہے اور یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں ایک دوسرے کو اون کرتے ہیں۔ ورنہ فی زمانہ استاد اور شاگرد مارکہ نکلی کے علاوہ استاد اور شاگرد میں اتنا قریبی رشتہ کہاں دیکھنے میں آتا ہے طاہر تونسوی اپنے استاد سے ملنے کے لئے ملتان سے چل کر لاہور آتا ہے اور اس کا سانس جس طرح پھولا ہوتا ہے لگتا ہے پیدل چل کر آیا ہو اور پھر وہ جتنے دن بھی لاہور میں قیام پذیر ہو اپنے استاد کی خدمت میں مسلسل متواتر حاضر رہتا ہے کہ وہ سلیم اختر کا شاگرد بھی ہے دوست بھی ہے اور بیٹا بھی ہے یہاں "بھائی" کا لفظ میں نے دانستہ نہیں لکھا کیونکہ ایک دفعہ روس کے ایک بڑے لیڈر نے چیکوسلواکیہ کے ایک لیڈر سے بہت پیار بھرے انداز میں پوچھا کہ تم روسیوں کو اپنا دوست سمجھتے ہو کہ بھائی؟ چیک لیڈر نے جواب دیا کہ روسی ہمارے بھائی ہیں کیونکہ دوست تو انسان اپنی مرضی سے بناتا ہے! بہر حال طاہر تونسوی بھی سادہ لوحی کی حد تک مخلص آدمی ہے اور مجھے استاد اور شاگرد میں اگر کوئی قدر مشترک نظر آتی ہے تو وہ یہی خلوص ہے۔

باتوں باتوں میں، میں سلیم اختر کا سراپا بیان کرنا تو بھول ہی گیا۔ پچاس کا سن اور اس کے باوجود سر پر پورے بال، چاہے گن کر پورے کر لیں۔ سانولا رنگ، کتابی چہرہ، چہرے پر عینک جو انہیں متکلف بنانے کی بجائے ان کی شخصیت کو مزید باوقار بناتی ہے۔ دوران گفتگو کھلکھلا کر ہنستے ہیں اور اچھے لگتے ہیں۔ کالج یا تقریبات میں جاتے وقت گرمیوں میں پینٹ، بوشرٹ اور سردیوں میں سوٹ میں ملبوس ہوتے ہیں۔ جبکہ گھر میں اور علامہ اقبال ٹاؤن کے جہانزیب بلاک میں ہوائی چپل، دھاری دار پاجامہ اور تنگ چولی جیسی ایک قمیص پہن کر پھرتے ہیں۔ اس میں سے نیلے رنگ کا دھاری دار پاجامہ تو اب ان کا "ٹریڈ مارک" بن گیا ہے، کیونکہ قمیص کا رنگ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مگر پاجامہ وہی رہتا ہے۔ میرا بیٹا علی کوٹھی کے مین گیٹ کے پاس بیٹھ کر اس کی سلاخوں میں سے باہر گلی میں بلونگڑوں کی طرح جھانکتا رہتا ہے۔ چنانچہ اسے ان سلاخوں میں سے کوئی دھاری دار پاجامہ نظر آجائے تو وہ دوڑا دوڑا اندر آتا ہے اور اپنی توتلی زبان میں کہتا ہے "ابو! انکل سلیم اختر آئے ہیں" اور اس کی اطلاع ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ اب فیکٹری والے یہ کپڑا صرف سلیم اختر کی سرپرستی کی وجہ سے بنا پاتے ہیں اور غالباً یہ خاصا نادر کپڑا ہے کیونکہ میں نے کئی ماڈرن گھرانوں کے ڈرائنگ روم میں اس ڈیزائن کے کپڑے کو بطور ڈیکوریشن پیس دیواروں پر چسپاں دیکھا ہے۔

میں نے اپنے مضمون کا آغاز ڈاکٹر صاحب کی کچھ اور نوع کی تحریروں کے حوالے سے کیا تھا اور اب اختتام بالکل کچھ اور نوع کی تحریروں کے حوالے سے کرنا چاہتا ہوں، ڈاکٹر سلیم اختر غالباً بائیس کے قریب انتہائی وقیع کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ان کی مقبول زمانہ کتاب "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" بھی شامل ہے جس

کے کتنے ہی ایڈیشن اب تک فروخت ہو چکے ہیں تاہم صرف اقبالؒ پر ان کی نو کتابیں موجود ہیں جن میں سے دو کتابیں ان کی تصنیف ہیں اور سات ترجمہ و تالیف کی ذیل میں آتی ہیں یوں ڈاکٹر سلیم اختر صرف نفسیاتی نقاد، ناول نگار، افسانہ نگار اور مزاح نگار ہی نہیں، باقاعدہ ماہر اقبالیات بھی ہیں۔ سلیم اختر ہمارے ملک کے ان چند دانشوروں میں سے ہیں جن کا سچ مچ علم ہی اوڑھنا اور بچھونا ہے میں انہیں کئی دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ دانشوری کے لئے اتنا پڑھنا اور خصوصاً لکھنا تو بالکل ضروری نہیں کیونکہ دانشور وہ ہوتا ہے جس کی کوئی تصنیف نہ ہو، ویسے بھی دوسروں پر علم کا رعب ڈالنے کے لئے بازار میں بک آف کوٹیشنز قسم کی بے شمار کتابیں ملتی ہیں جن میں سے کوٹیشن یاد کر کے دوسروں کو اور کچھ نہیں تو بوجھوں ضرور مارا جا سکتا ہے بلکہ ستار طاہر نے بھی انہیں یہ بات سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر موصوف کسی کی سنتے ہی نہیں، بس ہر وقت پڑھنے میں لگے رہتے ہیں، پھر اپنے سلیم اختر کی ایک بات مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ ان کی بات سمجھ میں کیوں آتی ہے؟ صرف سمجھ ہی میں نہیں آتی بلکہ دل پر گہرا اثر بھی کرتی ہے۔ چنانچہ وہ ناول لکھ رہے ہوں، افسانہ لکھ رہے ہوں یا تنقید لکھ رہے ہوں پڑھنے والا اس میں محو ہو کر رہ جاتا ہے حالانکہ کم از کم تنقید تو انسان کو ایسی لکھنی چاہئے کہ قاری کو جاگتے رہنے کے لئے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک لوٹا پانی کا سر پر ڈالنا پڑے، بہر حال یہ ڈاکٹر سلیم اختر کا داخلی معاملہ ہے اور شرفاء دوسروں کے داخلی معاملات میں دخل نہیں دیا کرتے۔

اور اب آخر میں میں نے ڈاکٹر صاحب کو چند ضروری مشورے دینے ہیں جن میں سے سب سے اہم مشورہ یہ ہے کہ گو ڈاکٹر صاحب کی عمر کے تیس سال بہترین خدمت کی بہترین مثال ہیں مگر یہ بات رجسٹر کروانے کے لئے لمبی چوڑی پبلسٹی کی ضرورت ہوتی ہے اپنے ساتھ شامیں منوانا پڑتی ہیں لکھنا پڑھنا ترک کرنا پڑتا ہے۔ دوستوں دشمنوں پر نظر ثانی کرنی پڑتی ہے مگر ڈاکٹر صاحب ان میں سے کوئی کام بھی کرنے کو تیار نہیں ہیں کیونکہ علمی ادبی حلقے ادب میں ان کی بڑائی کو تسلیم کر چکے ہیں اور غیر علمی و ادبی حلقوں کو ڈاکٹر صاحب اپنے حلقہ انتخاب میں تصور ہی نہیں کرتے۔ سلیم اختر اپنے دور جاہلیت میں شاعری بھی کرتے رہے ہیں اور سلیم اختر انجان کے نام سے چھپتے رہے ہیں اب وہ صرف سلیم اختر کہلاتے ہیں مگر کچھ معاملات میں وہ اب تک "انجان" ہیں جن میں سے ایک کا بیان ابھی ہو چکا ہے اور خدا کرے کہ وہ انجان ہی رہیں یہ ہمارا مشورہ بھی ہے اور دعا بھی ہے۔

———

ان ہاتھوں سے

"بہت افسوس ہوا تمہارے دوست جیرے پہلوان کی وفات کا سن کر' بہت پیارا آدمی تھا!"

"ان ہاتھوں سے نہایا ہے جی اے۔ ایک ہی تو اپنا دوست تھا' آج کل ایسے دوست کہاں ملتے ہیں؟"

"اسے ہوا کیا تھا؟"

"ہونا کیا تھا' بالکل ٹھیک ٹھاک تھا' ایک دن پہلے اکھاڑے میں اس کے ساتھ زور کیا' کیسے کیسے استادی "دا" اس نے سکھائے' مگر اگلے دن پتہ چلا کہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ان ہاتھوں سے نہایا ہے جی اے۔ اللہ کے کاموں میں کسے دخل ہے!"

"لیکن ہوا کیا تھا اسے؟"

"ہونا کیا ہے جی' اکھاڑے میں ہم زور کرنے گئے ابھی پنڈے پر مٹی نہیں ملی تھی کہ کہنے لگا سینے میں درد ہو رہا ہے' میں نے کہا زور کرو' پنڈا کھل جائے گا۔ اس نے ڈنڈ نکالنے کی کوشش کی' دو ہی ڈنڈ نکالے تھے کہ سانس ٹوٹنے لگا' باؤ ارشد اس وقت پاس ہی تھا' وہ اسے سکوٹر پر بٹھا کر ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر ابھی ٹوٹی لگا کر دیکھ ہی رہے تھے کہ اس کا دم نکل گیا۔ نالائق ڈاکٹر ہیں جی! اپنی نالائقی پر پردہ ڈالنے کے لئے کہنے لگا "ہارڈ" اٹیک ہوا ہے!"

"جیرا پہلوان سگریٹ وغیرہ تو نہیں پیتا تھا؟"

"نہیں جی' اس نے تو کبھی خالی سگریٹ کو ہاتھ تک نہیں لگایا!"

"کیا مطلب؟"

"زبندہ تھا جی' بھرا ہوا سگریٹ پیتا تھا۔ اوہو!!! کتنی خوبیوں والا یار تھا میرا۔ خدا ترس اتنا کہ کسی کی تکلیف دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہفتہ پہلے وہ ٹیکس وصول کرنے کاکا سگریٹ فروش کے کھوکھے پر گیا ہے' کاکا سگریٹ فروش جیرے کے پاؤں پڑ گیا کہ روزوں کی وجہ سے اس کی بکری آدھی رہ گئی ہے' گھر میں بچے بھوکے بیٹھے ہیں' خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ یہ سن کر جیرے پہلوان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' اسے اٹھا کر سینے سے لگایا اور کہا دل چھوٹا نہ کر کاکے۔ آج اگر پیسے نہیں ہیں تو کل ادا کر دینا تم پر بے اعتباری تھوڑے ہی ہے!"

"یہ جیرا پہلوان غنڈہ ٹیکس بھی لیتا تھا؟"

"نہیں جی نہیں' میرا یار غنڈہ نہیں تھا جی' وہ تو غریب پرور تھا۔ وہ ان جیبیں کاٹنے والے دکانداروں

سے جرمانہ وصول کرتا تھا اور آگے غریبوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ آدھی ہیرا منڈی اس سے پلتی تھی۔ بڑا خوبیوں والا یار تھا میرا..... مگر بے وفائی کر گیا ساتھ چھوڑ گیا' ان ہاتھوں سے نہایا ہے جی اسے!"

"میں نے سنا ہے اس کی ماں بہت روتی ہے"

"ماں نے نہیں رونا تو اور کس نے رونا ہے جی..... اور پھر پہلوان ماں کا فرمانبردار بھی بہت تھا' جو کماتا تھا' اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا تھا' ماں بھی اتنے نصیبوں والی تھی کہ جس روز وہ ماں کی شکل دیکھ کر گھر سے نکلتا' اس کے سارے کام خود بخود ہوتے چلے جاتے' پولیس نے اسے مفرور قرار دیا ہوا تھا' مگر وہ پولیس کے سامنے سے گزر جاتا اور انہیں نظر نہ آتا!"

"پولیس نے اسے مفرور قرار دیا ہوا تھا؟ وہ کیوں؟"

"بڑا جی دار یار تھا میرا..... دو چار بندے "لاء" دیئے تھے اس نے' بس اس کے بعد پولیس اس کے پیچھے تھی۔ پولیس کے ہاتھ نہیں آیا جی۔ ڈاکٹروں کی نالائقی سے مر گیا۔ کیسا کڑیل جوان تھا میرا یار۔ پھٹے پر کیسے شیر کی طرح پڑا ہوا تھا۔ ان ہاتھوں سے نہلایا ہے جی اسے!"

"میں نے سنا ہے اسے اپنی بہنوں سے بھی بہت محبت تھی"

"محبت تو کوئی لفظ ہی نہیں ہے جی۔ عشق تھا اسے عشق۔ مگر اس کے باوجود بڑا رعب تھا اس کا' گھر میں داخل ہوتا تو وہ کمروں میں چھپتی پھرتیں۔ پورے محلے میں کسی نے ان کی جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ پہلوان کی زندگی میں انہوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا' ان کی ضرورت کی چیزیں ماں بازار سے خرید کر لا دیتی تھی!"

"اب کیا حال ہے ان بچاریوں کا؟"

"بھائی کی موت کا انہیں اتنا صدمہ ہوا کہ دیوانگی کی حالت میں گھر سے نکل گئیں۔ آج تک ان کا سراغ ہی نہیں مل سکا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ کپڑا لتا بھی ساتھ لے گئیں' ورنہ اللہ جانے ان معصوموں کا کیا حال ہوتا! نہ ایسی باتیں چھیڑیں باؤ جی' میرا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے' میرا یار اس وقت قبر میں بے چین ہو رہا ہو گا' کیسا کڑیل جوان تھا' اس کے نام کی دہشت سے لوگ کانپتے تھے۔ لیکن مرنے کے بعد کیسی بے بسی کے عالم میں پھٹے پر پڑا ہوا تھا۔ اپنے ان ہاتھوں سے اسے نہایا ہے جی!"

"مرحوم کی بیوہ کا کیا حال ہے؟"

"جیرا پہلوان اپنا یار تھا جی اور یاریاں زندگی تک نہیں' مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہیں' اپنی اس بیوی کے ساتھ اس نے چند مہینے پہلے شادی کی تھی جب یہ اسے اٹھانے گیا ہے تو.....

"اٹھانے گیا ہے؟"

"ہاں جی' لڑکی کے گھر والے نہیں مانتے تھے' تو جب یہ اسے اٹھانے گیا ہے جی تو میں بھی اس کے ساتھ تھا' اٹھانا ہم نے اسے کیا تھا جی' وہ خود ہی اچک کر جیپ میں بیٹھ گئی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اس کے نصیب پھوٹ

جائیں گے!"

"ہاں' یہ تو اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا!"

"مگر جی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے ہوتے ہوئے میرے یار کی بیوہ ساری عمر روتے گزار دے' میں ایک مہینہ پہلے اس کی خیر خیریت پوچھنے اس کے گھر گیا' دیکھا تو گھر میں کھانے کو بھی کچھ نہیں تھا' جیرا پہلوان جو کماتا تھا' لٹا دیتا تھا مجھ سے اپنے یار کی بیوہ کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی' میں نے اسے اسی وقت نکاح کا پیغام دیا' اب وہ میرے گھر کی مالک ہے جی"۔

"تو جیرے پہلوان کا کوئی بچہ وچہ نہیں تھا"

"بچارا اس معاملے میں بدنصیب تھا' اس نے بڑے علاج کرائے مگر بچہ کہاں سے ہونا تھا جی ان ہاتھوں سے نہلایا ہے جی اسے"۔

۱۵ جون ۱۹۸۶ء

بیمارِ محبّت

ان دنوں ہمارے ایک دوست تازہ تازہ اسیر محبت ہوئے ہیں، گذشتہ روز صبح صبح ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے "میں شدید طور پر محبت میں مبتلا ہو گیا ہوں، مجھے نصیحت کرو" ہم نے جواب میں انہیں یہ شعر سنایا۔

میں آج بھی بھولا نہیں آدابِ جوانی
میں آج بھی اوروں کو نصیحت نہیں کرتا

کہنے لگے "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، یہ تو تم الٹا مجھے "اُشکل" دے رہے ہو"

ہم نے کہا "چلو تم یہی سمجھ لو، مگر تم اچھے عاشق ہو کہ چارہ ساز اور غم گسار ڈھونڈنے کی بجائے ناصح تلاش کر رہے ہو"

بولے "تم نے کبھی محبت کی ہے؟"

ہم نے کہا لاحول ولا قوۃ، بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کا سوال ہے"۔

ہمارا یہ جواب سن کر ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور کہنے لگے "تمہیں استاد اور کالم نگار ہونے کی بجائے ڈپلومیٹ ہونا چاہئے تھا"

ہم نے عاشق زار کی اس ڈپلومیٹک تعریف کا شکریہ ادا کیا اور کہا "تمہاری مہربانی ہے مگر یہ بتاؤ کہ تمہیں نصیحت کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے؟"

کہنے لگے "میں ایک دنیادار آدمی ہوں اور دنیادار ہی رہنا چاہتا ہوں مگر محبت نے سود و زیاں سے غافل کر دیا ہے"

ہم نے کہا "یہ تو بہت اچھی بات ہے"

بولے "خاک اچھی بات ہے، تم پوری بات تو سن لو"

ہم نے کہا "سناؤ اور دل کھول کر سناؤ میں ہمہ تن گوش ہوں میں گفتگو کے دوران مداخلت نہیں کروں گا"

یہ سن کر ان کی آنکھوں میں ممنونیت کے آثار نمایاں ہوئے اور کہنے لگے "میں اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھنے لگا ہوں میرا مذاق نہ اڑانا، بات یہ ہے کہ اب میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا شام کو سیلز مین دن بھر کی آمدنی کا حساب دیتا ہے تو میرا دھیان اس حساب کتاب کی طرف نہیں ہوتا۔ سیلز مین کو میری عدم دلچسپی کا اندازہ

ہو گیا ہے چنانچہ مجھے خدشہ ہے کہ وہ گڑبڑ کر رہا ہے یا گڑبڑ کرے گا"۔

ہم نے کہا "یہ تو بہت بری بات ہے' کاروبار تباہ ہوا تو محبوب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے' تم نے میر تقی میر کا یہ شعر نہیں سنا۔

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میر
کس بھروسے پہ آشنائی کی

یہ شعر سن کر ہمارے دوست نے خشمگیں نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور کہا "تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں میر کے محبوب کی بات نہیں کر رہا"

اس پر ہم نے پوچھا "تو پھر کس کی بات کر رہے ہو؟"

بولے "میں عاشق ہوں پاگل نہیں کہ تمہیں اس کا نام اور پتہ بتاؤں"

ہم نے کہا "چلو دفعہ کرو' تم اپنی کیفیات بتا رہے تھے!"

بولے "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرا جی اب کسی کام میں نہیں لگتا صرف یہی نہیں بلکہ نیم دیوانگی کی کیفیت میں ہوں' سارا سارا دن اور ساری ساری رات محبوب ہی کے دھیان میں گزرتی ہے۔ اسی کو سوچتا رہتا ہوں اس کی عدم موجودگی میں اسی سے باتیں کرتا رہتا ہوں' بس ہر وقت گم سم سا رہتا ہوں اور یوں دنیا کی تمام نعمتوں سے محروم ہو گیا ہوں"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ دوست جن کے ساتھ گھنٹوں گپ بازی کی محفلیں ہوتی تھیں اب میں ان محفلوں میں اجنبیوں کی طرح بیٹھا ہوتا ہوں' اپنی دلی کیفیت چھپانے کے لئے ہنستا ہوں' حالانکہ مجھے پتہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس بات پر ہنس رہے ہیں' چنانچہ کئی دفعہ تو کسی غلط موقع پر ہنس بیٹھتا ہوں جس پر بہت لعن طعن ہوتی ہے تمہیں پتہ ہے مجھے اچھے کپڑے پہننے کا بھی شوق تھا لیکن اب یہ صورتحال ہے کہ محبوب سامنے نہ ہو تو کچھ پہننے کو جی نہیں چاہتا"

"کچھ نہ کچھ بہرحال پہن لینا چاہئے کہ کوئی آ ہی جاتا ہے!"

اس پر ہمارے یہ دوست ایک بار پھر ناراض ہوئے' مگر تھوڑی ہی دیر بعد پھر نارمل ہو گئے "اور تمہیں پتہ ہے کہ میری جمالیاتی حس کی بڑی دھومیں ہوتی تھیں مگر اب صورتحال یہ ہے کہ میری آنکھوں کو کوئی جچتا ہی نہیں ہے"

"یہ بھی اچھی بات ہے ورنہ اپنی جمالیاتی حس کی بدولت ایک روز تم نے حدود آرڈیننس کے تحت پکڑے جانا تھا"

"میں نے تمہیں شروع ہی میں کہا تھا کہ میرا مذاق نہ اڑانا' خیر تمہیں ان جذبوں کا کیا پتہ' میں کہہ رہا تھا کہ کسی ایک کا ہو کر رہنے سے مجھے وحشت سی ہونے لگی ہے کیونکہ لگتا ہے میں اندھا اور بہرہ ہو گیا ہوں اب یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے"

"ہاں یہ تو واقعی اچھی بات نہیں کہ انسان اندھا اور بہرا ہو کر رہ جائے"

"لیکن اصل بات جس کے لئے میں آج تمہارے پاس آیا ہوں' وہ یہ کہ تم شاعر لوگ محبت میں گرفتار لوگوں کے لئے "بیمار محبت" کا لفظ استعمال کرتے آئے ہو اور مجھے یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ محبت تو ایک لطیف جذبہ ہے' یہ تو انسان کو خوشیاں دیتا ہے تو پھر اردو شاعری میں عاشقوں کو بیمار محبت کیوں کہا جاتا ہے' اب خود عشق کیا ہے' تو بات سمجھ میں آئی ہے' کیونکہ میں اس دن سے خود بیمار رہنے لگا ہوں"

"لاحول ولا قوۃ "بیمار محبت" کا مطلب سچ مچ بیمار ہونا نہیں ہے"

"بیمار محبت" کا سو فیصد مطلب یہی ہے جو میں نے تم کو بتایا ہے کیونکہ کسی عاشق کے صحت مند ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ طبی اصولوں کے مطابق کھانا پوری یکسوئی کے ساتھ نہ کھایا جائے تو وہ ہضم نہیں ہوتا اور اگر کھانا ہضم نہ ہو تو اس سے انسان کا پورا جسم متاثر ہوتا ہے۔ جبکہ عاشق کھانا کھاتے ہوئے بھی اپنے محبوب کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے جس سے اس کا نظام ہضم اپ سیٹ ہو جاتا ہے اور یوں اسے گونا گوں عوارض لاحق ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عاشقوں کو "بیمار محبت" کہا جاتا ہے"۔

ہم ابھی تک اپنے دوست کی باتیں سنتے ہوئے حتی المقدور جملے بازی سے گریز کر رہے تھے کہ کہیں اس کی دل آزاری نہ ہو' مگر اس مقام پر پہنچ کر ہماری ہنسی چھوٹ گئی اور ہم نے کہا "تم عشق کے نہیں مالیخولیا کے مریض لگتے ہو"۔

ہمارا خیال تھا کہ اس پر موصوف ہمارا سر توڑ دیں گے' مگر ہمارا یہ جملہ سن کر وہ اچھل پڑے اور بولے "ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ مالیخولیا اس کے علاوہ ہے کیونکہ مستقل ایک ہی خیال میں مگن رہنے سے ذہن انسانی متوازن نہیں رہتا اور یوں عاشق میں مالیخولیا کے آثار بھی پیدا ہو جاتے ہیں! بلکہ آج میں ان خدشوں اور وسوسوں کی بنا پر بھی تمہارے پاس آیا تھا کہ تم مجھے اس سلسلے میں کوئی نصیحت کرو تاکہ میں محبت کے آزار سے نکل جاؤں!"

تب ہم نے اپنے اس عاشق دوست کو ہمدردی کی نظروں سے دیکھا اور کہا "محبت بری چیز نہیں' بہت اچھی بلکہ نہایت فائدہ مند چیز ہے اس سے انسان کمزور نہیں بلکہ ہٹا کٹا ہو جاتا ہے' نیز یہ کہ محبت سے ذہنی عوارض پیدا نہیں ہوتے بلکہ اس سے ذہن کو جلا ملتی ہے اور انسان جوڑ توڑ اور گٹھ جوڑ کے ضمن میں پہلے سے بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا ہے"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم اپنے رہنماؤں پر نظر ڈالو ماشاء اللہ نوے نوے سال کی عمر میں لمبے سفر کرتے ہیں گٹھ جوڑ کرتے ہیں' حالانکہ یہ بھی ہر وقت ایک ہی خیال میں مگن رہتے ہیں مگر ان کا نظام ہضم اتنا پرفیکٹ ہے کہ آدھا ملک ہضم کر گئے ہیں اور باقی ماندہ پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ رہنماؤں میں سے ایک آدھ کی صحت بہتر نہیں باقی تو ماشاء اللہ ریسلنگ چیمپئن شپ کے مقابلے میں بھیجے جا سکتے ہیں سو میرے عزیز اگر تم نے محبت

کرنا ہی ہے تو کسی انسان سے نہ کرو' اپنے مفادات سے کرو' اقتدار سے کرو اور پھر دیکھو تمہاری ناتوانی کس طرح طاقت میں بدلتی ہے اور ہاں اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنے پورے جثے سمیت خود کو با آسانی "بیمار محبت" بھی کہلا سکتا ہے اور صرف کہلا ہی نہیں سکتا' اسے "بیمار محبت" ماننے والے بھی پیدا ہو جاتے ہیں!"

۲۰ اپریل ۱۹۸۶ء

خطرناک آدمی

گذشتہ دنوں چار پانچ چھٹیاں اکٹھی ہو گئیں، چھٹی کے پہلے روز میں سو کر اٹھا تو حسب عادت شیو کے سامان کے ساتھ میں آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ میرا شیو کرنے کو جی نہیں چاہ رہا، میں نے سوچا اتنے عرصے سے رسم دنیا نباہ رہے ہیں، آج اگر نہیں نباہیں گے تو کیا فرق پڑے گا؟ چنانچہ میں صرف منہ ہاتھ دھو کر اپنے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ مگر اس روز میرا کام کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بس جی چاہتا تھا کہ مزے سے بے سدھ پڑے رہو، سو میں نے تین دن اسی طرح گزارے چوتھے روز گھر سے نکلا اور بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ کاموں میں مشغول ہو گیا۔ مگر مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ چار دن کا بڑھا ہوا شیو میرے لئے کیسے کیسے مسائل کھڑے کر سکتا ہے!

دفتر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے جس دوست سے ملاقات ہوئی، اس نے میرے سلام کا جواب دینے کی بجائے کہا "یار تم نے اپنی حالت کیا بنائی ہوئی ؟"

میں نے کہا "ٹھیک تو ہوں، کیا ہوا ہے مجھے؟"

اس نے کہا "آئینے میں اپنی شکل دیکھو، فلموں کے بے روزگار ہیرو لگ رہے ہو۔ مجھے تو ڈر ہے کہ تم ابھی مجھے کاندھوں سے جھنجھوڑ کر کہو گے کہ ماں! مجھے آج پھر نوکری نہیں ملی!"

دوست کے یہ ریمارکس سن کر بے ساختہ میں نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا، شیو واقعی خاصا بڑھا ہوا تھا، اتنا کہ اگر خط بنوایا جائے تو اسے باقاعدہ داڑھی قرار دیا جا سکتا تھا، مگر مجھے یہ اسی طرح اچھا لگ رہا تھا میں نے مسکراتے ہوئے اپنے اس دوست کے کاندھوں پر تھپکی دی اور آگے بڑھ گیا!

میں ابھی اپنی ڈاک دیکھ رہا تھا کہ دریں اثنا ایک اور دوست میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور مختلف زاویوں سے عجیب عجیب شکلیں بنا کر مجھے دیکھنے لگا۔

"تم نے اپنی شکل دیکھی ہے؟"

"کیوں، کیا ہوا ہے مجھے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا ہوا ہے؟ مجھے کوئی مثال نہیں سوجھ رہی، تم سپورٹس مین سپرٹ سے کام لیتے ہوئے خود ہی اپنے آپ کو کسی بری چیز کے ساتھ تشبیہ دے لو!"

"عجیب واہیات لوگ ہیں" میں نے دفتر سے واپسی پر ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور میں داخل ہوتے ہوئے

سوچا۔

کیشیئر نے میرے خریدے ہوئے سامان کی رسید دیتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا "اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں۔؟"

"فرمائیں" میں نے جل کر کہا' میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

"اخبار میں آپ کی تصویر تو خاصی بہتر آتی ہے"

"دھت تیرے کی!" میں نے دل ہی دل میں کہا اور سٹور سے باہر آ گیا!

مجھے ایک ضروری ٹیلیفون کرنا تھا اور ظاہر ہے ہمارے ہاں فون کسی سرکاری دفتر ہی سے ہو سکتا ہے' میں نے ٹیلیفون کرنے سے پہلے اپنے دوست سے چکنی چپڑی باتیں کیں اور پھر ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "یار ایک ضروری فون کرنا ہے!"

"کرو کرو' مگر کہیں سرکاری ٹیلیفون کے غلط استعمال پر کالم نہ لکھ دینا!" اس نے ہنس کر کہا۔

میں نے جواباً ایک کھسیانی سی ہنسی ہنسنے کے بعد نمبر ملانا شروع کر دیا!

میں نے ٹیلیفون کرنے کے بعد دوست کا شکریہ ادا کیا۔

"کوئی بات نہیں!" دوست نے کہا "مگر یہ تم نے شیو کیوں بڑھایا ہوا ہے' خیر تو ہے؟"

"بس یار جی نہیں چاہ رہا تھا' لہٰذا شیو نہیں کیا!"

نہیں مجھے تو کچھ اور ہی چکر لگتا ہے؟"

"مثلاً؟"

"یہی کہ کسی لمبے ہی چکر میں ہو' لیکن میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ بال بچے دار شخص کو اور سب کچھ کرنا چاہئے' عشق نہیں کرنا چاہئے!"

"مشورے کا بہت بہت شکریہ" میں نے جل کر کہا "مگر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا!"

"واقعی؟" دوست نے اپنی کرسی سے اچھل کر کہا۔

ہاں! ہاں' ہاں" میں نے زمین پر پاؤں پٹختے ہوئے کہا "بلکہ میرا ارادہ تو عقد ثانی کا ہے' تمہارا کیا خیال ہے؟"

"توبہ' توبہ' توبہ" دوست نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "میں تو پہلی شادی کے حق میں بھی نہیں ہوں' تم دوسری شادی کا پوچھ رہے ہو؟"

"تو پھر اس مسئلے پر تم سے بات نہیں ہو سکتی" میں نے اس سے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

دروازے کے پاس پہنچ کر میں دوبارہ واپس آیا اور دوست کے کان میں سرگوشی کی "مگر دیکھو یار! یہ بات کسی کو بتانا نہیں!"

کون سی بات؟"

"یہی دوسری شادی والی!" اور پھر میں اسے سخت پریشانی کے عالم میں چھوڑ کر واپس کار میں آ کر بیٹھ

گیا!

گھر واپس پہنچتے ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی "ٹرن ٹرن ٹرن"

میں نے ٹیلیفون اٹھایا "یار سنا ہے تم شادی کر رہے ہو' بڑے افسوس کی بات ہے!"

"تمہیں کس نے بتایا ہے؟"

"بتایا تو مجھے افضل نے ہے 'مگر شک مجھے خود بھی گزرا تھا!"

"وہ کیسے؟"

"یہ جو تم کئی دنوں سے شیو نہیں کر رہے......"

"تو کیا یہ شرط میرے سسرال والوں نے عائد کی ہے کہ اگر شیو خاطر خواہ طور پر بڑھا نہ ہوا تو بارات واپس کر دی جائے گی؟"

"یہ تو تم جانتے ہو گے' بہر حال جو قدم بھی اٹھانا' سوچ سمجھ کر اٹھانا!" یہ کہہ کر اس بدبخت نے فون بند کر دیا!

میں ایک اور پیشی بھگت رہا تھا! "یار تمہارے ساتھ دوستی میرے لئے عذاب بن گئی ہے صبح سے تمہاری طرف سے صفائیاں دے دے کر تنگ آ گیا ہوں!"

"تم یوں کرو" میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا تم یہ صفائیاں دینا بند کر دو!" اور پھر ٹیلیفون درمیان ہی میں کٹ گیا!

میں نہانے کے لئے ابھی باتھ روم جا ہی رہا تھا کہ دروازے پر بیل ہوئی راشد سامنے کھڑا تھا!

"یار ملک کا کیا بنے گا؟" اس نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی حسب معمول سیاسی گفتگو شروع کر دی۔

کیوں خیر تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ٹیلی ویژن ریڈیو اور سرکاری اخبارات چوبیس گھنٹے حکومتی نقطہ نظر ہم پر ٹھونسنے میں لگے رہتے ہیں...... یہ ایک طرح سے ہمیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ ہم اپنے نقطہ نظر سے دستبردار ہو جائیں! یہ کوئی جمہوریت نہیں ہے!"

"تمہارے نزدیک جمہوریت کی تعریف کیا ہے؟"

"میرے نزدیک جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ ہر شخص کو قول و فعل کی مکمل آزادی ہونی چاہئے' بس اتنا ہے کہ اس سے دوسروں کی آزادی متاثر نہ ہو!"

"بالکل ٹھیک ہے" میں نے کہا "اب تم یہ بتاؤ کہ میرے بڑھے ہوئے شیو سے تمہاری آزادی تو مجروح نہیں ہو رہی!"

"ارے ہاں' یہ تو میں بھول ہی گیا تھا" راشد کے لہجے میں تشویش تھی 'لوگ تمہارے بڑھے ہوئے شیو کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں!"

"مثلاً؟"

"مثلاً ایک تو یہ کہ تمہاری ٹھوڑی کے نیچے ایک گلٹ سا نکلا ہوا ہے، جسے چھپانے کی کوشش میں تم داڑھی رکھ رہے ہو اور دوسرے یہ کہ......"

"ایک گلٹ اس کے علاوہ بھی ہے؟" میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش میں جبراً ہنستے ہوئے کہا "چھوڑو، ویسے ہم لوگ ہیں بہت مزیدار...... حکومت سے تحریر و تقریر اور قول و فعل کی مکمل آزادیاں مانگتے ہیں اور اپنے طور پر کسی کو اتنی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اگر شیو نہیں کرنا چاہتا تو نہ کرے۔ میں نے آج کتنے ہی ضروری کام کرنے تھے، مگر وہ سب چھوڑ چھاڑ کر دوپہر ہی کو واپس گھر آگیا ہوں اور لوگوں کے سوالوں سے بچنے کے لئے دروازے بند کر کے بیٹھ گیا ہوں۔ یہ وہ نظر بندی ہے جسے کورٹ میں چیلنج بھی نہیں کیا جا سکتا!"

راشد کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے اس معاشرتی جبر کے خلاف ایک زبردست احتجاجی تحریک چلانی چاہئے جس کا مرکزی نکتہ یہ ہو کہ اگر کوئی شخص شیو نہیں کرنا چاہتا تو اسے اپنی اس خواہش پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہو مگر پھر میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں بلکہ ایسے دوسرے معمولی معمولی معاملوں میں بھی داد فریاد کس سے کی جائے جن کے ضمن میں حکومت، مذہب حتیٰ کہ خود معاشرے کی طرف سے بھی بظاہر کوئی پابندی نہیں لیکن معاشرے کے "غیر تحریری قوانین" کی خلاف ورزی کسی صورت میں برداشت نہیں کی جاتی؟

فون کی گھنٹی پھر بج رہی تھی۔ میں نے وارڈ روب میں سے تولیہ نکالا اور غسل خانے میں داخل ہوتے ہوئے بیٹے کو آواز دی "یار! جس کسی کا بھی فون ہو اسے بتا دینا کہ میں شیو کر رہوں، فکر کی کوئی بات نہیں"

۱۴ جون ۱۹۸۶ء

معصوم اجمیری

چھٹی والے دن سری پائے کا ناشتہ کرنے کے لئے میں نے اپنے گھر کے قریب واقع ایورنیو سٹوڈیو کی جانب رخ کیا اور پھر ان سٹوڈیوز کے برابر میں واقع ایک دوکان میں داخل ہو گیا جہاں ایک پلیٹ پائے کا آرڈر دے کر میں دکان کا جائزہ لینے لگا یہ ایک عوامی قسم کی "ناشتہ گاہ" تھی۔ میزوں پر دھرے شیشے کے گلاسوں پر چکناہٹ نظر آ رہی تھی اور ان پر گاہکوں کی انگلیوں کے نشانات ثبت تھے میزوں پر بھی چکناہٹ کے داغ تھے اور دوسری میزوں پر جو لوگ بیٹھے تھے' اس ماحول میں اب وہ بھی چکنے چکنے لگنے لگے تھے میری ساتھ والی میز پر ایک ہیرو نما شخص ناشتے میں مشغول تھا پرلی میز پر قمیص اور شلوار میں ملبوس ایک بے چین سا شخص بیٹھا تھا' اس کی قمیص کے تین بٹنوں میں سے درمیان والا بٹن ٹوٹا ہوا تھا وہ چائے کی چسکیاں لیتے لیتے کبھی اچانک خلا میں گھورنے لگتا اور کبھی کپ ہاتھوں میں پکڑے کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوتا اور کبھی ہوائی چپل گھسیٹتا ہوا دکان سے باہر نکل کر ملتان روڈ پر ملتان اور ساہیوال سے آنے والی بسوں کو دیکھنے لگتا میرے سامنے والی میز پر ایک چھوٹی سی داڑھی والا شخص رومال کو سر پر پٹی کی طرح باندھے بیٹھا تھا یہاں ایک موٹے شیشوں والی عینک والا بابا بھی تھا جو شڑاپ شڑاپ کی آوازوں کے ساتھ چائے پینے میں مشغول تھا۔ اس ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے بیشتر' ارد گرد واقع شاہنور سٹوڈیوز' ایورنیو سٹوڈیوز اور باری سٹوڈیوز سے متعلق تھے اور یوں یہاں ان کا مستقل آنا جانا لگتا تھا......!

میں نے ابھی گرم گرم کلچے کا پہلا لقمہ ہی منہ میں لیا تھا کہ ایک بلی جتنے چوہے نے میرے پاؤں پر چھلانگ لگا دی اور اپنے فن کے اس مظاہرے کے بعد وہ کاؤنٹر کے پیچھے روپوش ہو گیا۔ میری طبیعت بری طرح متلانے لگی۔ میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے دکاندار سے شکایت کی' تو اس نے دیگچے میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا "بس جی کیا کریں' اس کا رزق یہیں لگا ہوا ہے" چوہے کو بھی غالباً میرا شکایت کرنا اچھا نہیں لگا' چنانچہ اس نے کاؤنٹر کے نیچے سے مجھے غصیلی آنکھوں سے دیکھا اور پیشتر اس کے کہ اس دفعہ وہ "ہائی جمپ" کا مظاہرہ کرتا' میں نے اپنی پلیٹ اٹھائی اور سر پر پٹی باندھے ہوئے چھوٹی چھوٹی داڑھی والے شخص کی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ماتہ کے داغ تھے اور وہ خاموشی سے چائے پینے میں مشغول تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے حلق میں سے "خر خر خر" کی آواز نکالی اور پھر منہ نیچے کر کے بلغم فرش پر تھوک دی' مجھے یوں لگا جیسے میرا سب کچھ کھایا پیا ابھی باہر نکل آئے گا۔ میں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے اس کی طرف خشونت بھری نظروں سے دیکھا مگر وہ میرے ردعمل سے بے نیاز دوبارہ چائے پینے میں مشغول ہو گیا میں طوعاً و کرہاً آنکھیں میچ کر ایک بار پھر اپنے مرغوب ناشتے کی طرف

متوجہ ہوا مگر چند لمحوں بعد مجھے ایک بار پھر "خر خر خر" کی آواز آئی اور پھر سر پر پٹی باندھے، چھوٹی چھوٹی داڑھی اور چہرے پر ماتہ کے داغوں والے اس شخص نے سر نیہوڑا کر بلغم فرش پر انڈیل دیا۔ میں پلیٹ اٹھا کر واپس سابقہ میز کی طرف جانے لگا مگر میری نظر پھر اس بلی کی جسامت والے چوہے پر پڑی جو اس دفعہ کرسی کے نیچے ایک روٹی کو کتر کتر کر پھینک رہا تھا چنانچہ میں نے چوہے کو کچھ کہنے کی بجائے اس شخص مذکور کو مخاطب کیا اور کہا "بھائی صاحب آپ مہربانی کر کے باہر جا کر تھوکیں" اسے شاید یہ میری تجویز پسند آئی کیونکہ اس نے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور کچھ کہے بغیر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اس دوران وہ بے چین سا شخص ایک بار پھر کاؤنٹر پر کھڑا تھا، کچھ دیر قبل ہوٹل کے باہر ایک کار آ کر رکی تھی اور اس میں سے دو معزز لوگ اتر کر اندر آئے تھے۔ یہ بھی فلم سے وابستہ لگتے تھے، وہ بے چین سا شخص اب انہی کے پاس کھڑا تھا میں نے اس بے چین شخص کو دیکھا کہ گفتگو کے دوران وہ اساتذہ کے شعر موقع محل کے لحاظ سے استعمال کرتا تھا۔ تاہم اس وقت وہ انہیں اپنی اختراع کی ہوئی کوئی دھن سنا رہا تھا۔

"اس میں میں نے چڑوا ہے کی جو آواز بنائی ہے، وہ دیکھیں" اور پھر اس نے گانے کے بول گا کر آخر میں بڑے ردم کے ساتھ منہ سے "پھر پھر پھر پھر" کی آواز نکالی۔ جب وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر چکا تو اس کے پاس کھڑے لوگوں میں سے ایک نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا "میں زندگی وچ بڑے بڑے مخولئے دیکھے نے، پر تیرے جیا مخولیا نئیں ویکھیا"۔ یہ فن کار اپنے فن کی بے حرمتی برداشت نہ کر سکا، چنانچہ اس نے اپنے درمیان والے گم شدہ بٹن کے کاج کو ٹٹولا اور پھرتی سے باہر نکل کر ملتان روڈ پر کھڑا ہو گیا جہاں ساہیوال اور ملتان سے بسیں آ رہی تھیں اور جا رہی تھیں، میرے سامنے والی میز پر بیٹھے ہیرو نما شخص نے پورے انہماک سے ناشتہ کرتے کرتے کاؤنٹر کے قریب کھڑے لوگوں میں سے ایک کو مخاطب کیا اور کہا "پائے اور بھی بہت جگہ سے مل جاتے ہیں لیکن ایک تو ایسے لذیذ پائے کہیں اور ملتے نہیں اور دوسرے (دوکاندار کی طرف اشارہ کرکے) اس شخص کے ہاتھ میں برکت بہت ہے، شوربہ اول تو کم پڑتا ہی نہیں اگر کم پڑ بھی جائے تو یہ دوسری تیسری مرتبہ بھی پھر سے پلیٹ بھر دیتا ہے"۔ اور پھر اس نے اپنی خالی پلیٹ دکاندار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یار ذرا تھوڑا سا شوربہ تو اور ڈالنا"۔

میں بل ادا کر کے دوکان سے باہر نکلا تو وہی بے چین سا شخص سڑک کے کنارے کھڑا خلا میں گھور رہا تھا، مجھے یہ شخص دلچسپ لگا تھا اور ایسے کردار مجھے بہت مرغوب ہوتے ہیں۔ چنانچہ موٹر سائیکل سٹارٹ کرنے سے پہلے میں اس کی طرف گیا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "مجھے عطاء الحق قاسمی کہتے ہیں"۔

"جی بہت خوشی ہوئی"۔ وہ ایک اجنبی شخص کو اچانک اپنے سامنے پا کر کچھ ٹپٹا سا گیا تھا" آپ کی شکل کچھ جانی پہچانی ہے۔"

مجھے یقین تھا کہ یہ بھی مجھے "وارث" ڈرامے کا چودھری حشمت سمجھ بیٹھا ہے۔ چنانچہ میں نے صورتحال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "ممکن ہے ایسا ہی ہو، مگر میں چودھری حشمت نہیں ہوں۔ میں ایک کالج میں پڑھاتا

ہوں"۔

"اچھا اچھا! مگر آپ کا تلفظ بہت غلط ہے!"

میں نے اپنے چہرے پر ابھرنے والی مسکراہٹ چھپالی اور بظاہر سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا "آپ مجھے کراچی کے لگتے ہیں"۔

"جی ہاں، جی ہاں میں کچھ عرصہ پہلے کراچی سے آیا ہوں اور یہاں فلموں میں کام کرتا ہوں۔ کھانے کے لئے یہ ہوٹل ہے سونے کے لئے ایک کوٹھڑی ہے" اور اس کے ساتھ ہی اس نے اکبرالہ آبادی کا یہ شعر پڑھا۔

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

"آپ کا نام؟"

"جی مجھے معصوم اجمیری کہتے ہیں" اور پھر اس نے ہنس کر کہا "صاحب میرا پورا نام تو بہت لمبا ہے، یعنی سید معصوم اجمیری، لیکن میں نے بتایا نہیں کہ آپ کہیں گے سید ہو کر یہ کس کام میں پڑ گیا ہے!"۔

"کراچی میں آپ کا کیا شغل تھا؟"۔

"جی میں وہاں بیکری کی ایک دکان میں کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اگر انسان کو بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہو، تو جہاں ہزار روپے سیل ہونا ہوتی ہے، وہاں پندرہ سو ہوتی ہے۔ یہ بیکری میرے خالو کی تھی، سو وہ مجھے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا کر دیتے تھے!"

یہ صاحب آہستہ آہستہ کھلتے جا رہے تھے اور کچھ دیر بعد وہ خاصے بے تکلف ہو گئے

"میں آپ کو ایک آیٹم سناتا ہوں۔ وہ آپ نے غالب کا شعر تو سنا ہوا ہے نا۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مگر یہ شعر آپ مجھ سے سنیں۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حق۔ ضیاء الحق، ضیاء الحق، ضیاء الحق، ضیاء الحق

اور ارد گرد کے تمام ہجوم سے بے نیاز معصوم اجمیری نے آنکھیں بند کر کے اور سانس روک کر گردن کو دائیں اور بائیں جانب جھٹکا دینا شروع کر دیا اور "حق...... ضیاء الحق" کی "ضرب" لگانے میں منہمک ہو گیا۔ کنٹرول کرنے کی کوشش کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"صاحب آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟" معصوم اجمیری نے آنکھیں کھول کر مری طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "حق سے میری مراد حق تعالیٰ نہیں صرف سچ کا بول بالا ہے اور یہ تو میرا روزانہ کا

وظیفہ ہے۔ ایک دفعہ میں رات کے بارہ بجے سڑکوں پر پھر رہا تھا کہ ایک پولیس والا مجھے پکڑ کر تھانے لے گیا میں نے وہاں اپنا یہ وظیفہ پڑھا۔ تھانے دار نے کہا اسے فوراً چھوڑ دو۔ میں نے کہا کیسے چھوڑ دو۔ ہمارے صدر ضیاء الحق صاحب نے اسلامی نظام نافذ کر دیا ہے مگر چوریاں ہو رہی ہیں 'ڈاکے پڑ رہے ہیں' تم لوگ رشوت لیتے ہو' روزہ نہیں رکھتے' نماز نہیں پڑھتے 'اب میں اذان دوں گا اور تم لوگ میرے پیچھے نماز پڑھو گے 'اور پھر میں نے وہاں کھڑے کھڑے اذان دی یہ دیکھیں" اور اس کے بعد معصوم اجمیری نے عرب قاریوں کی طرح اپنے ایک کان میں انگلی دے کر عربی لحن میں وہیں کھڑے کھڑے اذان دینا شروع کر دی۔

"بہت اچھے 'بہت اچھے"۔ میں نے خود پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے آہستگی سے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا "آئیں' برابر والی دکان سے پان کھاتے ہیں"۔ میں اگر ایسا نہ کرتا تو وہ شاید پوری اذان دینے کے بعد ارد گرد کھڑے لوگوں کو صبح نو بجے والی کوئی نماز پڑھوا دیتا!

پان کی دکان کے ساتھ ایورنیو سٹوڈیو کا گیٹ تھا' جس کے باہر نیم خواندہ نوجوانوں کی ایک لمبی قطار ایڑیوں کے بل بیٹھی تھی۔ ان میں سے ایک تعداد تو ان لوگوں کی تھی 'جو اپنے کسی محبوب فن کار کو ایک نظر دیکھنے کے لئے صبح سے شام تک وہاں بیٹھے رہتے ہیں' جبکہ ان میں سے بیشتر نوجوان اس امید پر یہاں بیٹھے تھے کہ شاید کسی ڈائریکٹر کی نگاہ جوہر شناس ان پر پڑ جائے اور وہ انہیں اپنی فلم میں ہیرو لے لے۔

"آپ مجھے پڑھے لکھے آدمی لگتے ہیں' آپ ایسے لوگوں کو فلم لائن میں آنا چاہئے 'اگر کہیں تو میں آپ کو چانس دلواؤں؟" معصوم اجمیری نے اتنی سنجیدگی سے یہ پیشکش کی کہ ایک دفعہ پھر مجھے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں"۔ میں خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ "عطاء اللہ شاہ ہاشمی میرے بزرگ ہیں ۔ مولا جٹ والے سرور بھٹی میرے شاگرد ہیں 'نغمہ نگار خواجہ پرویز میرے دوست ہیں۔ سنسر بورڈ والے ڈاکٹر صفدر محمود صاحب سے بھی میرا یارانہ ہے۔ یہ بھی مجھے اکثر یہی کہتے رہتے ہیں اور میں خود بھی ان دنوں انہی لائنوں پر سوچ رہا ہوں"۔

"اگر یہ سب آپ کے دوست ہیں 'تو پھر مجھے ایک چانس دلوا دیں"۔ معصوم اجمیری نے معصومیت سے کہا "میں فنکاروں کے لئے ایک اکیڈمی کھولنا چاہتا ہوں 'ان سے کہہ سن کر اس اکیڈمی کے لئے زمین کے ایک ٹکڑے کا بندوبست کر دیں"۔

اور مجھے ان لمحوں میں یہ شخص کوئی دوسرا شخص لگا۔ میں نے سوچا یہ تو کانٹوں کے بستر پر سہانے خواب دیکھنے والا انسان ہے مگر پیشتر اس کے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا اس نے میرے کاندھوں پر ہولے سے اپنا ہاتھ رکھا اور کہا آپ کس سوچ میں پڑ گئے! میں آپ کو اکبر الہ آبادی کا شعر سناتا ہوں۔

اسی کو چاہنا ہے چاہنا' میں کچھ نہ چاہوں گا
جہاں تک ہو سکے گا بندگی کا حق نباہوں گا

اور پھر اس نے آنکھیں بند کر کے اور گردن کو دائیں بائیں جھٹکا دیتے ہوئے "حق ضیاء الحق" کا وظیفہ شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر اس بے جبین سے اور کچھ نارمل اور کچھ ابنارمل سے شخص نے اچانک مجھ سے ہاتھ ملایا اور ہوائی چپل گھسیٹتا ہوا سامنے پایوں کی دکان میں داخل ہو گیا۔

۹ مئی ۱۹۸۲ء

رائٹرز گلڈ، کنو اور انشائیہ

ان دنوں "جسارت" کے ادبی صفحات میں' رائٹرز گلڈ پر بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے جس میں پچاس برس سے زائد عمر کے ادیب پورے جوش ایمانی کے ساتھ شریک ہو رہے ہیں۔ یہ عمر کا اندازہ ہم نے اس بحث کے ساتھ شائع ہونے والی تصویروں سے نہیں لگایا کہ شائع ہونے والی تصویریں تو پچاس برس پہلے کی ہوتی ہیں' بلکہ یہ اندازہ تو ہم نے ایک تو بحث میں شریک ہونے والے ناموں اور دوسرے گلڈ کے کاموں سے لگایا ہے دراصل جب یہ گلڈ قائم ہوا تھا' اس وقت ہماری آدھی ٹکٹ لگتی تھی (یا آدھا ٹکٹ لگتا تھا!) اس وقت ادیبوں کے اس ا.ا.ر ے نے یقیناً کچھ اچھے برے کام کئے ہوں گے' جب ہی تو اس دور کے نامی گرامی لوگ کونوں کھدروں سے نکل کر سامنے آ رہے ہیں اور بعض بالکل نئے پہلوؤں سے پردہ اٹھا رہے ہیں لیکن یہ جو ہم نے اپنی عمر کا ذکر کیا تھا تو اس سے مقصود عقد ثانی کے لئے بذریعہ اخبار راہ ہموار کرنا نہیں تھا۔ بلکہ کنایہ مقصود تھا کہ اس بحث سے دلچسپی زیادہ تر ان لوگوں کو ہے جو پچاس سے اوپر ہیں اور گلڈ کے قیام یا اس دور کی گلڈ کی سرگرمیوں سے متعلق رہے ہیں۔ ہم نے ادیبوں کو ادیبوں کی اس تنظیم سے عملی طور پر لاتعلق ہی پایا ہے۔ اگر جمیل الدین عالی نے گلڈ کے آغاز میں اور محمد طفیل نے گلڈ کے اختتام پر ادیبوں کے لئے کچھ اچھے کام کئے ہیں' تو یہ باب بھی اب بند ہو چکا ہے۔ اب تو گلڈ کا ذکر پرانے ادیبوں میں سے ان کی زبان سے سننے میں آتا ہے' جنہیں گلڈ کی طرف سے مشرقی پاکستان کی سیاحت پر بھیجا گیا تھا' یا نہیں بھیجا گیا تھا اور ان دنوں یہ ذکر ان لوگوں کی زبان پر ہے جنہیں ان کی کسی کتاب پر انعام ملا یا نہیں ملا' سو خواتین و حضرات' یہ قصہ اب جانے دیں "مرحوم" کے لئے دعائے خیر کریں اور یا اگر ممکن ہو تو اس کی صحت یابی کی دعا کریں کہ وہ بہت غفور الرحیم ہے بندوں کی سنتا ہے تو اداروں کی بھی سنے گا!

ایک بات اور جس کا ذکر بہت ضروری ہے' وہ گلڈ کے بانی کی تلاش کے حوالے سے ہے۔ جس کی جستجو "جسارت" کے ادبی صفحات میں گلڈ کے بعض شناور کرنے میں مشغول ہیں' میجر ابن الحسن صاحب نے اپنی یادداشتوں میں غوطہ لگایا ہے اور جمیل الدین عالی صاحب کو کاندھے پر اٹھا کر باہر نکلے ہیں۔ اب ہم نہیں جانتے کہ جناب عالی "ایجاد بندہ" کے دعویدار ہیں بھی یا نہیں اور یہ کہ اس "سہرہ بندی" پر وہ خوش ہیں یا شہر میں نادم پھرتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں ہمارا ذاتی تاثر یہ ہے کہ یہ اگر اعزاز بھی ہے تو ایک حد سے زیادہ نہیں ہے۔ جس طرح ہمارے نزدیک ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک اہم خدمت یہ ہے کہ انہوں نے کنو کی کاشت میں جدید زرعی طریقوں کو

اپنا کر پاکستانی عوام کو ایک بہتر پھل کا ذائقہ دیا' مگر ڈاکٹر صاحب ہیں کہ کنوں کی بجائے خود کو انشائیے کا موجد ثابت کرنے میں زیادہ افتخار محسوس کرتے ہیں' اسی طرح جمیل الدین عالی کی قدر و قیمت ہمارے نزدیک یہ ہے کہ انہوں نے ادب میں پاکستانیت کو فروغ دیا' خوبصورت غزلیں' دوہے لکھے بہترین سفرنامے تحریر کئے' اپنے علم اور دانش میں لوگوں کو شریک کیا' ملک کے کسی دور دراز گوشے میں بھی اگر کسی بے نوا شاعر کا انتقال ہوا' تو وہ کراچی سے چل کر وہاں پہنچے اور مرنے والے کے لواحقین کو پرسہ دیا' سو گلڈ کا بانی ہونا ان کے لئے اتنا ذریعہ عزت نہیں' جتنا گلڈ کے لئے۔ یہی بات ہم نے اپنے ایک مضمون میں مدیر نقوش محمد طفیل کے بارے میں کہی تھی کہ ہم نے انہیں "نقوش" کے ذریعے پہچانا ہے' گلڈ کے سیکرٹری جنرل ہونے کے ناتے سے نہیں۔ لہٰذا جمیل الدین عالی نے اگر میجر ابن الحسن کی طرف سے دعوت سہرہ بندی قبول کر لی ہے' تو ہم اس پر بھی انہیں مبارک پیش کرتے ہیں' لیکن اگر آپ ہمارے دل کی بات پوچھیں' تو یہ کنو پر انشائیے کو ترجیح دینے والی بات ہے!

۲۰ جون ۱۹۸۲ء

باہمی دلچسپی

اخبارات میں گاہے گاہے ایک خبر ایسی بھی شائع ہوتی ہے جو ہمارے لئے ہربار تفنن طبع کا باعث بنتی ہے' یہ خبر سربراہان مملکت کے حوالے سے ہوتی ہے کہ گذشتہ روز انہوں نے ملاقات کی اور باہمی دلچسپی کے امور پر اظہار خیال کیا ہم نے جب کبھی یہ خبر پڑھی اس سوچ میں پڑ گئے کہ جب یہ سربراہان مملکت سچ مچ "باہمی دلچسپی" کے امور پر اظہار خیال کرتے ہوں گے تو کیسے لگتے ہوں گے۔ باہمی دلچسپی کے کچھ امور تو وہ ہوتے ہیں جو بالکل نجی قسم کے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے سربراہان مملکت جب اکٹھے ہوتے ہوں گے تو دلی خواہش کے باوجود ایسی باتوں کا اظہار کرتے ہوئے جھجکتے ہوں گے کیونکہ سارے سربراہ' مرحوم صدر سکارنو کی طرف جی دار تو نہیں ہوتے لہٰذا صد ہزار سخن ہائے گفتنی خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ جاتے ہوں گے بلکہ وہ تو باہمی دلچسپی کے سب سے بڑے مسئلے یعنی اپنے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے موضوع پر بھی کھل کر گفتگو کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے حالانکہ وہ اگر ایسا کریں تو ایک دوسرے کو ایسے ایسے "استادی دا" بتا سکتے ہیں کہ ان کے حریف چاروں شانے چت گر جائیں' بسا اوقات سربراہان مملکت نے اپنے عوام کی بے مروتی کو دیکھتے ہوئے چھوٹی موٹی رقوم بیرون ملک بھی جمع کرائی ہوتی ہیں لیکن بچارے ایسے مواقع پر باہمی دلچسپی کے اس اہم مسئلے پر بھی گفتگو نہیں کر سکتے جبکہ اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے سے انہیں خاصے مفید مشورے مل سکتے ہیں بلکہ اگر وہ اس فقیر کے مشورے کو مانیں تو اپنے بیرون ملک مفادات کے تحفظ کے لئے ایک ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں لائیں ممکن ہے وہ اس خوف سے ہمارا مشورہ نہ مانیں کہ اس طرح یہ راز ان کے عوام پر افشا ہو جائے گا تو ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس قسم کی باتوں کی خبر سب سے پہلے ان کے عوام کو ہی ہوتی ہے اور جب یہ عوام اکٹھے بیٹھتے ہیں تو زیادہ تر گفتگو "باہمی دلچسپی" کے اسی مسئلے پر کرتے ہیں!

سربراہان مملکت کی "باہمی دلچسپی" کے موضوعات یوں تو بہت ہیں لیکن یہ سب کے سب نجی زمرے میں آتے ہیں لہٰذا وہ ان موضوعات پر گفتگو سے کتراتے ہوں گے اب لے دے کر قومی اور بین الاقوامی موضوعات ہی رہ جاتے ہیں لیکن "تیسری دنیا" کے بعض سربراہان مملکت کو دیکھ کر ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان موضوعات پر کیا گفتگو کرتے ہوں گے اور اگر کرتے ہوں گے تو اس وقت کیسے لگتے ہوں بلکہ بسا اوقات تو یہ منظر تصور میں لانے سے ہی ہماری ہنسی چھوٹ جاتی ہے! تاہم سپر پاورز میں سے روس اور امریکہ کے سربراہان کی گفتگو سمجھ میں نہ آنے کے باوجود سمجھ میں آ سکتی ہے مگر موجودہ دونوں سربراہ عمر کے لحاظ سے "سترے بہترے" ہیں چنانچہ ہمیں

تو ہمیشہ یہ دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ یہ بابے کسی دن باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کرتے ہوئے کوئی ایسا فیصلہ نہ کر بیٹھیں جس سے پوری دنیا میں بسنے والے اربوں لوگوں کی باہمی دلچسپی کے امور ہمیشہ کے لئے کھٹائی میں پڑ جائیں' بلکہ ایک ڈر تو ہمیں یہ بھی لاحق رہتا ہے کہ کسی روز اپنے ٹیبل لیمپ کا بٹن دبانے کی بجائے یہ بزرگوار غلطی سے ایٹم بم کا بٹن نہ دبا بیٹھیں لہٰذا ہم تو ہر وقت ان کی درازی عمر کے علاوہ ان کے استحکام حافظہ کے لئے بھی دعا کرتے رہتے ہیں!

خیر' یہ خدشے تو محض ان کی عمر کے حوالے سے ہیں' ورنہ ماشاء اللہ یہ جہاں دیدہ لوگ ہیں انہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے' چنانچہ یہ جب باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کرتے ہوں گے تو یقیناً اس مشترکہ اعلامیہ سے ہٹ کر ہو گی جو ان کی ملاقات کے بعد جاری ہوتا ہے' مثلاً ریگن مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے بعد گورباچوف سے کہتے ہوں گے کہ باباجی' ہم نے ویت نام میں اپنی پوری طاقت نہیں جھونکی تھی' آپ افغانستان میں پوری طاقت نہیں جھونکیں گے ورنہ ہم آپ سے نمٹ لیں گے اور جواب میں گورباچوف کہتے ہوں گے کہ بزرگو! ہم ان تڑیوں میں آنے والے نہیں ہیں' ویسے ہم ماضی میں بھی بین الاقوامی مسائل پر اندرون خانہ مشترکہ لائحہ عمل تیار کرتے رہے ہیں اور ہمیں آئندہ بھی ایسا ہی کرنا چاہئے! اس کے بعد یہ دونوں بابے بیٹھ کر شراب پیتے ہوں گے اس دوران ریگن افغان مجاہدین کے جذبہ حریت کا مذاق اڑاتے ہوں گے اور گورباچوف کارمل حکومت کی کاسہ لیسیوں کے لطیفے سناتے ہوں گے کہ باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کے بعد خوش گپیوں کے لئے روس اور امریکہ کے پاس اس سے اچھا موضوع اور کیا ہو سکتا ہے؟

ایک بات ان باتوں کے علاوہ بھی ہے، جو ہم گاہے گاہے سوچتے ہیں اور وہ یہ کہ سربراہان مملکت تو خیر قومی اور بین الاقوامی موضوعات پر جیسا تیسا اظہار خیال کرتے ہوں گے۔ مگر ان کے ساتھ ان کی جو بیویاں ہوتی ہیں وہ اس دوران کیا کرتی ہیں' اگر وہ بھی "باہمی دلچسپی" کے امور پر باتیں کرتی ہیں تو یہ گفتگو تو کچھ اسی قسم کی ہوتی ہو گی' کہ "بہن یہ کپڑا کیا بھاؤ لیا ہے؟ ہائے اللہ کتنا خوبصورت پرنٹ ہے" ایک امکان یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے سربراہان کی بیویوں کی چغلیاں کرتی ہوں' بہر حال جو کچھ بھی کرتی ہوں' ان کی باہمی دلچسپی کے موضوع پر ہونے والی گفتگو سے امن عالم کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا اور یوں ہمیں ان کے ذہین شوہروں سے ان کی یہ غبی بیویاں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔

اور اب کالم کے آخر میں، ہم اپنی ایک معصوم سی خواہش کا اظہار کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو خبر بادی النظر میں خواہ کیسی لگتی ہو' مگر عوام پر اس کا رعب بہت پڑتا ہے چنانچہ ہم نے جس معصوم خواہش کا ابھی ذکر کیا' وہ یہ ہے کہ کسی روز ہم بھی صدیق سالک کے منت ترلے کر کے صدر ضیاء الحق سے ملاقات کریں اور اگلے روز اخبار میں خبر چھپوائیں کہ عطاء الحق قاسمی نے صدر ضیاء الحق سے ایوان صدر میں ملاقات کی' وہ صدر کے ساتھ ایک گھنٹہ رہے اور ان سے باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلہ خیال کیا بعد میں پتہ چلے کہ باہمی دلچسپی کے امور میں صدر کے ساتھ کسی غیر ملکی دورے کا مسئلہ سرفہرست تھا اور دوسرے نمبر پر اپنے بچے کو

سکول میں داخل کرانے کا مسئلہ تھا۔ جس کے جواب میں صدر نے کہا کہ سکول میں داخلہ تو مشکل ہے کہ اب تمام انتظامی اختیارات وزیر اعظم جونیجو کے پاس ہیں البتہ غیر ملکی دورہ ممکن ہے اور اس کے لئے ضروری شرائط آپ کسی ایسے صحافی سے حاصل کریں جو ان دوروں میں ساتھ جاتا ہو!۔

۱۷ فروری ۱۹۸۶ء

زیرِ تربیت خوشامدی

ممکن ہے ہمارے بعض خوش فہم قارئین سمجھتے ہوں کہ ہم خوشامد کے فن سے واقف نہیں یا یہ کہ ہم ارباب اختیار اور حکومت کے منظور شدہ اہل ثروت سیاست دانوں کی مدح خوانی نہیں کرنا چاہیے' حاشا کلا ایسی کوئی بات نہیں' ہم تو علاقے کے ڈپٹی کمشنر سے لے کر ملک کے صدر اور وزیر اعظم تک کی خوشامد کرنا چاہتے ہیں' کہ آخر ہمارے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' لیکن صحیح طور پر کر اس لئے نہیں پاتے کہ اس فن کی طرف متوجہ ذرا دیر سے ہوئے ہیں چنانچہ اس عرصے میں یہ فن ترقی کرتے کرتے کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ہم جھجکتے جھجکتے ایک فقرہ ارباب اقتدار کی مدح میں لکھتے ہیں مگر اگلے روز کے اخبارات میں پورا پورا کالم ان کی تعریف میں چھپا ہوتا ہے' جس سے ہماری "کیتی کرائی" پر پانی پھر جاتا ہے۔ ہم اپنے کسی "مڈل مین" کے ذریعے ارباب اقتدار کو بہت سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جناب تعریف کی "مقدار" پر نہیں "معیار" پر جائیں' مگر وہ تو خوشامد کو بھی فٹوں سے ماپتے ہیں۔ ہمارا "مڈل مین" انہیں یہ بھی سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ جناب! یہ شخص نیا نیا بے غیرت ہوا ہے' اس لئے ذرا جھجکتے جھجکتے تعریف کرتا ہے' اگر آپ کی نوازشوں کا سلسلہ جاری رہا تو انشاء اللہ پوری طرح بے غیرت ہو جائے گا' مگر اتنی تعداد میں پلے پلائے مدح خوانوں کی موجودگی میں انہیں کسی نئے مدح خوان کو پالنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی' یعنی معاشیات کا اصول ڈیمانڈ اینڈ سپلائی خوشامدیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے یہاں بھی لاگو ہونے لگا ہے!

ہمیں ان ارباب اقتدار کی کج فہمی پر تو غصہ آتا ہی ہے' ان سے زیادہ غصہ ہمیں اپنے بعض قارئین پر بھی آتا ہے' جن کے توصیفی خطوط نے ہمارا اور ہمارے بچوں کا مستقبل تاریک کر رکھا ہے' ہمارے یہ "اذیت پسند" قارئین ہمارے ان کالموں کو پڑھ کر بہت خوش ہوتے ہیں جن میں ہم نے ان ارباب اقتدار کے لتے لیے ہوتے ہیں' یہ قارئین ہمارے اس جذبہ انتقام کو جذبہ حریت سمجھتے ہوئے ہم پر داد کے ڈونگرے برسانے لگتے ہیں' جس پر ہمارا ضمیر ہمیں ملامت کرنے لگتا ہے اور ہم باقی کالم ضمیر کی آواز پر لکھنے لگتے ہیں جس کے نتیجے میں ماضی کی تمام مدح خوانی ایک بار پھر خاک میں مل جاتی ہے اور اس طرح ہمیں آئندہ ضرورت پڑنے پر ارباب اقتدار کے ہاں خوشامد کا "اکاؤنٹ" نئے سرے سے کھولنا پڑتا ہے۔

اب جب کہ ہم نے اپنے پیٹ پر سے پردہ اٹھا ہی دیا ہے' اپنے قارئین کو یہ بتلانے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ہمارے دوست اور فن خوشامد نگاری میں صاحب اسلوب ادیب جناب رطب اللسان طومارپوری فن خوشامد

میں ہمارے خاطر خواہ کامیاب نہ ہونے کی مختلف وجوہ بتاتے ہیں' جن میں سے سرفہرست وجہ وہ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ تم نے اپنی خواہشات بہت قلیل رکھی ہوئی ہیں' موصوف اس ضمن میں اکثر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں کہ تمہاری جیب میں گولڈ لیف کی ڈبی اور آوارہ گردی کیلئے گاڑی میں چالیس لیٹر پٹرول ہو تو تم اپنی اوقات بھول کر سب کو آنکھیں دکھانے لگتے ہو' تم اگر فن خوشامد میں طاق ہو بھی گئے تو ارباب اختیار سے کیا مانگو گے' گاڑی میں ڈلوانے کیلئے چالیس لیٹر پٹرول اور گولڈ لیف کا ایک ڈنڈا؟ چنانچہ ان کا کہنا ہے۔ کہ بغیر لمبی چوڑی خواہشات کے خوشامدی کہلوانا گناہ بے لذت کے زمرے میں آتا ہے' لہٰذا اس فن میں قدم رکھنے سے پہلے اپنے "عزائم" بلند کرو' مثلاً کوئی کاروبار شروع کرو' لاکھوں کروڑوں کا لون لو۔ فیکٹریاں لگاؤ ہر نئی سکیم میں پلاٹ لو اور چوگنی قیمت پر بیچ ڈالو' پریس لگاؤ نمبر نکالو۔ اخبار چلاؤ اخبار کو انڈسٹری بناؤ' اگر یہ سب کچھ نہیں کر سکتے تو پھر اپنی چونچ بند رکھو کیونکہ اپنے آپ کو خوشامدی اسٹیبلش کر کے خواہ مخواہ چھوٹے موٹے افسروں میں اپنی "ٹوہر" بنانے کی کوشش کرنا اس فن لطیف کے ضابطہ اخلاق کے منافی ہے۔

تاہم یہ نقطہ نظر ہمارے دوست حضرت رطب اللسان طومار پوری کا ہے' جس سے ہم کلی طور پر اتفاق نہیں کرتے' ہمارے بہت سے قریبی دوست ہم سے بھی چھوٹی چھوٹی خواہشات کی تکمیل کیلئے چھوٹے چھوٹے آستانوں پر سجدے کرتے پھرتے ہیں اور بہت خوش ہیں کیونکہ اصل چیز تو دل کی خوشی ہے، جو حکام رسی ہی سے ملتی ہے' تاہم ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ خوشامد ایک تو غیر مشروط نہیں ہونی چاہئے اور دوسرے پیشگی نہیں ہونی چاہئے۔ ہمارے کچھ دوست پیشگی خوشامد کر کے بہت ذلیل ہوئے ہیں کیونکہ جب اس کا عوضانہ وصول کرنے کا وقت آیا تو حکومت بدل گئی' جس سے انہیں عوضانہ تو کیا ملتا' الٹا وقتی طور پر انہیں لینے کے دینے پڑ گئے۔ وقتی طور پر ہم نے اس لئے کہا کہ تجدید خوشامد میں کچھ وقت تو بہر حال لگتا ہے۔ کچھ اسی قسم کا معاملہ غیر مشروط خوشامد کا بھی ہے خوشامد میں اتنی گنجائش ضروری ہونی چاہئے کہ انسان بوقت ضرورت بیک آؤٹ کر سکے' یعنی جب چاہے مجلس شوریٰ کا رکن بن جائے' جب چاہے مجلس شوریٰ کو گالی دینے لگے' جب چاہے اقتدار میں آجائے اور اقتدار سے رخصت ہوتے ہی صاحبان اقتدار بلکہ ملک تک کو گالیاں دینا شروع کر دے' تاہم ہمارے بیشتر خوشامدی دوست ہماری اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے کہ ان کا کہنا ہے گداگر انتخاب کرنے کا حق نہیں رکھتے' چنانچہ انہیں خوشامد بھی دوسروں کی شرائط پر کرنا پڑتی ہے۔ بہر حال یہ ساری باتیں "فروعی" نوعیت کی ہیں بنیادی چیز خوشامد کرنا ہے' ہم نے اس سلسلے میں ڈرتے ڈرتے اپنی چند آراء دی ہیں' جن کی حقانیت کا ہم دعویٰ نہیں کرتے کیونکہ ابھی ہم اس پوزیشن میں نہیں' ہماری حیثیت فی الحال ایک زیر تربیت خوشامدی کی ہے' چنانچہ اس سلسلے میں ہماری رائے کی بجائے اس ضمن کے اساتذہ کی رائے کو حتمی سمجھنا چاہئے کہ ہم نے جو کچھ سیکھا ہے' انہیں سے سیکھا ہے' ہم تو ان کی خاک پا بھی نہیں ہیں'

۱۸ر جون ۱۹۸۶ء

ایڈونچر

خیبر میل فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی' میری منزل حیدر آباد تھی اور میں تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھا اپنے سمیت دوسرے مسافروں کی کس مپرسی پر غور کر رہا تھا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خریدتے ہوئے تو میں ایڈونچر کے موڈ میں تھا مگر اب یہ ایڈونچر میرے لئے وبال جان ثابت ہو رہا تھا' کیونکہ اس ڈبے میں اگر سو مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی تو لاہور سے خانیوال تک کے سفر کے دوران غالباً دو سو مزید مسافر بغیر ریزرویشن کے سوار ہو چکے تھے' سو اس وقت صورتحال یہ تھی کہ جس نشست پر میں بیٹھا تھا' وہ چار مسافروں کے لئے تھی' مگر اب سات مسافر اس پر براجمان تھے' یہی حال دوسری نشستوں کا بھی تھا مگر اصل تکلیف دہ صورتحال تو ان "درویش صفت" مسافروں کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی' جو فرش پر بیٹھے تھے اور کچھ اس طرح ایک دوسرے میں پیوست تھے کہ ان کے درمیان میں سے ایک تنکا گزارنا بھی محال تھا' بوگی کے دونوں دروازے بھی ان فرش نشینوں کی وجہ سے بند ہو چکے تھے اور لیٹرین تک رسائی بھی ممکن نہیں تھی' کیونکہ اس کے سامنے بھی مسافر اکڑوں بیٹھے تھے' سو اب صورت یہ تھی کہ باہر سے کوئی مسافر اس ڈبے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا اور ڈبے کا کوئی مسافر باہر نہیں جا سکتا تھا! میں صبح دس بجے سے اس "بلیک ہول" میں بند تھا اور اب شام ہونے کو تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ خانیوال اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی اور بالآخر وہ ایک ہلکے سے دھچکے کے ساتھ رک گئی!

پلیٹ فارم پر خوانچہ فروشوں کی آوازوں اور مسافروں کی بھگدڑ نے فضا میں ایک عجیب "بحران" سا پھیلا رکھا تھا میں نے ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے پلیٹ فارم پر چہل قدمی کا پروگرام بنایا' مگر باہر کو جانے والے تمام راستے بند تھے' بس ایک راستہ کھلا تھا اور یہ کھڑکی کا راستہ تھا' جس میں سے باہر کودنے کے لئے مطلوبہ ہمت مجھ میں موجود نہیں تھی' کیونکہ پروگرام صرف جانے جانے کا نہیں' واپس آنے کا بھی تھا اور یہ واپسی اسی راستے سے ہونا تھی' تاہم وہ جو کسی نے کہا ہے "ہمت مرداں مدد خدا" تو میں نے بھی ہمت سے کام لیا' پہلے اپنی دونوں ٹانگیں کھڑکی کے رستے باہر نکالیں اور پھر اللہ کا نام لے کر پلیٹ فارم پر کود گیا پیاس سے میری زبان پر چھالے سے پڑ رہے تھے۔ میں نلکے کی طرف جانے کے لئے بوگیوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ پہلے میرے کانوں میں "شی شی" کی نسوانی آواز آئی' اور پھر میرے کپڑے بھیگ سے گئے میں نے ڈبے کی طرف نگاہ ڈالی تو ایک عورت اپنے بچے کو کھڑکی سے باہر کئے "شی شی" کی آوازیں نکال رہی تھی۔ اس وقت بچے کے چہرے پر ایک عجیب شانتی نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا کافی دیر بعد اس کی سنی گئی ہے۔ اگلے ڈبے میں سے ایک صاحب نے پان کی پیک پچکاری کی

صورت میں پلیٹ فارم پر پھینکی 'مگر ان کا نشانہ خطا گیا۔ کیونکہ میں خطرہ بھانپ کر ان کی زد سے نکل گیا تھا نلکے پر لوگوں کا ایک ہجوم تھا اور پانی تک رسائی نہ ہونے کے باوجود وہ سب پانی میں نہائے ہوئے تھے کیونکہ ٹونٹی "لیک" کر رہی تھی اور اس میں سے پانی پورے پریشر کے ساتھ فوارے کی صورت میں ارد گرد کھڑے لوگوں پر برس رہا تھا تھوڑے فاصلے پر دو عرب لڑکیاں بو شرٹ اور جینز پہنے اپنے ایک عرب ساتھی کے ساتھ کھڑی تھیں میں نے بائیں جانب دیکھا تو گاڑیوں کی بوگیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے والے درمیانی حصے میں ریلوے کے دو ملازم پورے اطمینان کے ساتھ بیٹھے لنچ یا ڈنر میں مشغول تھے انہوں نے ایک ہاتھ میں روٹی اور روٹی پر کباب رکھے تھے اور مکمل یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ میں نے نلکے کے "گرد و نواح" میں اپنی باری کا انتظار کیا اور جب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا تو واپس اپنے ڈبے کی طرف جانے کی ٹھانی۔ اس دوران گارڈ نے وسل بھی دے دی تھی میں نے کوشش کی کہ ڈبے میں دروازے کے راستے میں سے داخل ہوں مگر "فرش نشین" مسافروں کی وجہ سے یہ "سیل" ہو چکا تھا۔ چنانچہ میں نے افراتفری میں اپنا سر کھڑکی میں داخل کیا اور اس سلسلے کے باقی کام اندر بیٹھے ہوئے مسافروں نے انجام دیئے جنہوں نے مجھے "دھون" (گردن) سے پکڑ کر اندر کھینچا اور شکر ہے میں پورے کا پورا اندر داخل ہو گیا ورنہ اس امر کا قوی امکان موجود تھا کہ میری گردن ان کے ہاتھ میں رہ جاتی اور میرا باقی وجود پلیٹ فارم پر کھڑا بے ثباتی دنیا پر غور کرتا رہتا............

"دیکھو جی کیسا زمانہ آ گیا ہے" میرے سامنے بیٹھے ہوئے ایک گہرے گندمی مائل نوجوان نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں نے اوپر والی برتھ میں نے ریزرو کروائی تھی 'اب میں اوپر جا کر آرام کرنا چاہتا ہوں مگر یہ شخص لاہور سے برا جمان ہے اور اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا"

میں نے برتھ کی طرف نگاہ ڈالی تو ایک خشخشی سی ڈاڑھی والے ادھیڑ عمر شخص کو استراحت فرماتے پایا اس کے چہرے پر "چب" پڑے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ قانکوں جیسا تھا' میرے لئے ایسے لوگ ناقابل برداشت ہوتے ہیں جو دھونس کے ذریعے دوسروں کے حقوق غصب کرتے ہیں۔ اوپر سے اس بے آرام سفر نے بھی مجھے باؤلا بنا دیا تھا چنانچہ نوجوان کی یہ بات سن کر میں نے اس سے پوچھا "کیا تم چاہتے ہو کہ یہ شخص تمہاری برتھ خالی کر دے" اس نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے کہا تم اسے ایک دفعہ میرے سامنے یہ برتھ خالی کرنے کے لئے کہو' نوجوان نے یہ سن کر ڈرتے ڈرتے اس شخص کی پنڈلی کو ہاتھ لگایا اور کہا "بھاجی' آپ کی بڑی مہربانی اگر اب آپ مجھے آرام کرنے دیں" اس پر قانکوں جیسے چہرے والا یہ شخص غصے سے لال پیلا ہو کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور چیخ کر بولا "کیوں خالی کر دوں یہ برتھ میں مفت سفر نہیں کر رہا' میں نے بھی ٹکٹ خرچا ہوا ہے" اس پر ایک دم سے میرا پارہ چڑھ گیا اور ان لمحوں میں میں نے اپنا لٹریچر اور پروفیسری طاق پر رکھی اور آستین چڑھا کر کہا "تم نیچے اترتے ہو یا آ کر تمہیں اتاروں؟" اس پر اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھ پر حملہ آور ہونے کے لئے نیچے کی طرف جھکا۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھ پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہو گئی ہے' میری آنکھیں ابل کر باہر کو آ رہی تھیں' میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے ساتھ گتھم گتھا ہونے کے لئے اس کی طرف بڑھا مگر

دوسرے مسافروں نے آگے بڑھ کر میرا راستہ روک لیا۔ میں شاید اس وقت ان کے روکے سے بھی نہ رکتا' مگر اچانک میری نظر اس نوجوان پر پڑی جس کے حقوق کے لئے میں "مسلح جدوجہد" پر آمادہ ہو رہا تھا وہ آرام سے اپنی نشست پر بیٹھا میری طرف دیکھتا تھا اور مسکراتا جاتا تھا یہ دیکھ کر میں نے ڈبے کے مسافروں کی رائے کا "احترام" کیا اور دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"میں آپ کو پہچان گیا ہوں" اس نوجوان نے مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتے اور احمقانہ سی مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا" آپ "وارث" کے چودھری حشمت ہیں نا! مجھے اس ڈرامے میں بھی آپ کا کام بہت پسند آیا تھا!"

اب ڈبے میں رات پڑ گئی تھی' میں نے اپنی برتھ پر بستر بچھا لیا اور سونے کی کوشش میں تھا' مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر بے دھیانی میں میں نے کروٹ بدلی تو اس کا انجام کیا ہو گا کیونکہ اس برتھ کی چوڑائی کروٹ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی ڈبے میں اب مکمل سکوت طاری تھا۔ تمام مسافر اونگھ رہے تھے گاڑی کا شور اب ان کے لئے بے معنی تھا۔ کیونکہ گزشتہ تیرہ گھنٹے کے سفر کے دوران وہ اس کے عادی ہو چکے تھے۔ کچھ لوگ سیٹوں کے نیچے سوئے ہوئے تھے اور جو سیٹوں کے اوپر تھے وہ ایک دوسرے کے کاندھوں پر سر رکھ کر یوں سو رہے تھے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کے آشنا ہوں۔ فرش پر بیٹھے ہوئے لوگ دونوں ٹانگیں سکیڑ کر اپنے گھٹنوں پر سر رکھے اونگھ رہے تھے ایک مسافر نے چادر کا ایک سرا برتھ اور دوسرا اس کے مقابل سامان رکھنے والی جگہ کے ساتھ باندھا ہوا تھا اور خود اس میں لیٹا ہوا فضا میں جھول رہا تھا بہت سے مسافر ایک نشست والی سیٹ کی "چوٹی" پر بیٹھے تھے اور انہوں نے اپنے پاؤں نشست پر بیٹھے مسافر کی پشت کی طرف لٹکائے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ سیٹ کے ساتھ ٹیک نہیں لگا سکتے تھے۔ گاڑی صبح چار بجے کے قریب حیدر آباد پہنچنا تھی اب میری آنکھیں نیند سے ہولے ہولے بند ہو رہی تھیں کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ میں نہیں جانتا' میں کتنی دیر سویا بس اس اثنا میں ایک مسافر نے مجھے پاؤں سے پکڑ کر ہلایا اور کہا "بابو جی' حیدر آباد آ رہا ہے تیار ہو جائیں" میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا برتھ سے نیچے اترا۔ اپنا سامان سمیٹا اور ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر حیدر آباد کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ دوسری ٹانگ کے لئے فرش پر کوئی جگہ نہ تھی۔ مجھے حیدر آباد کی آمد کی اطلاع دینے والا مسافر میری برتھ سنبھال چکا تھا' میں قریباً آدھ گھنٹے تک اسی پوزیشن میں کھڑا رہا۔ بالآخر میں نے اس کی طرف رجوع کیا تاکہ اس صورت حال کے بارے میں اس سے استفسار کر سکوں۔ مگر وہ گہری نیند میں تھا اور انتہائی خوفناک قسم کے خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے ڈبے کے باقی مسافروں کی طرف نظر ڈالی وہ اونگھتے اونگھتے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں کھولتے جو بے خوابی کی وجہ سے انگارے کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ حیدر آباد ابھی دور تھا میں بگلے کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑا تھا اور میرے جسم کا یہ حصہ اب بالکل بے جان ہو چکا تھا۔ قریب تھا کہ میری مدافعت دم توڑ دیتی اور میں کھڑے کھڑے کسی پر گر پڑتا کہ ٹرین حیدر آباد کے پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح فرش پر پڑے ہوئے اشرف المخلوقات کے جسموں پر پاؤں رکھتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اپنا سامان باہر پلیٹ

فارم پر پھینکا اور پھر کھڑکی میں سے باہر پلیٹ فارم پر چھلانگ لگادی۔

اسٹیشن سے باہر برآمدے میں لوگ کچے فرش پر بے سدھ پڑے تھے' اس وقت فضا میں خاصی خنکی تھی' مگر ان کے جسموں پر چادر نہیں تھی اور ان کے بازو ہی ان کے سرہانے تھے۔ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں میرے ہم سفر اور یہ سب لوگ غالباً میری ہی طرح "ایڈونچر" کے موڈ میں تھے بلکہ مہم جوئی میں مجھ سے کہیں زیادہ تھے کہ میں تو اس روز چند گھنٹوں کے لئے ان کے دکھوں میں شامل ہوا تھا' جبکہ ان کی ساری زندگی اسی طرح بسر ہوتی ہے!

۷ انومبر ۱۹۸۱ء

ٹنڈ اور ٹھونگے

ہم نے بزعم خود گرمیوں کو رخصت کر دیا تھا مگر گذشتہ چند دنوں میں موسم نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ گرم ہواؤں کی جگہ خوشگوار ہواؤں نے لے لی ہے اور جنھوں نے چارپائیاں کمروں سے نکال کر صحن میں ڈال دی تھیں انہوں نے دوبارہ صحن سے کمروں کا رخ کیا ہے لیکن یہ بہت بے اعتبارا موسم ہے' چنانچہ اس امر کا شدید امکان موجود ہے کہ جب یہ سطور شائع ہوں اس وقت لو چل رہی ہو اور چارپائیاں کمروں سے نکل کر صحن میں' در بدر صحن سے مکان کی چھتوں پر پہنچ چکی ہوں۔

مگر کچھ لوگ دور اندیش بھی ہوتے ہیں' وہ جانتے ہیں کہ گرمیوں نے بہر حال سٹارٹ لے لیا ہے۔ آج نہیں تو کل یہ اپنا اصل روپ دکھائیں گی اور خلق خدا "ہاں ہاں" کرتی نظر آئے گی۔ چنانچہ ان لوگوں نے گرمی کی پوری شدت کا انتظار کئے بغیر ابھی سے حفظ ماتقدم کے طور پر ٹنڈیں کرانا شروع کر دی ہیں۔ سوان دنوں میں ہم نے ایک نہیں اکٹھی تین ٹنڈیں دیکھی ہیں۔ ان سر منڈانے والوں میں سے ایک نے تو اپنی ٹنڈ کے سلسلے میں تمام روائتی لوازمات پورے کئے تھے' یعنی پہلے سیدھے استرے سے سر منڈایا تھا' پھر الٹے استرے سے "فنشنگ" کرائی تھی۔ اس کے بعد آم کی گٹھلی سے اس چمکتی دمکتی شفاف ٹنڈ پر رگڑائی کرائی گئی تھی اور آخر میں مزید چمک کے لئے سرسوں کا تیل لگایا گیا تھا۔ سو یہ نوجوان جب اپنی چندیا کے ساتھ سامنے آیا تو "لشکارا جاوے گلی گلی" کا منظر آنکھوں کے سامنے آگیا ہم نے اس نوجوان سے پوچھا "تم نے ٹنڈ کیوں کرائی ہے" نوجوان ستم ظریف تھا" بولا " آگے گرمیاں آرہی ہیں سورج کی تیز کرنیں اس ڈھلان پر پڑیں گی تو خود بخود پھسلتی چلی جائیں گی "

نوجوان کی اس بات سے ہم نے جانا کہ گو یہ خاصا ستم ظریف ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بھولا بھی ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ بالفرض محال اگر سورج کی تیز کرنوں سے بچ گا تو یار لوگوں کے ٹھونگوں کی زد میں آجائے گا۔ چمکتی دمکتی ٹنڈ اپنے سامنے پاکر ہم نے کئی شرفا کے ہاتھ میں کھجلی ہوتے دیکھی ہے اور پھر لڑائی ہوتے دیکھی ہے۔ ایک سنیما میں ایک چندیا اپنے سامنے پاکر ایک "شریف" آدمی کے ہاتھوں میں کھجلی ہوئی اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ شرط بد کر اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور "اوئے اشرف تم یہاں بیٹھے ہو" کہہ کر ٹھاپ لگا دی "صاحب ٹنڈ" نے مڑ کر دیکھا تو انہوں نے معذرت کی کہ انہوں نے یہ بے تکلفانہ حرکت انہیں اشرف سمجھ کر کی تھی۔ اس وضاحت پر یہ صاحب اپنی چندیا سہلاتے ہوئے چند قطاریں چھوڑ کر آگے ایک نشست پر بیٹھ گئے۔ ٹھاپ مارنے والے کے ہاتھوں میں کھجلی ابھی تک ہو رہی تھی۔ سو اس نے ایک بار پھر اپنے دوستوں کے ساتھ شرط باندھی اور

اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان صاحب کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا دو منٹ سانس لینے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور "اوئے اشرف! تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو، میں تمہارے دھوکے میں ایک شریف آدمی کو پیچھے چپت لگا آیا ہوں" کہہ کر ایک ٹھاپ اور لگا دی۔ اس شریف آدمی نے تلملا کر پیچھے دیکھا اور صرف جھنجھلا کر رہ گیا کیونکہ ٹھاپیں اسے نہیں "اشرف" کو پڑ رہی تھیں۔

ہمیں خدشہ یہ ہے کہ آنے والے موسم گرما میں بھی یہی کچھ ہونا ہے۔ یعنی ٹھاپیں مارنے والوں نے اشرف کا نام لے کر سب کو ٹھاپیں مارنی ہیں۔ سو ہمیں ذاتی طور پر ٹنڈ کرانا ایک خسارے کا سودا لگتا ہے۔ اس فعل کا مطلب یہ ہے کہ سورج کی کرنوں کو براہ راست "طبع آزمائی" کا موقع دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ٹھاپیں مارنے والے "یاران نکتہ داں" کے لئے بھی "صلائے عام" ہو ظاہر ہے یہ کوئی دانش مندی نہیں ہے۔ سو جس نے ٹنڈ کرانی ہے وہ اپنے رسک پر کرائے۔ ٹھونگوں کے ذمہ دار ہم نہ ہوں گے۔

۱۲ اپریل ۱۹۷۸ء

حافظہ

.ہمارے ایک پروفیسر دوست کا حافظہ بہت کمزور ہے یہ ابھی کل کی بات ہے کہ وہ صبح جلدی گھر سے نکلے ' کیونکہ کالج سے دیر ہو رہی تھی ' لہٰذا انہوں نے ناشتہ بھی نہیں کیا اور سیدھا کالج کی راہ لی ' راستے میں ان کا موٹر سائیکل پنکچر ہو گیا ' اور جب آدھ گھنٹہ اس کی مرمت پر ضائع ہو گیا ' تو انہوں نے سوچا کہ کالج سے دیر تو ہو ہی گئی ہے ' لہٰذا کیوں نہ کسی ہوٹل سے ناشتہ کر لیا جائے چنانچہ انہوں نے پورے ٹھاٹھ سے ناشتہ کیا۔ اور پھر سگریٹ سلگا کر بیرے کو بل لانے کے لئے کہا جب بیرا بل لایا تو انہوں نے بٹوہ نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ان لمحوں میں انہیں معلوم ہوا کہ بٹوہ تو وہ گھر ہی بھول آئے ہیں اور پنکچر والے کو جو پیسے دیئے تھے وہ اتفاقاً جیب کے کسی کونے میں پڑے ہوئے تھے۔ بہر حال دکاندار شریف آدمی تھا۔ اس نے ان کی پریشانی دیکھی تو کہا کوئی بات نہیں بابو جی ' پیسے پھر آ جائیں گے موصوف خاصے نادم ہوئے اور ایک بار پھر کالج کی راہ لی راستے میں چائے کی دکان پر نظر پڑی تو چائے پینے کے لئے رک گئے اور بل کی ادائیگی کے وقت ایک بار پھر انہیں یاد آیا کہ بٹوہ گھر ہی پر بھول آئے ہیں۔ اتفاق سے یہ دکاندار بھی بھلے مانس تھا سو اس نے بھی یہی کہا کہ کوئی بات نہیں بابو جی ' پیسے پھر آ جائیں گے پروفیسر صاحب کو کچھ ضروری کاغذات فوٹو سٹیٹ کروانا تھے ' چنانچہ راستے میں فوٹو سٹیٹ کی دکان دیکھ کر موٹر سائیکل سے اترے مگر دکان میں داخل ہوتے وقت انہیں اچانک یاد آیا کہ بٹوہ تو وہ گھر ہی پر بھول آئے ہیں ' سو الٹے پاؤں واپس آ گئے۔ راستے میں ایک بار پھر ایک دکان پر سگریٹ لینے کے لئے رک گئے اور سگریٹ کی ڈبی جیب میں ڈالنے کے بعد انہیں یاد آیا کہ بٹوہ تو وہ گھر ہی پر بھول گئے ہیں چنانچہ انہوں نے سگریٹ کی ڈبیہ دکاندار کو واپس کی اور کہا " میں ذرا ایک کام نمٹا آؤں ' واپسی پر سگریٹ لیتا جاؤں گا "

ممکن ہے ہمارے پروفیسر دوست کے اس کمزور حافظے کے محرکات کچھ اور بھی ہوں مگر اس قسم کے کمزور حافظے والے لوگ تو ہم نے بہر حال دیکھے ہیں کہ جنہیں کچھ یاد رہ جاتا ہے اور کچھ بھول جاتا ہے ' مثلاً ہمارے ایک اور دوست گذشتہ روز اس بات پر سخت پریشان نظر آ رہے تھے کہ ان کا حافظہ لین دین کے معاملے میں بے حد کمزور ہو گیا ہے ' مثلاً وہ بتا رہے تھے کہ ان کا سو روپیہ حامد نے دینا ہے ' ڈھائی سو روپے امجد کی طرف ہیں ' پچاس روپے نواز نے دینے ہیں ' سوا سو روپیہ مسعود بھٹی کی طرف نکلتا ہے ' پونے دو سو روپے احسان الحق نے دینے ہیں ' ایک سو چالیس روپے ارشد کیانی کی طرف ہیں۔ مگر یہ سب کچھ ان کے ذہن سے محو ہو چکا ہے اور یہ کہ اس وقت بڑی مشکل سے انہیں یہ نام اور رقم یاد آئی ہے اسی طرح کچھ لوگوں کے پیسے ہمارے اس دوست کی طرف نکلتے ہیں اور

یہ بات ہم نے انہیں یاد دلائی مگر وہ اپنی اور ہماری تمام تر کوشش کے باوجود ان لوگوں کے نام یاد نہ کر سکے ' جن کے پیسے انہوں نے دینے ہیں۔ چنانچہ بار بار اپنے سر پر دو ہتڑ مار کر اپنے حافظے کو کوستے رہے۔

ویسے کمزور حافظے والا ایک طبقہ اور بھی ہمارے درمیان موجود ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس طبقے کے افراد کی حالت سب سے زیادہ قابل رحم ہے یہ کم تنخواہ پانے والے لوگوں کا طبقہ ہے۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو انہیں تنخواہ ملتی ہے اور دس تاریخ کو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہے ہوتے ہیں کہ یہ تنخواہ آخر گئی کدھر ہے انہیں بہت یاد دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ بھائی فلاں فلاں کاموں پر خرچ ہو گئی ہے 'مگر ان کی تسلی نہیں ہوتی۔ کمزور حافظے والا ایک طبقہ عشاق کا بھی ہے اور ان کے حافظے کی کمزوری نہائت خطرناک قسم کی ہے۔ اسی گروہ کے ایک شاعر ظفر اقبال کا شعر ہے۔

ظفر ضعف دماغ اب اس سے زیادہ اور کیا ہو گا!
وہاں جاتا ہوں اور پھر واپس آنا بھول جاتا ہوں

چنانچہ جس طرح فلموں میں ہیرو کے سر پر چوٹ لگنے سے اس کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس آ جاتی ہے 'اسی طرح ان عشاق کی کھوئی ہوئی یادداشت بھی محلے کے نوجوان کچھ اسی قسم کے طریقوں سے واپس لاتے ہیں۔

اور اب اگر ہم کمزور حافظے والوں کا موازنہ کرنے پر تل ہی گئے ہیں تو آخر میں کمزور ترین حافظے والے طبقے کا ذکر بھی کر ہی دیں اور ہمارے نزدیک یہ طبقہ 'طبقہ امراء ہے اس کے افراد اتنی محنت سے دولت کماتے ہیں مگر انہیں اپنی دولت کی تفصیل ہی یاد نہیں رہتی۔ ان کے کمزور حافظے کا تو یہ عالم ہے کہ کسی ہوٹل میں کھانا کھا کر بل منگواتے ہیں تو انہیں پتہ چلتا ہے کہ یہ ہوٹل تو انہی کا ہے۔ چنانچہ ان کے انتقال کی خبر بھی کچھ اس طرح چھپتی ہے کہ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوہ اور بیس کارخانے سوگوار چھوڑے کہا جاتا ہے کہ ملک میں جو غیر فطری مہنگائی پائی جاتی ہے اور اس کے علاوہ معاشرے میں جو بے شمار قباحتیں موجود ہیں 'ان کا ایک سبب اس طبقے کے بیشتر افراد کی ہوس زر بھی ہے ممکن ہے ایسا ہی ہو 'تاہم ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس میں ان کی نیت کا کوئی دخل نہیں بلکہ سارا قصور ان کے حافظے کا ہے جو اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ ان میں سے بیشتر کو اب خدا بھی یاد نہیں رہا۔

۲۳ فروری ۱۹۸۳ء

حاتمِ دوراں

ایک حاتم دوراں جو زمانے کی نظروں سے پوشیدہ ہیں' مگر بحمد اللہ ہم پر وہ ظاہر ہیں اور گاہے گاہے ان سے ملاقات بھی ہوتی رہتی ہے ابھی گذشتہ روز ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا' شرف ملاقات کیا' شرف مہمانی حاصل ہوا کہ ان کے ہاں جانا شرف مہمانی ہی حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی گھنٹی دے کر چپڑاسی کو بلایا اور کہا صاحب کے لئے چائے لے کر آؤ اور ہاں دیکھو' ساتھ ذرا اچھے سے بسکٹ بھی لانا پھر اس کے بعد چائے پیتے ہوئے انہوں نے ہمیں مخاطب کیا اور کہا "صاحب' پتہ نہیں وہ کیسے لوگ ہیں' جو پیسے جمع کرنے میں لگتے رہتے ہیں' اپنی تو یہ عادت ہے کہ جو کماؤ وہ خرچ کرو' اب آپ چائے پی رہے ہیں بسکٹ کھا رہے ہیں' مجھے خوشی ہو رہی ہے' اگر دیکھا جائے تو ان چھ سات روپوں کی بھلا کوئی وقعت ہے چھ سات روپے تو آدمی راہ چلتے فقیر کو بھی دے دیتا ہے' لیکن جو لطف آپ کو چائے پیتے اور بسکٹ کھاتے دیکھ کر آ رہا ہے' اس کا تو کوئی بدل نہیں ہے"۔ اتنے میں ایک صاحب اور کمرے میں آ گئے ہمارے اس حاتم دوراں نے چپڑاسی کو ایک کپ اور لانے کے لئے کہا' بسکٹوں کی پلیٹ ان کی طرف سرکائی اور بولے "جناب' مہمان کو دیکھ کر میرے چہرے پر چمک آ جاتی ہے' مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے اور وہ اپنا رزق اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اب آپ جو یہ بسکٹ کھا رہے ہیں' ان پر آپ کی مہر لگی ہوئی تھی' میں تو صرف وسیلہ بن رہا ہوں۔ یہ تو قلندروں کا ڈیرہ ہے' یہاں سارا دن لوگ آتے ہیں اور جو ان کے مقدر میں ہے لے جاتے ہیں' یہ سب اس کی ذات کا کرم ہے' میں بھلا کس قابل ہوں"۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ہمارے اس حاتم دوراں نے ٹیلیفون اٹھایا اور دوسری طرف موجود صاحب کا حال احوال پوچھنے کے بعد کہا "بس گزر رہی ہے قاسمی صاحب بیٹھے ہوئے چائے پی رہے ہیں' بسکٹ کھا رہے ہیں یہ بس اس کی ذات کا کرم ہے' وہ دیتا ہے ہم خرچ کرتے ہیں۔ یہ جائیں گے تو کچھ اور دوست آ جائیں گے۔ جس نے چائے پینا ہوتی ہے وہ فقیر کے ڈیرے کا رخ کرتا ہے۔ اس کی ذات کا بڑا کرم ہے میں کس قابل ہوں"۔ اس دوران ہم نے ان سے اجازت چاہی' مگر انہوں نے بڑی محبت بلکہ شفقت سے ہمارا ہاتھ پکڑ کر واپس کرسی پر بٹھا دیا اور کہا ایک کپ چائے اور پئیں۔ چائے تو آپ پئیں گے لیکن اس سے خون میرا بڑھے گا ہم نے ان کا اصرار دیکھا تو کہا کہ مجھے ایک جگہ جانا تھا چلئے میں فون کر کے انہیں مطلع کر دیتا ہوں یہ سن کر انہوں نے خندہ پیشانی سے ٹیلیفون ہماری طرف سرکایا اور بولے "بسم اللہ بسم اللہ یہ ٹیلیفون ہی آپ کا ہے آپ جیسے کتنے دوست یہاں سے دن میں بیسیوں کالیں کرتے ہیں' مجھے مسرت ہوتی ہے کہ میرا ٹیلیفون کسی کے کام آ رہا

ہے۔ ساٹھ پیسے تو انسان راہ چلتے یونہی گٹر میں پھینک دیتا ہے اور آپ تو ماشاءاللہ صاحب علم آدمی ہیں۔ ساٹھ پیسے آپ کے مقابلے میں کیا ہیں؟ یہ تو ہم آپ کے سر سے وار کر پھینک دیں! " اتنے میں دوسرے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، انہوں نے ریسیور اٹھایا اور کہا "اللہ کا شکر ہے۔ جی رہے ہیں۔ قاسمی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ چائے پی رہے ہیں۔ بسکٹ کھا رہے ہیں۔ ٹیلیفون کر رہے ہیں۔ یہ تو قلندروں کا ڈیرہ ہے۔ یہ سب اس کی ذات کا کرم ہے۔ میں کس قابل ہوں! "۔

ان حاتم دوراں کے علاوہ ایک صاحب اور بھی ہیں جو سخاوت اور دریادلی میں اگر ان کی ٹکر کے نہیں تو ان کے قریب قریب ضرور ہیں۔ انہوں نے ایک دفعہ ہماری دعوت کی۔ ہم ان کے ہاں پہنچے تو دنگ رہ گئے۔ دیکھا دیگیں کھڑک رہی ہیں۔ شامیانے لگے ہوئے ہیں۔ سوڈیڑھ سو آدمی وہاں پہلے سے ہمارے منتظر ہیں ہمیں کئی بار اپنے بارے میں یہ شبہ گذرا تھا کہ ہم خاصے مشہور اور مقبول انسان ہیں مگر اس روز اپنی آنکھوں سے اپنی قدر عزت افزائی دیکھ کر ہمیں کچھ یقین سا ہو گیا کہ اپنے بارے میں ہمارے خدشات درست ہیں۔ ان حاتم دوراں (ثانی) نے بڑے پرتپاک طریقے سے ہمارا استقبال کیا۔ وہاں بیٹھے احباب سے ہمارا تعارف کرایا اور پھر اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر ہم سے درخواست کی کہ ہم اپنا تازہ کلام سنائیں ہم نے تعمیل ارشاد میں ایک غزل سنائی۔ اس پر وہ دوبارہ کھڑے ہوئے اور ہمیں مخاطب کر کے کہا، اب چند شعر فی البدیہہ عزیزی عاطف سلمہ اللہ کے بارے میں بھی ہو جائیں۔ جس کی آج رسم ختنہ ہے۔ یہ حسن **اتفاق** ہے کہ آپ کے ساتھ شام اور عزیزی عاطف سلمہ اللہ کی رسم ختنہ کی تقریب ایک ہی روز منعقد ہو رہی ہے۔ ہمارا جی تو چاہتا تھا کہ اس حسن **اتفاق** پر خود قربان ہو جائیں یا انہیں قربان کر دیں۔ مگر افسوس ملکی قوانین ہمارے ارادے کی راہ میں حائل ہو گئے۔ انگریز کے زمانے کے ان قوانین پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔

۱۳ جون ۱۹۸۲ء

بچارا

"اس سے ملو' یہ میرا دوست ہے!"
" آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی!"
"اس بچارے نے دو دن سے روٹی نہیں کھائی"۔
"کیا مطلب؟"
"صحیح کہہ رہا ہوں 'کل ایک گلاس پانی پیا تھا' آج صبح تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے کھائے!"
"اللہ تعالیٰ اپنا رحم کرے!"
"اب تو یہ عادی ہو گیا ہے 'کیونکہ اس بچارے کی عمر اسی طرح بسر ہو رہی ہے' کبھی روٹی کھائی' کبھی نہ کھائی' اسے کوئی فرق نہیں پڑتا!"
"ان کے بچے کتنے ہیں؟"
"تین ہیں!"
ان کی عمریں کتنی ہیں؟"
"وہ کافی بڑے ہیں!"
"وہ کس حال میں ہیں؟"
"اللہ کا شکر ہے' وہ ٹھیک ٹھاک ہیں' کھاتے پیتے ہیں!"
"اگر بچوں کو باپ کی فکر نہیں' تو بطور دوست تمہارا یہ فرض ہے کہ تم ان کا خیال رکھو!"
"میں تو کافی خیال رکھتا ہوں مگر اس کی تو قسمت ہی پھوٹی ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ قسمت سے تو جنگ نہیں لڑی جا سکتی!"
"میں ان کے لئے کھانا منگواتا ہوں!"
"یہ نہیں کھا سکے گا' اسے بلڈ پریشر کی تکلیف ہے' ڈاکٹر نے نمک منع کیا ہوا ہے"۔
"چائے وغیرہ منگوا لیتا ہوں"۔
"وہ پھر بغیر چینی کے منگوانا' اسے شوگر کی تکلیف بھی ہے!"
"تمہاری ان سے دوستی کب کی ہے؟"

"بیس پچیس سال ہونے کو آئے ہیں"۔

"مگر اس دوستی کا فائدہ؟"

"کیوں؟"

"کیا تم نے کبھی اپنے دوست کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی ہے؟"

"میں نے تمہیں بتایا نا کہ انسان حالات کے خلاف جنگ کر سکتا ہے 'قسمت کے خلاف نہیں لڑ سکتا اور اس کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی ہے! میرے بہت سارے غریب رشتے دار ہیں 'حسب توفیق ان کی کچھ نہ کچھ مدد کرتا رہتا ہوں 'اس سے انہیں اپنی حالت سنبھالنے میں مدد ملتی ہے 'کیونکہ ابھی ان کی قسمت ان کے خلاف نہیں ہوئی۔ تم اس کے کپڑے دیکھ رہے ہو؟"

"ہاں دیکھ رہا ہوں!"

"مجھے شرم آتی ہے اسے ان کپڑوں میں اپنے ساتھ لے کر پھرتے ہوئے 'مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"تم کیوں کچھ نہیں کر سکتے؟"

"میں نے کہا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کے آگے بے بس ہو جاتا ہے!"

"اگر تمہارے یہ دوست برا نہ مانیں 'تو میرے پاس کچھ پیسے میری ضرورت سے زائد ہیں 'میں انہیں بطور قرض حسنہ دے سکتا ہوں 'جب کبھی ان کی حالت بہتر ہو 'یہ مجھے لوٹا دیں!"

"ارے بھائی 'تمہارے قرض سے اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آ سکتی 'قرض تو اس نے کئی بنکوں سے لے رکھے ہیں!"

"میرا قرض اس نوعیت کا نہیں ہے 'انہیں اس کی واپسی کے بارے میں تردد نہیں کرنا پڑے گا"۔

"ارے یار اس کا مسئلہ وہ نہیں ہے 'جو تم سمجھ رہے ہو!"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے؟"

"اس کی قسمت پھوٹ گئی ہے! تم اس کے لئے صرف دعا کرو!"

"ویسے ان کی یہ حالت کب سے ہے؟"

"گذشتہ چند برس سے 'اس سے پہلے اللہ کا بڑا فضل تھا!"

"اس وقت یہ کیا کیا کرتے تھے؟"

"یہ اس وقت ایک بنک میں کلرک تھا 'قریباً ہزار روپیہ تنخواہ تھی 'یہ رقم اس کے اور اس کے بچوں کے لئے اگرچہ کافی نہیں تھی 'مگر پھر بھی گھر کا خرچ چل جاتا تھا 'یہ دن میں دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتا تھا 'بیوی بچوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا تھا 'خوش رہتا تھا 'سونے کا بہت شوقین تھا 'چنانچہ اسے اگر دفتر سے جھاڑ پڑتی تھی 'تو صرف اسی وجہ سے پڑتی تھی کہ یہ سو کر دیر سے اٹھتا تھا اور پھر دیر سے دفتر پہنچتا تھا 'مگر اب تو نیند بھی اس کی آنکھوں سے دور رہتی ہے!"

"مگر پھر ہوا کیا؟"

پھر ہوا یہ کہ اس کی قسمت پھوٹ گئی' اس نے سوچا کہ اتنی تنخواہ میں گزارا ذرا مشکل سے ہوتا ہے' چنانچہ اس نے ایک اور جگہ پارٹ ٹائم نوکری کر لی' جس سے اس کے حالات بہتر ہو گئے' اس نے ہر ماہ تھوڑی بہت رقم پس انداز بھی کرنا شروع کر دی' حتیٰ کہ اس کے پاس تھوڑا سا سرمایہ جمع ہو گیا!

"پھر؟"

"پھر اس نے ایک دوست کے ساتھ شراکت کر کے ایک چھوٹا موٹا کاروبار شروع کیا' جس میں اسے خاصا منافع ہوا"۔

"پھر؟"

"پھر اس نے وسیع پیمانے پر کاروبار کا آغاز کیا' بنکوں سے لاکھوں کروڑوں روپے کے قرضے لئے اور یوں یہ بچارا دن بدن امیر سے امیر تر ہوتا گیا۔ اس وقت اس کی کروڑوں کی جائیداد ہے' بڑی بڑی کمپنیوں کے میجر شیئرز اس کے پاس ہیں اور اس کا شمار تمہارے ملک کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے!"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ انہوں نے دو دن سے روٹی نہیں کھائی' کپڑوں کی حالت خستہ ہے' ایک ہفتے سے سوئے نہیں؟"

"ہاں صحیح کہہ رہا تھا' اس بچارے کے پاس اب ان چیزوں کے لئے وقت ہی نہیں ہے' کاروبار کی پریشانیاں اسے گھیرے رکھتی ہیں' ان پریشانیوں نے اسے طرح طرح کے امراض میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ جو کھانا چاہتا ہے' کھا نہیں سکتا' جو پہننا چاہتا ہے پہن نہیں سکتا حتیٰ کہ یہ سونا چاہتا ہے مگر سو نہیں سکتا' یہ جو امیر ترین آدمی ہے' یہ غریب ترین آدمی ہے' اس نے زندگی میں بہت اچھے دن دیکھے ہیں' تم اس کے لئے دعا کرو!"

۱۴ دسمبر ۱۹۸۳ء

ظاہر کی آنکھ

چندروز قبل جب ہم اپنے مکان کو مڑنے والی سڑک پر پہنچے تو نکڑ پر ہم نے ایک دبلے پتلے سے شخص کو ایک مکان کی دیوار کے نیچے اینٹوں پر اینٹیں رکھ کر ایک چبوترا سا بناتے دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم دوبارہ ادھر سے گزرے تو ان اینٹوں کو اس نے ایک دری سے چھپادیا تھا اور مکان کی دیوار کے ساتھ تین قد آدم بورڈ کھڑے کر دیئے تھے۔ جس سے دیوار چھپ گئی تھی ان بورڈوں میں سے ایک بورڈ پر کسی بارعب پہلوان کی تصویر تھی جس نے سر پر پگڑی باندھی ہوئی تھی اور ہاتھوں میں مگدر پکڑا ہوا تھا۔ دوسرے بورڈ پر موٹے موٹے لفظوں میں لکھا ہوا تھا "جلنے والے کا منہ کالا" اور تیسرے بورڈ پر اتنے ہی جلی حروف میں عرفی کا یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں

آواز سگاں کم نہ کند رزق گدارا

یہ سب کچھ دیکھ کر ہم پر دہشت سی طاری ہوگئی۔ چنانچہ ہم نے وہاں کھڑے ایک شخص سے تصویر والے بورڈ کے بارے میں پوچھا کہ اس پر جو تصویر ہے یہ کن پہلوان صاحب کی ہے؟ تو اس نے ایک دبلے پتلے اور نحیف ونزار شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ ان پہلوان صاحب کی تصویر ہے" اور یہ وہی "پہلوان صاحب" تھے۔ جنہیں ہم نے صبح اینٹیں جوڑ جوڑ کر یہ چبوترا بناتے دیکھا تھا۔ پھر ہم نے باقی دو بورڈوں یعنی جلنے والے کا منہ کالا اور آواز سگاں کم نہ کند .... کے بارے میں دریافت کیا، کہ یہ ساری دھمکیاں کس کے لئے ہیں؟ تو اس نے بتایا کہ یہ "پہلوان صاحب" یہاں کوئی کاروبار شروع کرنے والے ہیں اور یہ ساری دھمکیاں مستقبل کے اس حریف دکاندار کے لئے ہیں، جو کبھی ان کے سامنے دکان کرے گا۔ تب ہم نے پوچھا کہ ان پہلوان صاحب کا ارادہ یہاں کس قسم کا کاروبار کرنے کا ہے؟ اس پر اس شخص نے بے خبری کا اظہار کیا، تاہم جب ہم اگلے روز ادھر سے گزرے تو ہمیں معلوم ہوا کہ پہلوان صاحب کا ارادہ یہاں پکوڑے لگانے کا ہے، کیونکہ ایک چولہے پر انہوں نے کڑاہی چڑھائی ہوئی تھی برابر میں ایک تھال پڑا ہوا تھا، اور خود پہلوان صاحب مٹی کی ایک کنالی میں دونوں ہاتھوں سے بیسن مل رہے تھے!

اور اب اگر سچ پوچھیں تو ایک قد آدم بورڈ پر پہلوان صاحب کی بارعب تصویر اور دوسرے دو بورڈوں پر ان کی خود اعتمادی کی مظہر عبارتیں پڑھ کر ہم تو سمجھے بیٹھے تھے کہ کوئی بڑا بزنس مین یہاں اپنے کاروبار کا آغاز کرنے والا ہے، جس کے بعد علاقے کی اکثر دکانیں بند ہو جائیں گی، مگر جب ہم نے اصلی پہلوان صاحب کو دیکھا اور انہیں

پکوڑے لگاتے پایا' تو ہمیں خاصا دھچکا سا محسوس ہوا اور ظاہر ہے اس میں ہمارا اپنا قصور تھا کیونکہ بزرگوں نے تو پہلے ہی کہا ہے کہ ۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

اس ظاہر کی آنکھ سے تماشا کرنے کا خمیازہ ہم اس سے پہلے بھی کئی بار بھگت چکے ہیں۔ چنانچہ ہم نے بڑے بڑے ادبی پہلوان دیکھے کہ سر پر دستار اور ہاتھ میں مگدر ہے' ان کی طرف سے بلند بانگ دعوے بھی ہماری نظر سے گذرے' مگر جب "ظاہر کی آنکھ" سے تماشا کیا' تو انہیں پکوڑے بیچتے پایا۔ کئی دانشوروں نے بھی پبلک کے سامنے اپنی یہی تصویر پیش کی۔ لیکن جب انہیں قریب سے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ جو سودا وہ بیچتے ہیں' اس کے لئے صرف ایک کڑاہی' ایک تھال اور ایک کنالی درکار ہے' بعض علمائے کرام کے بڑے بڑے بورڈ دیکھے اور دل پر ہیبت طاری ہوئی' مگر جب ذرا قریب ہوئے تو دیکھا' نہ سر پر دستار ہے' نہ ہاتھ میں علم کا عصا ہے بس ایک کڑاہی ہے اور ایک تھال ہے۔ حکومتوں کی پبلسٹی فلموں میں بھی حکومتوں کو سر پر پگڑی باندھے اور ہاتھ میں مگدر پکڑے دیکھا' مگر جب "ظاہر کی آنکھ" سے ان "پہلوانوں" کو دیکھا تو ان کی جان "گوڈوں" میں اڑی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے پبلسٹی بورڈ دیکھے تو یہ تاثر ملا کہ ان کی "دستار بندی" کی تقریب میں پورے ملک کے عوام شریک ہوئے تھے اور یہ مگدر بھی انہوں ہی نے ان کے ہاتھ میں دیا ہے' مگر قریب سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ ان کے لیڈر اپنے گھر کی سیڑھیاں اتریں تو ان کے لئے "علاقہ غیر" شروع ہو جاتا ہے' سو اب تو ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قصور دراصل ہماری بصارت کا نہیں بصیرت کا ہے' یعنی بصیرت کی دو طرفہ میں کمی بیشی کی وجہ سے ہمیں بڑے بڑے ادبی' علمی' مذہبی اور سیاسی پہلوان بغیر دستار اور بغیر مگدر کے نظر آنے لگتے ہیں' ورنہ ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے اور یہ جو ہم انہیں پکوڑے بیچتے دیکھتے ہیں تو یہ ظاہر کی آنکھ سے تماشا کرنے کا نتیجہ ہے' جس کی ذمہ داری ظاہر ہے' ان پر عائد نہیں ہوتی!

۴ اگست ۱۹۸۲ء

باگڑ بِلّا میاؤں پوری

س...... محترم باگڑ بلا صاحب! میں آپ کو پاکستان کے ادیبوں کی طرف سے خوش آمدید کہتا ہوں کہیئے آپ کا سفر کیسا گزرا؟

ج...... بہت بہت شکریہ! میں واپسی پر سفرنامہ لکھوں گا وہ پڑھ لیجئے گا۔ اس میں آپ کا بھی ذکر ہو گا۔ آپ کا اسم شریف؟

س...... اس خاکسار کو لکڑہارا اٹانک پوری کہتے ہیں۔ ذرا اڈانزی میں لکھ لیجئے گا۔

ج...... اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں لین دین میں بہت کھرا ہوں!

س...... باگڑ بلا صاحب! آپ یہ بتایئے کہ پاکستانی افسانہ نگاروں میں سے آپ کو کون کون سے افسانہ نگار پسند ہیں؟۔

ج...... انور سجاد 'انتظار حسین اور لکڑہارا اٹانک پوری!

س...... خالدہ حسین

ج...... ہاں خالدہ حسین

س...... مسعود اشعر

ج...... ہاں مسعود اشعر۔ اور اس کے علاوہ آپ بلا تکلیف اپنے اور دوستوں کے نام بھی میری طرف سے لکھ لیجئے۔ آپ کے دوست ہمارے دوست ہیں۔

س...... بہت بہت شکریہ باگڑ بلا صاحب مگر اس سے پہلے ایک انٹرویو میں آپ' محمد منشا یاد' مظہر الاسلام' میرزا حامد بیگ' رشید امجد' احمد داؤد' فریدہ حفیظ' احمد جاوید' مشتاق قمر' عبدالوحید اور رخسانہ صولت کو اپنے پسندیدہ افسانہ نگار قرار دے چکے ہیں۔

ج...... جی ہاں مگر یہ انٹرویو میں نے راولپنڈی میں دیا تھا۔

س...... اسد محمد خان' انور سن رائے' رضیہ فصیح احمد' ذکاء الرحمٰن' نسیم درانی' علی حیدر ملک' زاہدہ حنا اور نگار سجاد کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟۔

ج...... میں چند دنوں کے بعد کراچی جا رہا ہوں۔ ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار وہیں کروں گا۔

س...... آپ نے ابھی تک جتنے انٹرویو دیئے ہیں ان میں افسانہ نگاروں کے تذکرے میں کہیں بھی احمد ندیم

قاسمی، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، شفیق الرحمٰن، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، مسعود مفتی یا کمانڈر انور کا نام نہیں لیا، اس کی کیا وجہ ہے؟۔

ج..... میں معافی چاہتا ہوں۔ ان سے میرا تعارف نہیں ہے! یہ کیسا لکھتے ہیں؟۔

س..... یہ بھی اچھا لکھتے ہیں۔

ج..... تو پھر ان کا نام بھی لکھ لیں۔

س..... بہت بہت شکریہ باگڑ بلا صاحب۔ اب آپ یہ بتائیں کہ شاعروں میں آپ کو کون شاعر پسند ہے؟۔

ج..... کشور ناہید اور لکڑ ہار اٹانگ پوری!

س..... میرا مطلب ہے ان کے علاوہ اور کون پسند ہے؟

ج..... اور؟ آپ بتایئے۔

س..... نہیں آپ بتایئے۔

ج..... نہیں صاحب آپ بتایئے۔

س..... فیض اور ندیم کیسے رہیں گے؟

ج..... یہ بھی ٹھیک ہیں۔

س..... منیر نیازی اور ظفر اقبال کا نام بھی لکھ لیں؟

ج..... کیوں نہیں، کیوں نہیں، آپ تو تکلف فرماتے ہیں۔

س..... آپ کے پسندیدہ مزاح نگار کون سے ہیں؟

ج..... ڈاکٹر وزیر آغا اور لکڑ ہار اٹانک پوری۔

س..... آپ کیوں اس خاکسار کو ہر بار کانوں میں کھینچتے ہیں؟ لوگ خواہ مخواہ حسد کریں گے۔

ج..... نہیں 'لکڑ ہارا صاحب' یہ آپ کا حق ہے وہ آپ کا فوٹو گرافر ابھی نہیں آیا۔

س..... بس آتا ہی ہو گا، لیجئے وہ آ ہی گیا..... اور ہاں! ڈاکٹر وزیر آغا صاحب مزاح نگار نہیں۔

ج..... اوہ معافی چاہتا ہوں۔

س..... باگڑ بلا صاحب آخر میں ایک سوال سفرنامے کے بارے میں! ہمارے ہاں ان دنوں سفرنامے بہت رواج پا رہے ہیں آپ کو ہمارے ہاں کے سفرنامہ نگاروں میں کون کون سے پسند ہیں؟۔

ج..... آپ نے کوئی سفرنامہ لکھا ہے؟۔

س..... جی نہیں، مگر گذشتہ ہفتے میں نے انگریزی کی کچھ اچھی فلمیں دیکھی ہیں۔ بس یونہی محسوس ہوا کہ میں خود وہاں گھوم پھر رہا ہوں میرا ارادہ ہے کہ آج سے یورپ کا سفرنامہ لکھنا شروع کر دوں۔

ج..... بہت اچھے، تو پھر میرے پسندیدہ سفرنامہ نگاروں میں ایک تو لکڑ ہار اٹانک پوری کا نام لکھ لیں اس کے علاوہ جو نام مناسب سمجھیں۔ وہ آپ کا فوٹو گرافر نہیں آیا؟

یکم اگست ۸۳ء

وکٹری اسٹینڈ

ہمیں اگر موٹر سائیکل اور کار میں سے انتخاب کا موقع دیا جائے تو ہم اپنے لئے کار پسند کریں گے' ایک تو اس لئے کہ موٹر سائیکل پہلے سے ہمارے پاس موجود ہے اور دوسرے اس لئے کہ کار میں پچھلی نشستوں کے علاوہ اگلی نشست پر بھی کسی کو لفٹ دینے کی سہولت موجود ہے جو موٹر سائیکل میں نہیں۔ اسی طرح کار میں ٹیک لگانے کا معقول انتظام ہوتا ہے' جس کے باعث ڈرائیور کو تھکن کم ہوتی ہے۔ جبکہ موٹر سائیکل سواروں کو ٹیک لگانے کے لئے اپنے پیچھے کسی موٹے آدمی کو بٹھانا پڑتا ہے جس کی توند سے ٹیک لگائی جا سکے' لیکن اس کے باوجود یہ ٹیک اتنی آرام دہ نہیں ہوتی کیونکہ یہ موٹا آدمی مسلسل سانس لیتا رہتا ہے چنانچہ توند کی اس مسلسل "ہل جُل" کے باعث ٹیک لگانے والا حادثے کے خطرے سے دوچار رہتا ہے اور یوں آرام دہ چھوڑ اس ٹیک کو محفوظ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ جن پر تکیہ ہوتا ہے' وہی پتے ہوا دینے لگتے ہیں۔

اسی طرح اگر ہمیں کار اور رکشے میں سے انتخاب کا موقع دیا جائے تو ہم اپنے لئے رکشے کا انتخاب کریں گے کیونکہ کار پاس سے بھی گذر جائے تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی جب کہ سائلنسر اترا ہوا رکشہ ایک میل دور سے اپنی آمد کا پتہ دیتا ہے اور "ہٹو بچو" کے شور کے درمیان جب یہ سواری گزرتی ہے تو گلیاں سونجی ہو جاتی ہیں اور یہ مرزا یار ان میں دندناتا ہے۔ رکشے کو کار پر ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگرچہ یہ تین پہیوں والی سواری ہے تاہم اسے گنجان سے گنجان ٹریفک میں بھی اگر صرف اگلا پہیہ گزارنے کی جگہ مل جائے تو باقی جگہ یہ خود بنا لیتی ہے۔ یہ وہ عقاب ہے جو عین سامنے سے آنے والی ٹریفک یعنی تندی باد مخالف سے نہیں گھبراتا بلکہ سمجھتا ہے کہ یہ تو اسے اونچا اڑانے کے لئے چل رہی ہے۔

لیکن اگر ہمارے سامنے رکشے اور ریڑھے میں چوائس کا مسئلہ درپیش ہو تو ہم اپنے لئے بہرحال ریڑھے کا انتخاب کریں گے کیونکہ باقی تمام سواریاں یا ٹریفک کے قوانین کی زد میں آتی ہیں یا ریڑھے کی زد میں آتی ہیں! جبکہ ٹریفک سگنل لال سرخ بھی ہو رہا ہو تو بھی ریڑھے والا صرف اپنا چھانٹا فضا میں بلند کر کے اسے کراس کر سکتا ہے۔ اسی طرح اس پر سریا کچھ اس طرح لادا جا سکتا ہے کہ اس کا نوکیلا حصہ ریڑھے سے آٹھ دس فٹ باہر ہو اور اس کا رخ پیچھے آنے والے سائیکل اور موٹر سائیکل سواروں کی طرف یوں ہو جیسے ان سب کو ہینڈز اپ کرایا ہو۔ ریڑھے پر کھڑا شخص دوسرے سواروں کی نسبت زیادہ باخبر بھی ہوتا ہے کیونکہ اسے صرف یہی خبر نہیں ہوتی کہ مکانوں کے باہر کیا ہو رہا ہے بلکہ وہ دیکھ سکتا ہے کہ مکانوں کے اندر بھی کیا ہو رہا ہے۔

تاہم ریڑھے اور بس میں سے ہماری نگہ انتخاب بہرحال بس پر پڑے گی۔ کیونکہ اس کے ہاتھوں ہم نے بڑے بڑوں کو بے بس ہوتے دیکھا ہے، اس کا انتظار تو وہ بھی کرتے ہیں جن کی شہرت شاعری میں خود انتظار کرانے کی ہے۔ بس میں ڈرائیور کے علاوہ کنڈیکٹر بھی ہوتا ہے اور یہ دونوں اکثر صاحب کرامات ہوتے ہیں، چنانچہ جب کسی حادثے کی صورت میں بس کے تمام مسافر ہلاک ہو جاتے ہیں تو ڈرائیور اور کنڈکٹر کے بارے میں خبر چھپتی ہے کہ وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ بس کو ریڑھے پر ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ریڑھا صرف ایک گھوڑے سے چلتا ہے، جب کہ بس کئی ہارس پاور کی مالک ہوتی ہے۔ اور اتنے "گھوڑوں" کے باوجود یہ سڑک پر نہ پانی کھڑا کرتی ہے اور نہ اس کی وجہ سے صفائی کے دوسرے مسائل پیدا ہوتے ہیں، بلکہ ڈیزل کی بھینی بھینی خوشبو سے فضا معطر کرتی چلی جاتی ہے۔

لیکن اگر ہمیں بس اور ویگن میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا موقع دیا جائے، تو ہمارا ووٹ ویگن کے حق میں ہو گا کیونکہ جو کارہائے نمایاں ویگن انجام دیتی ہے، بس کے بس میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ دیکھنے میں بس ویگن سے کئی گنا بڑی ہوتی ہے، لیکن اس میں بس سے زیادہ سواریاں سما جاتی ہیں نیز اخوت محبت اور بھائی چارے کی جو فضا ویگن میں نظر آتی ہے اسے مثالی قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ دوسری سواریوں میں مسافر زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے شانہ بشانہ ہو کر بیٹھتے ہیں، جب کہ ویگن میں وہ ایک دوسرے کی ٹانگوں میں ٹانگیں اور گردنوں میں گردنیں پھنسا کر بیٹھتے ہیں، ویگن وہ سواری ہے جو غرور بلکہ مغرور کا سر نیچا اور کولہے اوپر کرتی ہے۔ چنانچہ وہ ویگن میں داخل ہوتے ہیں تو بکری بن جاتے ہیں اور آدھ پون گھنٹے کا سفر اسی آسن میں طے کرتے ہیں!

مگر صاحب، اللہ کو جان دینی ہے، یہ بسیں، کاریں، موٹر سائیکل، ویگنیں، رکشے اور دوسری تمام قیمتی سواریاں ایک طرف اور وہ بچارا پرولتاری سائیکل ایک طرف، جو نہ پٹرول مانگتا ہے، نہ ڈیزل مانگتا ہے، نہ قیمتی پرزے مانگتا ہے، مانگتا ہے تو صرف ایک جوانمرد سا سوار مانگتا ہے، جو ٹانگیں چلانا جانتا ہو، سواگر عزت سادات خطرے میں نہ پڑتی ہو، تو ہم باقی تمام سواریوں کو خیرباد کہیں اور اسی کو اپنا جیون ساتھی بنائیں۔ البتہ ایک چھوٹی سی قباحت اس سواری میں موجود ہے اور یہ کہ چلتے چلتے اس کے کتے فیل ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اس کا دم غنیمت ہے، بلکہ اس بے جان چیز کو تو کچھ اشرف المخلوقات پر بھی فضیلت حاصل ہے، کیونکہ بائیسکل کے کتے فیل ہوں تو یہ اپنی ناکامی تسلیم کر لیتی ہے، کیونکہ یہ غیر سیاسی سواری ہے، جبکہ ہمارے اردگرد ایسے کتنے ہی لوگ ہیں، جن کے "کتے" فیل بھی ہو جائیں تو وہ انہیں پاس قرار دے کر ایک بار پھر وکٹری سٹینڈ پر کھڑا کر دیتے ہیں!

اپریل ۸۳ء

ایک کیلنڈر

ہم سادھو لوگ ہیں ہمیں کیا پتہ یہ مجازی محبت کس چڑیا کا نام ہے۔ اس ضمن میں ہمارا ذاتی تجربہ تو ہے کوئی نہیں۔ ہم نے تو بس فلموں میں ہیرو ہیروئن کو دیکھا ہے۔ یا اس جذبے کے متعلق کچھ غزلیں پڑھی ہیں' کچھ نظمیں پڑھی ہیں یا کچھ دوستوں سے فسانے سنے ہیں کچھ سے حقیقتیں سنی ہیں۔ سو ہم اس جذبے کے بارے میں حتمی طور پر کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ عاشق پر کیا گزرتی ہے۔ محبوب پر کیا گزرتی ہے' عاشق کی صحت کیسی ہونی چاہئے۔ محبوب کے بھائی کی صحت کیسی ہونی چاہئے' محبت سے پہلے اور محبت کے بعد کی تصویر کیسی ہوتی ہے؟۔ حسن پرستوں کا انجام نیزان کے ساتھ مرنے کے بعد کیا ہو گا۔ وغیرہ وغیرہ! یہ سب کچھ جاننے کے لئے ہم نے کئی دفعہ ارادہ باندھا کہ یار دوستوں سے سیکنڈ ہینڈ معلومات حاصل کرنے کی بجائے کیوں نہ "بقلم خود" یہ مرحلہ بلکہ مراحل طے کئے جائیں۔ مگر ہر بار بوجوہ یہ کام ہمیں ادھورا چھوڑنا پڑا ہم ان وجوہ کی تفصیل میں تو نہیں جائیں گے۔ بلکہ اجمالاً بھی ان سے پردہ نہیں اٹھائیں گے۔ تاہم عاشق برادری کو مشورہ ضرور دیں گے کہ وہ محبت میں کامیابی کے گر کسی پاکستانی فلم سے سیکھنے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ عملی زندگی میں وہ خواہ مخواہ "ہڈ گوڈے" تڑوا بیٹھیں گے اور حاصل کچھ بھی نہیں ہو گا۔ نیز یہ کہ جس سے محبت کرنی ہو چپکے سے کرتے رہیں' محبوب کو اس کاروبار میں بس "سلیپنگ پارٹنر" سمجھیں کیونکہ وہ عاشق بہت خسارے میں رہتے ہیں جو محبوب سے بھی جوابی محبت کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم نے اس طرح کے کچھ جوڑے دیکھے ہیں جو ایک دوسرے سے ناپ تول کے اعشاری نظام کے عین مطابق محبت کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم جب انہیں دیکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ "ففٹی ففٹی" پروگرام دیکھ رہے ہیں۔

ویسے اس ضمن میں ہم نے کچھ معلومات بہت ٹھوس ذرائع سے حاصل کرنے کی کوششیں بھی کی ہیں۔ مثلاً عاشقوں کا "ورشن" تو ہم نے بہت دفعہ سنا تھا۔ ہم نے کوشش کی کہ کسی محبوب کا نقطہ نظر بھی معلوم کیا جائے۔ ہم بہت عرصے تک کوئی محبوب تلاش کرتے رہے جوینده یابنده! بالآخر ہمیں ایک محبوب مل گیا...... جو محبوب عالم تھا۔ اس نے ہمیں کنفیڈنس میں لیتے ہوئے بتایا کہ محبت کرنے والوں کی عمر بس روتے دھوتے ہی بسر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے ہر عاشق کو نیر بہاتے ہی دیکھا ہے' لہٰذا محبت کرنے سے بہتر ہے کہ آدمی تھانے سے ہو آئے۔ شاہی قلعے سے ہو آئے یا کسی جلسے جلوس میں آنسو گیس کے وسیلے سے اپنے رونے دھونے کا شوق پورا کر لے کہ ان "مقامات آہ و فغاں" پر آنسو بہانے سے اس کا کیریئر تو بنے گا۔ جبکہ محبوب کے سامنے آنسو بہانے

سے وہ زیادہ سے زیادہ محبوب کا کیریئر بن جائے گا!۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا کہ عشق مجازی کے ضمن میں ہماری معلومات بس سنی سنائی ہیں اور وہ بھی یوں کہ ہمارا اٹھنا بیٹھنا کچھ جید عاشقوں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ ہم یہ سطور لکھ رہے تھے کہ ایک نوجوان عرفان احمد خان نے ایک نظم ہمارے ہاتھ میں تھمادی اور یہ نظم پڑھ کر ہمیں یقین ہوا کہ ہمارا محبوب یعنی محبوبِ عالم ٹھیک ہی کہتا ہے یہ نظم کیا ہے محبت کا کیلنڈر ہے۔ ایک عاشق کے جنوری سے دسمبر تک کے کوائف جاننے کے لئے ذرا یہ نظم ملاحظہ فرمائیں۔

جنوری......

جب تم سے اتفاقاً میری نظر ملی تھی
کچھ یاد آ رہا ہے شاید وہ جنوری تھی

فروری......

پھر مجھ سے یوں ملے تھے تم ماہِ فروری میں
جیسے کہ ہم سفر ہو تم راہِ زندگی میں

مارچ......

کتنا حسیں زمانہ آیا تھا مارچ لے کر
راہِ وفا پہ تھے تم جلتے چراغ لے کر

اپریل......

اس وقت میرے ہمدم! اپریل چل رہا تھا
دنیا بدل رہی تھی، موسم بدل رہا تھا

مئی......

لیکن مئی جو آئی جلنے لگا زمانہ
ہر شخص کی زباں پر تھا بس یہی فسانہ

جون......

دنیا کے ڈر سے تم نے بدلی تھیں جب نگاہیں
تھا جون کا مہینہ لب پر تھیں گرم آہیں

اگست......

ماہِ اگست میں جب برسات ہو رہی تھی
بس آنسوؤں کی بارش دن رات ہو رہی تھی۔

ستمبر......

اس میں نہیں کوئی شک وہ ماہ تھا ستمبر
بھیجا تھا تم نے مجھ کو ترکِ وفا کا لیٹر

اکتوبر......

تم غیر ہو رہے تھے اکتوبر آ گیا تھا

دنیا بدل چکی تھی موسم بدل چکا تھا

نومبر......

جب آ گیا نومبر ایسی بھی رات آئی
مجھ سے تمہیں چھڑانے سج کر برات آئی

دسمبر......

بے کیف تھا دسمبر جذبات مر چکے تھے

ان حادثوں سے میرے ارماں ٹھٹھر چکے تھے۔

لیکن میں کیا بتاؤں اب حال دوسرا ہے
وہ سال دوسرا تھا یہ سال دوسرا ہے

اب اس نظم کے بعد محبت کے ذیل میں ہمارا کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف لگتا ہے لیکن اگر اسی نظم کے حوالے ہی سے بات کی جائے اور ذرا سا ریفرنس تبدیل کر دیا جائے تو جذبات کی ایک اور پرت سامنے آ سکتی ہے۔ یعنی یہ سمجھا جائے کہ شاعر "چھڑا" نہیں ہے بلکہ اس کی شادی جنوری کے مہینے میں ہوئی ہے اور یہ نظم اس حوالے سے ہے۔ چنانچہ پہلے دوسرے تیسرے اور چوتھے مہینے میں شاعر بلکہ شوہر کے جذبات کچھ اور ہیں جب کہ پانچویں چھٹے ساتویں اور آٹھویں مہینے میں کچھ اور...... اصل مہینہ اس سے اگلا یعنی ستمبر کا ہے جب شاعر کہتا ہے۔

اس میں نہیں کوئی شک وہ ماہ تھا ستمبر
بھیجا تھا تم نے مجھ کو ترکِ وفا کا لیٹر

متذکرہ ریفرنس میں اس کے بعد والے شعر تو ہمیں بس خانہ پری ہی کے لئے لگتے ہیں کیونکہ وصلِ محبوب یعنی شادی کے بعد محبت کا کیلنڈر بارہ مہینے ایک سا نہیں رہتا! بس دسمبر کے مہینے جیسا ہو جاتا ہے۔

۲۷ جون ۱۹۸۰ء

خالد احمد

خالد احمد کے ساتھ میری دوستی جتنی پرانی ہے' اتنی پرانی تو کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں! مجھے اب صحیح طور تو یاد نہیں' مگر، اندازہ ہے کہ میں اس سے پہلی بار ایک مشترک دوست کی وساطت سے ملا تھا۔ خالد احمد نے مجمع لگایا ہوا تھا اور یہ روحی کنجاہی اور نجیب احمد پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ نجیب احمد کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ اکی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتا جا رہا ہے۔ مگر روحی کنجاہی ہمہ تن گوش تھا' جس کا نتیجہ آج ہم سب کے سامنے ہے کہ اب اسے آلہ سماعت استعمال کرنا پڑتا ہے روحی کو بھی خالد احمد سے اتنی محبت ہے کہ وہ آج اتنے برس گزرنے کے بعد بھی محض خالد احمد کے تیز اور کٹیلے جملے سننے کے لئے "فنون" کے دفتر پہنچ جاتا ہے' یعنی بقول منیر نیازی

کجھ شہر دے لوک وی ظالم سن
کجھ مینوں مرن دا شوق وی سی

بس اگر فرق پڑا ہے تو صرف اتنا کہ روحی اب جب چاہتا ہے خالد احمد کی گفتگو کے دوران آلہ سماعت کان میں سے نکال دیتا ہے' بلکہ جب زیادہ زچ ہو جائے اور خالد احمد کی شکل تک نہ دیکھنا چاہے' تو عینک بھی اتار کر پرے رکھ دیتا ہے کہ لو بچو پہلے تو آواز نہیں آرہی تھی' اب تصویر بھی نہیں آرہی!

میں خالد احمد کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کا احوال قدرے تفصیل سے بیان کرتا مگر مصیبت یہ ہے مجھے صرف خوشگوار باتیں یاد رہتی ہیں' تفصیل نہ بیان کرنے دوسری وجہ یہ ہے کہ برسوں پہلے جس خالد احمد کو میں نے دیکھا تھا' اب برسوں والا خالد احمد بھی وہی ہے۔ چنانچہ آج جب میں کے خالد احمد کی باتیں کروں گا تو اس میں گزرے ہوئے کل بلکہ آنے والے کل کے خالد احمد کے خدوخال بھی شامل ہوں گے کیونکہ ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ سات برس کی عمر میں بچے کی شخصیت مکمل ہو جاتی ہے' اس کے بعد اس کی شخصیت میں چھوٹی موٹی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں' کوئی بڑی تبدیلی بہرحال واقع نہیں ہوتی! سو ماضی' حال اور مستقبل کے خالد احمد کے کردار کا ایک بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ ایک دفعہ ہاتھ دھو کر جس کے پیچھے پڑ جائے' اسے اپنے کٹیلے فقروں اور جناتی قہقہوں کی زد میں اس طرح لیتا ہے کہ وہ اگر سرنڈر بھی کرنا چاہے تو اسے سرنڈر بھی نہیں کرنے دیتا۔ وہ بچارہ کبھی تنہائی میں اس خصوصی سلوک کی وجہ پوچھے تو اسے صحیح وجہ نہیں بتاتا' بلکہ کوئی غلط سی وجہ بتا دیتا ہے چنانچہ وہ شریف آدمی اپنی اس غلطی کی اصلاح کر لیتا ہے' مگر اس کے ساتھ ہی خالد احمد کے جملوں کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس

شخص کی واحد خوبی تھی، جسے خالد احمد نے جان کر غلطی قرار دیا تھا، تاکہ اس کے لئے دل میں جو تھوڑا بہت "سافٹ کارنر" تھا وہ بھی نہ رہے۔ میں نے تو ایک دفعہ حکومت کو ایک تجویز پیش کی تھی۔ جس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ لاہور کے شاہی قلعے میں حکومت کے مخالفوں پر جس قسم کا تشدد ہوتا ہے، اس سے حکومت کی بہت بدنامی ہوتی ہے، اس کی بجائے حکومت کو چاہئے کہ وہ ناپسندیدہ افراد کو روزانہ دو گھنٹے خالد احمد کی صحبت میں گزارنے کا پابند کرے، وہ اگر اگلے دن معافی نامہ لکھ کر حکومت کو پیش نہ کر دیں تو میں ہرجانہ ادا کرنے کو تیار ہوں!۔

یہ خالد احمد کی شخصیت کا ایک شعبہ ہے، جو میں نے ابھی بیان کیا ہے۔ اس کی شخصیت کا "پارٹ ٹو" اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ جن پر وہ مہربان ہوتا ہے، ان کے سات خون بھی معاف کر دیتا ہے۔ ان کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر آگے سے اس طرح خاموش ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔ ان کی برائیاں اسے اچھائیاں لگتی ہیں۔ مثلاً میری شاعری اسے بے حد پسند ہے۔ یہ فقرہ میں نے پہلے لکھ دیا اس سے پہلے یہ بتانا چاہئے تھا کہ جن سے وہ خدا واسطے کی محبت کرتا ہے، ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ جن لوگوں کو وہ ناپسند کرتا ہے اس کی وجہ تو آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آتی چلی گئی مگر جن سے محبت کرتا ہے اس کی وجہ غالباً مزید آہستہ آہستہ سمجھ میں آئے گی۔ دوستوں کے نام لے لے کر دربارِ رسالتؐ میں گڑگڑاتے ہوئے ان کے لئے رحمتوں کا طلب گار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے طویل نعتیہ قصیدے "تشبیب" میں جن دوستوں کے لئے دعا کی ہے، ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ خالد احمد! تم نے اپنے دوستوں کو جس مقام پر یاد رکھا ہے اس کے بعد تم زندگی کے ہر گام پر انہیں بھول بھی جاؤ، انہیں تم سے کوئی گلہ نہیں ہو گا!۔

اب خالد احمد کی محبتوں کا ذکر چھڑا ہے، تو آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ خالد احمد کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبت اپنی والدہ سے ہے۔ لیکن جب میں اس کے منہ سے والہانہ طور پر ربانہ بھابی کا ذکر سنتا ہوں تو لگتا ہے شاید اسے اپنی بیوی سے زیادہ محبت ہے۔ مگر جب میں اسے اپنے بچوں کے درمیان دیکھتا ہوں تو ایک بار پھر الجھن میں پڑ جاتا ہوں، حتّٰی کہ وہ دوسروں کے بچوں کے ساتھ بھی اس قدر بے پناہ محبت کرتا ہے کہ ان بچوں کے والد پریشان ہو جاتے ہیں۔ اسے اپنی بہنوں میں شاید خدیجہ مستور سے زیادہ محبت تھی۔ وہ اپنے بہنوئیوں ظہیر بابر اور وہاب الخیری سے بھی شدید محبت کرتا ہے۔ ظہیر بابر بائیں اور وہاب الخیری دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان دونوں سے یکساں طور پر محبت کرنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس کی شخصیت میں ظہیر بابر اور وہاب الخیری دونوں جمع ہو گئے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح اس کی شادی میں حفیظ اور فیض دونوں موجود تھے اور یوں نیگیٹو اور پازیٹو کے ملاپ سے اس کے نظریات کی دنیا روشن ہو گئی۔ مکمل صداقت نہ آج کے بائیں بازو میں ہے اور نہ آج کے دائیں بازو میں چنانچہ میں ہمیشہ سے لیفٹ اور رائٹ کی بجائے "رانگ" میں یقین رکھتا ہوں، خدا کرے لیفٹ اور رائٹ کی یہ بے معنی جنگ ختم ہو کہ اس جنگ نے عالم اسلام کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔

اور ہاں خالد احمد کی محبتوں کے بیان میں ایک محبت کا بیان تو میں بھول ہی چلا تھا مگر اس کا راوی خالد احمد نہیں

کوئی اور ہے کیونکہ خالد اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہتا بلکہ میرے خیال میں خالد نے اپنے دل کی بات اس عفیفہ سے بھی نہیں کہی' چنانچہ یہ تین ایکٹ کا ڈرامہ پہلے ایکٹ ہی میں ختم ہو گیا۔ خالد احمد پر اس کے "" آفٹر افیکٹس "" دو ہوئے ایک تو یہ کہ وہ ہر مشاعرے میں

ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تو نہ میں

لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تو نہ میں

والی غزل پڑھتا ہے اور دوسرا یہ کہ راہ چلتے ہوئے اس کے قریب سے اگر کوئی حور بھی گزر جائے تو..... وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ میں تو سوچتا ہوں کہ یہ شخص اگر غلطی سے جنت میں چلا گیا تو یہ وہاں کیا کرے گا۔ اس رویے پر حوریں تو اسے "حوڑے" ماریں گی۔ آپ یقین کریں کہ غزل کا اتنا زبردست شاعر ہونے کے باوجود خالد احمد اس معاملے میں "نظم" کا اتنا خیال رکھتا ہے کہ خوب صورت سے خوب صورت ترین چہرہ دیکھ کر بھی انشاء اللہ تو کیا وہ ماشاء اللہ بھی نہیں کہتا میں نے اسے آج تک لڑکیوں کی باتیں کرتے نہیں سنا' حتیٰ کہ وہ ان باتوں میں دلچسپی بھی نہیں لیتا۔ انار کلی میں نظریں جھکا کر چلتا ہے' یوں چلنے کی وجہ سے کسی سے جا ٹکرائے تو دوسری بات ہے' ورنہ وہ اس "جدلیاتی عمل" میں سرے سے یقین نہیں رکھتا۔ شاباش! خالد احمد! مجھے تم پر فخر ہے۔ تم اپنے دوستوں کے گناہوں کا کفارہ ہو' بالکل اسی طرح جس طرح دوست تمہارے گناہوں کا کفارہ ہیں!

منیر نیازی خوفزدہ شخص کی تین نشانیاں بتاتا ہے خالد احمد میں خوفزدہ شخص کی پہلی دو نشانیاں بہرحال موجود ہیں اور یوں میرے نزدیک وہ اندر سے خوفزدہ شخص ہے۔ چنانچہ وہ اپنے صرف ان دشمنوں پر اٹیک کرتا ہے، جنہیں وہ دوست بھی سمجھتا ہے' خالص دشمنوں پر وہ کبھی اٹیک نہیں کرتا۔ اسی طرح مشاعروں میں کبھی تو وہ اتنی ہوٹنگ کرتا ہے کہ اسے زبان پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا مشورہ دینا پڑتا ہے اور کبھی کسی مشاعرے میں اچانک اتنا سہم جاتا ہے کہ وہ زبان پر انگلی رکھ کر دوسروں کو خاموش رہنے کا مشورہ دیتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ ہفتوں شیو بھی اس خوف سے نہیں کرتا کہ کہیں وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت نہ لگنے لگے اور یوں کوئی چڑیل اس پر عاشق ہو جائے۔

ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں!

اور خواتین و حضرات! آخر میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ خالد احمد کے بارے میں زیادہ جاننے کا دعویٰ کرنا خود کو اور دوسروں کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے۔ بچپن سے باپ کی شفقت سے محروم ہو جانے کے بعد اور اس کے بعد سرد و گرم زمانہ چکھتے چکھتے خالد احمد نے اپنی ذات میں پناہ لے لی ہے۔ وہ اپنی اس کمین گاہ سے دنیا والوں کی کمینگیوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور کسی بڑے جوابی حملے سے پہلے دوبارہ اپنی ذات کی خندق میں پناہ لے لیتا ہے۔ داتا گنج بخش کا قول ہے "اے انسان تیرا خود کو پہچاننا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے"۔ لیکن خالد احمد کے حوالے سے یہ بات اس طرح کہی جا سکتی ہے کہ "اے انسان تیرا خالد احمد کو پہچاننا خود کو مزید ہلاکت میں ڈالنا ہے"۔ چنانچہ

مجھے خالد احمد کو پہچاننے کی کیا ضرورت ہے اپنے دکھ تھوڑے ہیں کہ اب خالد احمد کے دکھوں کی چتا میں بھی خود کو جلایا جائے!

۱۸ مئی ۱۹۸۵ء

مُنیر احمد شیخ

میرے اباجی کو اپنے کشمیری ہونے پر بہت فخر ہے' جب کسی شخص سے ملیں اور اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوں تو پورے تیقن کے ساتھ اس کے کشمیری ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں' بسا اوقات میں انہیں بتاتا ہوں کہ یہ جو شخص آپ کو اتنا حسین و جمیل اور ذہین و فطین محسوس ہوا ہے' آپ یقین کریں یہ کشمیری نہیں ہے' میں اس کے والد کو بھی جانتا ہوں' وہ پرانے ککے زئی ہیں' اس پر اباجی کچھ دیر کے لئے سوچ میں پڑ جاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں "ٹھیک ہے' اس کے والد صاحب ککے زئی ہوں گے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ یہ نوجوان کشمیری ہے' تم ذرا پتہ تو کرنا!" خدا کا شکر ہے کہ منیر احمد شیخ اپنے نام کے ساتھ باقاعدہ "شیخ" لکھتے ہیں اور یوں میرا ارادہ انہیں کسی روز اباجی سے ملانے کا ہے تاکہ وہ اپنے "شاواسٹک" خیالات پر نظر ثانی کر سکیں۔

اور یہ جو میں نے منیر احمد شیخ کے ذہین و فطین ہونے کے علاوہ ان کے حسین و جمیل ہونے کا بالواسطہ تذکرہ بھی کیا ہے' تو بات یہ ہے کہ پہلا واسطہ تو صورت ہی سے پڑتا ہے سیرت تو بعد میں آتی ہے بلکہ ان دنوں تو "شمشیر وسناں اول' طاؤس ورباب آخر" کی طرح آخر میں بھی نہیں آتی۔ سو صورت حال یہ ہے کہ منیر احمد شیخ کے چہرے پر جتنا نور ہے' اصولاً انہیں مولانا نورانی کے ساتھ ہونا چاہئے تھا بلکہ اگر وہ داڑھی رکھ لیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کے سر کے بالوں کی طرح ان کی داڑھی بھی سفید ہو گی' تو انہیں کسی کے ساتھ "الحاق" کی بھی ضرورت نہیں ہو گی۔ عقیدت مند ان کے رخِ زیبا کی زیارت کے لئے کھنچے آئیں گے اور یوں وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک "خود کفیل" پیر ہو جائیں گے۔ سیالکوٹ میں ہمارے ایک بزرگ دوست احسان قریشی صابری رہتے ہیں وہ گذشتہ دنوں ہومیوپیتھک ڈاکٹروں کی ایسوسی ایشن کا انتخاب لڑ رہے تھے۔ چنانچہ اب تک وہ جیت چکے ہوں گے یا ہار چکے ہوں گے۔ وہ دیکھنے میں تو ہماری طرح کے دنیادار آدمی لگتے ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں کیونکہ انہوں نے ایک دفعہ اخبار میں اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ ایک بزرگ کے مزار پر قوالی سنتے ہوئے برابر والے شخص پر ان کی نظر پڑی جو حال کھیل رہا تھا۔ صابری صاحب جیسے صاحب نظر کو ابتداء ہوا کہ یہ کوئی عام شخص نہیں' بلکہ جن ہے اور جن بھی عام نہیں بلکہ یہ صحابی جن ہے۔ مضمون کی اشاعت کے بعد صابری صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان کے ہاتھ چوم لئے اور پھر یہ ہاتھ اپنی آنکھوں کو لگائے' صابری صاحب نے اس غیر متوقع اظہار عقیدت کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا آپ تو آپ خود میں بھی لوگوں کی عقیدت کا حقدار ہو گیا ہوں۔ پوچھا کیسے؟۔ میں نے عرض کیا کہ ایک صحابی جن کی زیارت کرنے کی بدولت اب آپ کا شمار تابعین میں ہوتا ہے اور چونکہ میں

آپ کی زیارت سے بہرور ہو چکا ہوں' لہٰذا میں تبع تابعین میں سے ہوں اور یوں خوش قسمت ہیں آپ کہ جنہوں نے ایک صحابی کی زیارت کی' خوش نصیب ہوں میں کہ میں نے آپ کی زیارت کی اور خوش بخت ہیں وہ لوگ جو اب میری زیارت کریں گے! سو اب اسی طرح گیند منیر احمد شیخ کی کورٹ میں ہے چنانچہ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کب میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنی دنیا اور عاقبت سنوارتے ہیں اور کب اپنے ساتھ مجھ جیسے پرانے نیاز مندوں کی عزت کا بھی سامان پیدا کرتے ہیں۔

منیر احمد شیخ سے پرانی نیاز مندی کا ذکر میں نے یونہی نہیں کیا بلکہ حقیقت یہی ہے کہ میں انہیں ملنے سے بھی بہت پہلے کا جانتا ہوں۔ ان کے منفرد قسم کے مضامین کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے بھی پڑھے اور بعد میں بھی پڑھے' کلچر کے حوالے سے' موسیقی کے حوالے سے' پاکستانیت کے حوالے سے اور ان مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے تنقیدی یبوست کی بجائے ایک تخلیقی شگفتگی کا احساس ہوا' بعد میں جب منیر احمد شیخ سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ جیسی خوبصورت تحریریں ہیں۔ ویسے خوبصورت آپ بھی ہیں یعنی صورت اور سیرت دونوں قابل رشک ہیں' خدا کا شکر ہے کہ لوگوں نے منیر احمد شیخ کو پڑھا بھی ہے اور دیکھا بھی ہے ورنہ اس بیان کے بعد میری حالت اس شوہر جیسی ہو جاتی جس نے ایک دن اپنی بیوی سے کہا " جان من! تم آج بہت خوبصورت لگ رہی ہو! " اس پر بیوی نے کہا " گھر میں آٹا ختم ہے' منے کی طبیعت خراب ہے اور اوپر سے تم شراب پی کر آ گئے ہو! "۔ بہرحال منیر شیخ مجھے جب بھی ملے' ہر دفعہ ایک معصوم سے بچے کی طرف خوبصورت لگے' نہ کوئی ہیر پھیر نہ کوئی دل پیچ' نہ کوئی پھوں پھاں' بلکہ باتیں کرتے ہیں تو لگتا ہے جیسے وہ بات سمجھانا ہی نہیں چاہتے سمجھنا بھی چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات درست ہے کہ ہر انسان میں سے ایک خاص قسم کی شعائیں خارج ہوتی ہیں جو دوسرے انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہیں یا پرے دھکیلتی ہیں تو پھر منیر شیخ سے ہر ملاقات کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ یہ شعائیں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں' چنانچہ منیر شیخ اگر افسانہ نگار ہوتے اور نہ مضمون نگار ہوتے' تب بھی میں ان کا شمار اپنے عزیز ترین دوستوں میں کرتا!۔

اور اب تھوڑا سا ذکر منیر کی تازہ کتاب " بہتے پانی میں عکس " کا بھی ہو جائے میں نے ان میں سے صرف ایک افسانہ " آپریشن بائی پاس " نقوش میں پڑھا تھا' باقی سارے افسانے میرے لئے نئے تھے۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی پہلے اس امر کا تعین کر لیں کہ یہ کتاب کس صنف ادب سے تعلق رکھتی ہے' کیونکہ میں نے " آپریشن بائی پاس " کو فرسٹ رائٹنگ میں افسانہ قرار دے دیا' حالانکہ اب مجھے یاد آیا کہ یہ افسانہ نہیں' رپورتاژ ہے' بلکہ رپورتاژ بھی نہیں خود نوشت ہے۔ اسی طرح اس کتاب کے باقی مندرجات بھی کسی ایک تعریف کے کوزے میں نہیں سماتے' بلکہ آپ یقین کریں کہ میں ان کے تسلسل' باہمی ربط اور دیگر خصوصیات کے پیش نظر " بہتے پانی میں عکس " کو ناول بھی ثابت کر سکتا ہوں تاہم میں یہ کام نقادوں پر چھوڑتا ہوں کیونکہ ایک شریف آدمی ایسی بحثوں میں پڑنا اچھا نہیں لگتا۔ بہرحال مجھے خصوصی طور پر " آپریشن بائی پاس " کا ذکر کرنا ہے جو غالباً اس کتاب کی خوبصورت ترین تخلیق ہے۔ میں اسے ایک خود نوشت قرار دوں گا اور منیر شیخ نے اس خود نوشت میں دل کی

سرجری کا احوال بیان کرتے کرتے دو متضاد معاشروں کی جس طرح سرجری کی ہے' اس سے اس ادب پارہ کے درجات بلند ہو گئے ہیں۔ ویسے اس تحریر کے ذریعے منیر شیخ نے بہت سے لوگوں کو بہت گمراہ بھی کیا ہے۔ خصوصاً وہ پورشن جس میں آپریشن کے بعد نرس مریض کو نہاتی ہے' کیونکہ میرا ایک دوست رضامندی یہ رپورتاژ پڑھتے ہی آپریشن کروانے لندن چلا گیا۔ منیر کی اس کتاب میں مجھے جو دوسری تحریریں اچھی لگیں' ان کا فرداً فرداً ذکر کرنے کی بجائے میں اپنا مجموعی تاثر بیان کروں گا اور وہ مجموعی تاثر یہ ہے کہ تحریریں قاری کے ساتھ مکالمہ کرتی نظر آتی ہیں ان میں تاثر ہے اور تاثر کی ایک وجہ منیر شیخ کا ابلاغ پر یقین رکھنا بھی ہے ورنہ تو ہمارے ادب میں ڈاکٹر انور سجاد کے تجریدی اشارے رہ گئے ہیں۔ میں ایک دفعہ انور سجاد کے کلینک میں بیٹھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک اندھی مریضہ کو اشارے سے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب وہ اندھی ہے" کہنے لگے "مجھے پتہ ہے' وہ میری مریضہ ہے!" یہی سلوک ڈاکٹر صاحب اپنے افسانوں میں بھی کرتے ہیں اور "سوجاکھوں" سے کرتے ہیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد پاکستان آئے تو ان کے اعزاز میں منعقدہ ایک دعوت میں سبزیاں اور دالیں تو وافر مقدار میں موجود تھیں مگر گوشت کا کہیں دور دور تک نشان نہ تھا۔ جگن ناتھ آزاد نے میزبان کو اپنے پاس بلایا اور کہا "بھائی صاحب اگر آپ نے یہی کچھ کھانا تھا' تو پھر آپ لوگوں کو پاکستان بنانے کی ضرورت تھی؟" میرا سوال بھی یہی ہے کہ اگر ہم نے ادب کو گورکھ دھندا ہی بنانا ہے تو پھر قاری کو ادب پڑھنے کی کیا ضرورت ہے' وہ شمع معمے کیوں نہ حل کرے؟ تاکہ چار پیسے تو کما سکے!

میرے خیال میں میری گفتگو کافی طویل ہو گئی ہے اور یوں قارئین کے صبر کا زیادہ امتحان لینا مناسب نہیں' تاہم ابھی ایک دو ضروری باتیں کرنا ہیں' پہلی بات یہ کہ "بہتے پانی میں عکس" کے زیادہ تر تخلیقی تجربات غیر ملکی پس منظر کے ساتھ سامنے آئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی منیر احمد شیخ کی سوچ میں تبدیلی کی جھلکیاں بھی جگہ جگہ ملتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک دردمند پاکستانی اپنے خیالات کے نئے دھارے کے ساتھ اس معاشرے کی سوچ کو بدل دینا چاہتا ہے جسے اب دیمک لگ چکی ہے۔ کہیں وہ اپنی بات بہت پیار سے کہتا ہے اور کہیں جھنجھلا بھی جاتا ہے بعض مقامات پر خود منیر شیخ کی سوچ سے بھی اختلاف ممکن ہے' مثلاً جہاں ان کی ایک کردار "میری" کھلے آسمان کے نیچے پیار کرنے کا فلسفہ بیان کرتی ہے اور کچھ ایسا سماں باندھتی ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے دل سے شاہین فورس کا خوف بھی نکل جاتا ہے۔ تاہم مجھے اس نظریئے سے بطور تھیوری اختلاف ہے۔ دوسری ضروری بات مجھے یہ کرنا ہے کہ ان خیالات کی جھلکیوں سے قطع نظر منیر شیخ پوری کتاب میں اپنے کلچر سے بندھے نظر آتے ہیں اور اس کے خوبصورت پہلوؤں کا بیان اسی وارفتگی سے کرتے ہیں، جس وارفتگی سے وہ مغرب کے خوبصورت پہلوؤں کی مدح کرتے ہیں۔ اور تیسری اور آخری بات یہ کہ "بہتے پانی میں عکس" کی مختلف تحریروں کو آپ افسانہ' رپورتاژ خود نوشت سفرنامہ بلکہ بدخواہ تو انشائیہ تک قرار دے سکتے ہیں' لیکن یہ زیادہ اہم بات نہیں' اہم بات یہ ہے کہ میں نے قریباً تین ماہ قبل یہ کتاب پڑھی تھی مجھے ان تحریروں کے عنوانات یاد نہیں' لیکن مصنف کے ان پڑھ دوست' مغربی ممالک میں عمر بسر کرنے مگر اپنے بچوں کو اس کی آلودگیوں سے بچانے کے

خواہش مندو والدین بے بی کی باتیں 'ایک مغربی دوشیزہ " کے " کی اداسی' پنڈت پر بھاکر سڑکوں پر بلغم پھینکنے والے کردار' ان سب کے بیان میں ایک گہرا تخلیقی کرب مجھے نہ صرف یاد ہیں بلکہ میرے حافظے کے ساتھ چپک کر رہ گئے ہیں۔ ایک فلرٹ مرد نے ایک فلرٹ عورت سے کہا " میں زیادہ بحث مباحثے کا قائل نہیں 'بس ہاں یا نہ میں جواب دو! " عورت نے کہا " ٹھیک ہے میرے گھر چلیں یا تمہارے گھر! " اس پر مرد نے جھنجھلا کر کہا " پھر تم نے بحث شروع کر دی؟ " ۔ میں بھی منیر شیخ کی خوبصورت شخصیت اور فن کا مزا اس پر زیادہ بحث کر کے کرکرا نہیں کرنا چاہتا' اس لئے اب اجازت چاہتا ہوں!۔

۱۸ دسمبر ۸۶ء

بیجنگ میں دوسرا دن

چند برس پیشتر پاکستانی ادیبوں کا ایک وفد چین کے دورے پر پہنچا' تو وفد کے ایک رکن کو ایک ضیافت میں بہت پیاری سی ایک ننھی منی سی بچی نظر آئی۔ موصوف نے اسے گود میں بٹھا کر بہت پیار کیا۔ انہیں بعد میں پتہ چلا کہ جسے وہ بچی سمجھے تھے اس بچی کی عمر بیس سال تھی۔ چینیوں کے چہرے عمر کے معاملے میں مغالطے کا باعث بنتے ہیں' چنانچہ جب ہم ادیبوں کے وفد کے ساتھ اس ماہ کی سات تاریخ کو عوامی جمہوریہ چین کے لئے روانہ ہوئے تو ہمیں خدشہ تھا کہ کہیں ہم بھی دوران قیام اس قسم کے مغالطے سے دوچار نہ ہوں' مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اس قسم کے مغالطوں کو یہاں پسند نہیں کیا جاتا۔ بہرحال آج بیجنگ میں ہمارا دوسرا دن ہے اور یہاں آ کر ہمارے بہت سے مغالطے دور ہوئے۔ مثلاً ایک دوست نے ہمیں ڈرایا تھا کہ چینی کھانے جو تم پاکستان میں کھاتے ہو' انہیں مشرف بہ اسلام کیا گیا ہے یعنی مقامی رنگ دیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ مزیدار ہیں' ورنہ اصل چینی کھانے جو تم چین میں کھاؤ گے نہایت بدمزہ ہیں' چنانچہ جب پروین شاکر' مہتاب راشدی' بشیلوچ' وفد کے قائد پروفیسر پریشان خٹک اور راقم پہلے روز کھانے کی میز پر بیٹھے تو "اڑنے سے پیشتر ہی میرا رنگ زرد تھا" کے مصداق ہم کھانے کی چیزوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر رہے تھے' ہمارے ہاں کھانے سے پہلے "گوشارٹ دو" (یعنی شروع) کے طور پر سلاد وغیرہ رکھے جاتے ہیں' یہاں اس کام کے لئے کے قتلے ایک پلیٹ میں رکھے تھے' ایک پلیٹ میں چینی کھجوریں تھیں' جن میں گٹھلیوں کی بجائے بیج تھے' ایک اور چیز جو شکل سے کھیرا لگتی تھی' چکھنے پر بھی کھیرا ہی ثابت ہوئی' مگر یہ ایک قسم کا کھیرے کا اچار تھا۔ یہ سب چیزیں نہایت لذیذ تھیں' چنانچہ حوصلے بلند ہونے پر ہم اصل کھانے کی طرف متوجہ ہوئے جس میں ابلے ہوئے چاول تھے' خرگوش کا گوشت اور بانس کے درخت کی جڑوں کا سالن تھا۔ ابلی ہوئی پالک تھی' فرائڈ پران تھے' انڈوں کا سالن تھا اور اس کے علاوہ مچھلی شوربہ تھا' ان میں کسی سالن میں بھی مرچیں نہیں تھیں' مگر کھانے کے بعد پتہ چلا کہ "غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟" یعنی ابلی ہوئی پالک کے علاوہ باقی سب کچھ مزیدار تھا۔ چینی ہمارے حلال حرام کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہوٹل کے کمروں میں دھرے ریفریجریٹرز میں مہمانوں کے لئے دو عدد کوکا کولا دو عدد میزل واٹر کی بوتلیں ایک تھرماس میں ابلتا ہوا پانی اور چائے کی پڑیوں کے علاوہ دو عدد بیئر کی بوتلیں بھی ہوتی ہیں' لیکن ہمارے لئے سب کچھ رکھا گیا تھا بس بیئر کی بوتلیں اس "مینو" میں سے خارج کر دی گئی تھیں۔ اسی طرح ویٹرس غلطی سے خنزیر کا گوشت ہمارے کھانے کی میز پر رکھ گئی' جس پر ہمارے میزبان مسٹر لیو نے اسے کہا کہ یہ فوراً سے پیشتر اٹھا کر لے جاؤ۔

مسٹر لیو ایک دراز قد دبلا پتلا سانوجوان ہے' عینک لگاتا ہے۔ بہت زندہ دل ہے' ہم لوگ عوامی جمہوریہ چین کی رائٹرز ایسوسی ایشن کی دعوت پر یہاں آئے ہیں اور لیو اس ایسوسی ایشن کا افسر میزبانی ہے۔ اس نوجوان سے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال ہوا۔ چین کے دشمنوں نے چین کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں' ان میں سے ایک غلط فہمی یہ بھی ہے۔ کہ وہاں تنقید کو برداشت نہیں کیا جاتا' لیکن لیو سے مل کر ہماری یہ غلط فہمی دور ہو گئی کیونکہ یہ نوجوان اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھاتے ہوئے بھی نہیں جھجکتا' میں نے اس پوچھا کہ آیا چین میں غریب لوگ موجود ہیں' اس نے بلا تامل جواب دیا ہاں ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آیا غربت کا یہ معیار ہے کہ انہیں پوری روٹی بھی نہ ملے' اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ شہروں میں حالات بہتر ہیں البتہ دیہات میں کچھ لوگ عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں' تاہم کاونٹر ریولوشن کے بعد کسانوں کے حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ چین میں تنخواہیں بے حد کم ہیں' مثلاً لیو جو افسر میزبانی ہے' اس کی تنخواہ ایک سو یو آن یعنی قریباً پانچ سو روپے پاکستانی ہے' لیکن اس کے باوجود اس کا ٹھیک ٹھاک گزارہ ہو جاتا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت روٹی کپڑا امکان برائے نام قیمت پر فراہم کرتی ہے' ایک فرد کا کھانے کا ماہوار خرچ صرف چالیس یوان اور مکان کا ماہوار کرایہ اسے صرف دو یوآن یعنی دس روپے ادا کرنا پڑتا ہے' تاہم حکومت اب اپنی اس پالیسی پر نظر ثانی کر رہی ہے۔ متوقع پالیسی "زیادہ آمدنی' زیادہ اخراجات" کی بنیادوں پر ہو گی۔

بیجنگ ائرپورٹ سے ہوٹل شین من آتے ہوئے سڑک پر جاپانی کاریں نظر پڑیں تو مجھے بہت حیرت ہوئی اس پر پروفیسر پریشان خٹک نے کہا بھتیجے! اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔ یہ کاریں کسی فرد کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ سٹیٹ کی ہیں'۔ چنانچہ یا تو بطور ٹیکسی استعمال ہوتی ہیں اور یا سرکاری مقاصد کے لئے استعمال میں آتی ہیں' بہر حال کوکا کولا کے علاوہ باہر سے جو چیزیں آتی ہیں۔ ان میں یہ کاریں بھی ہیں جن پر مغربی تہذیب بھی سوار ہو کر آ گئی ہے۔ چنانچہ جب آج ہم ایک چینی شہنشاہ کا سمر پیلس دیکھنے گئے تو اس محل کی پھولوں اور درختوں سے ڈھکی ہوئی ایک رومانٹک لین میں جگہ جگہ نوجوان جوڑے کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہوئے تھے' بلکہ ایک بینچ پر ایک جوڑا تو اس عالم میں تھا کہ لڑکا بنچ کے ساتھ ٹیک لگائے سو رہا تھا اور لڑکی اس نوجوان کے گھٹنوں پر سر رکھے سو رہی تھی۔ میں نے لیو سے پوچھا کیا یہ شادی شدہ ہیں؟۔ یہ ستم ظریف کہنے لگا' نہیں کیونکہ یہ اگر شادی شدہ ہوتے تو لڑکی کے بجائے لڑکا اس کے گھٹنوں پر سر رکھے سو رہا ہوتا لیو اچھا خاصا جملے باز ہے۔ چنانچہ اچھا فقرہ سوجھ جائے تو کہے بغیر نہیں رہتا ہوٹل شین من کی راہداری میں ایک کمرے کے باہر "وی آئی پی" لکھا ہوا تھا' مہتاب راشدی نے پوچھا کہ چین میں وی آئی پی کون ہوتا ہے لیو نے کہا "وہ جو خود کو وی آئی پی سمجھتا ہے!"۔

چینی ادیبوں کی طرف سے نہایت خوبصورت جھیل کے کنارے واقع کلچرل کلب میں دیئے گئے عصرانے میں چینی ادیبوں سے بھی تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ ان میں یوان ینگ بھی تھے۔ جو اتنے "ینگ" بہر حال نہیں تھے۔ انہیں حکومت پاکستان نے "ستارہ قائد اعظم" دیا ہے۔ یہ پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں اور پاکستان کے بارے میں ان کی نظموں کا مجموعہ "مہکتے ہار" کے عنوان سے اردو میں چھپا ہے۔ آپ رائٹرز ایسوسی ایشن کے

چیئرمین ہیں' ان کے علاوہ چی پھونگ' چیانگ تہہ لنگ' لی شی وانگ شن شیان اور لو شال ہیں ان میں سے چانگ شی شوانگ تو با قاعدہ اردو میں شعر کہتے ہیں اور عالم تخلص فرماتے ہیں' اس عصرانے میں انہوں نے اپنی تازہ غزل سنائی جو انہوں نے سفیر پاکستان متعینہ عوامی جمہوریہ چین جناب محمد اکرم ذکی کی غزل کی زمین میں کہی ہے' انہوں نے غزل سناتے ہوئے ایک شعر پڑھنے سے پہلے کہا "جناب یہ ذرا لکھنوی قسم کا شعر ہے اور وہ شعر یہ تھا!۔

فراقِ یار نے مارا خیالِ یار نے مارا
جو صورت یار سے ملتی نظر آئی تو دل دھڑکا

ان کے علاوہ مسٹر لو کا بھی جواب نہیں' ایسی نستعلیق اردو بولتے ہیں کہ ہمیں ہی نہیں' خود انہیں بھی پسینہ آجاتا ہے' ملاقات پر اپنا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے "اس خاکسار کو لو کہتے ہیں"! پروین شاکر نے پوچھا آپ اردو میں شعر بھی کہتے ہیں کہنے لگے خاکسار میں یہ تاب کہاں' بس آپ جیسے حضرات کا نیاز مند ہوں' اگر مسٹر لو ہمیں چین کی بجائے پاکستان میں ملتے تو ہم انہیں سادات امروہہ میں سے سمجھتے! چینی ادیبوں نے ڈنر کا اہتمام "پیکنگ ڈک ریستوران" میں کیا تھا اور اس عشائیے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں "سلاد" سمیت تمام ڈشز بطخ کے گوشت سے تیار کی گئی تھی۔ جن میں بطخ کے پائے بھی شامل تھے' ایک خصوصی ڈش "پیکنگ ڈک" تھی جو پوری نما چپاتی میں بطخ کے تِلّے چٹنی کے ساتھ رکھ کر کھائی جاتی ہے۔ کھانا سرو کرنے سے پہلے ویٹرس ایک ٹرے میں سالم روسٹڈ لے کر آئی اور ہمیں دکھا کر اسی طرح واپس لے گئی جس طرح لڑکے والے لڑکی والوں کو بری کے کپڑے دکھا کر واپس اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ بعد میں یہ ویٹرس بطخ کے تِلّے بنا کر واپس لائی۔ رات کا یہ کھانا سہ پہر چھ بجے کھایا گیا سہ پہر کو کھانے کا رواج ہے۔ بہر حال "رات کے کھانے" کے بعد ہم "شام کی چائے" پینے جناب عزب مآب محمد اکرم ذکی کے گھر گئے جہاں جناب حمید اللہ ہاشمی' نثار اللہ بلوچ' مسز حبیب الرحمان' مسز طلعت اعجاز' بیگم اکرم ذکی' مسز الماس خانم ہاشمی' جناب حبیب الرحمان (فرسٹ سیکرٹری) اور جناب اعجاز لطیف بھی موجود تھے۔ سفیر پاکستان انتہائی خوش طبع اور خوش ذوق انسان ہیں اور چین میں موجود پاکستانیوں کے ساتھ برادری کے ایک رکن کے طور پر رہتے ہیں' پاکستانیوں نے ان کی عدم موجودگی میں ان کی تعریف کی کہ انہوں نے دونوں برادر ملکوں کو قریب سے قریب تر لانے کے لئے بہت خدمات انجام دی ہیں۔ چین کے بارے میں ہمارا اپنا تاثر بھی یہی تھا کہ یہ ہمارا عظیم دوست ہے چینی عوام سے مل کر بھی ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ یہ پہاڑ میں سے دودھ کی نہر نکالنے والی محنتی قوم ہے۔ تاہم اس تاثر کو سفیر پاکستان کی گفتگو نے اور گہرا کیا بہر حال خدا کرے چین سدا خوش حال رہے۔ اس کے عوام پھلیں پھولیں اور دشمنوں کی نگاہ بد سے محفوظ رہیں اور اس کے علاوہ ایک دعا یہ بھی ہے کہ کاش ہم لوگ چین سے بعض شعبوں میں اس کی ترقی کا راز پوچھیں۔ اس سے پوچھیں کہ اس نے ایک سو کروڑ عوام جو بھوکے ننگے تھے' جو افیمی تھے' جن کی مائیں اپنے بچوں کی گردنوں میں ان کی قیمت کا ٹیگ لٹکا کر انہیں فروخت کرنے کے لئے بازار میں لگی قطار میں بیٹھ جاتی تھیں' وہی چینی عوام آج فخر سے اپنی گردن تان کر کیسے چلتے ہیں؟۔ کاش ہم یہ راز ان سے پوچھیں اور اس راز کو راز ہی نہ رہنے دیں بلکہ کچھ کر کے بھی دکھائیں۔

۱۶ مئی ۱۹۸۷ء

ماؤ کیپ

لاہور سے روانگی کے وقت ایک دوست نے فرمائش کی کہ میں اس کے لئے ایک ماؤ کیپ لیتا آؤں چنانچہ چین کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی میں نے ماؤ کیپ کی تلاش شروع کر دی' میں ایک سٹور سے دوسرے سٹور تک مارا مارا پھرتا رہا' مگر وہاں ہر قسم کی ٹوپیاں نظر آئیں' اگر نظر نہیں آئی تو وہ ماؤ کیپ تھی' اس پر میں نے پریشان ہو کر اپنے گائیڈ لیو چن سے پوچھا کہ مارکیٹ سے ماؤ کیپ کیوں غائب ہے' کہیں ایسا تو نہیں کہ ٹوپیاں بنانے والوں سے اس کی مانگ پوری نہیں ہو رہی؟ اس پر اس نے کہا "سچی بات یہ ہے کہ ماؤ کیپ کی مانگ نہ ہونے کی وجہ سے یہ مارکیٹ میں نظر نہیں آتی!" ایک وقت تھا کہ پوری چینی قوم ماؤ کیپ میں نظر آتی تھی' مگر اب صورت یہ ہے کہ ماؤ کے ساتھ اس کی "کیپ" بھی غائب ہو گئی ہے۔ اسی طرح پاکستانی ادیبوں کے وفد کے اعزاز میں دیئے گئے ایک عصرانے میں چینی ادیبوں نے ایک موقع پر جب تالیاں بجائیں تو میں ایک دفعہ پھر حیران ہوا چنانچہ میں نے لیو چن سے کہا "گذشتہ پندرہ دنوں میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے چینیوں کو تالی بجاتے دیکھا ہے' جبکہ ماؤ کے زمانے میں ہم انہیں ٹیلی ویژن پر ذرا ذرا سی بات پر تالیاں بجاتے دیکھا کرتے تھے!" اس پر لیو نے کہا "اس وقت یہی فیشن تھا تالیاں بجوائی جاتی تھیں!" سو اب صورتحال یہ ہے کہ چین میں ماؤ صرف ثن من سکائر کے ماؤ میموریل میں نظر آتا ہے' وہ شیشے کے تابوت میں لیٹا ہوا ہے' اس نے اپنا مخصوص کوٹ پہن رکھا ہے' وہ سرہانے پر سر رکھے آنکھیں بند کئے سو رہا ہے اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب ایک وقت میں بیس پچیس ہزار لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے طویل قطاروں میں کھڑے نظر نہ آتے ہوں' میں نہیں جانتا اتنی بڑی تعداد میں لوگ ایک مردہ شخصیت کو دیکھنے کیوں آتے ہیں' لیکن چین کے ادیبوں' دانشوروں' شاعروں' یونیورسٹی کے گریجوایٹس اور نئی نسل کے افراد کچھ اور طرح سوچتے ہیں' وہ ماؤ کے ثقافتی انقلاب کو چین کی تاریخ کا ایک عظیم سانحہ قرار دیتے ہیں میں نے ایک چینی دوست سے بات کی تو اس نے کہا "ماؤ کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا' اس نے غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف ناقابل فراموش جدوجہد کی۔ ہم اس کی عظیم قربانیوں کے معترف ہیں' لیکن غیر ملکی حملہ آوروں کو نکالنے کے بعد اسے ریٹائر ہو جانا چاہئے تھا کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک اچھا جرنیل ملک کو بھی اچھے طریقے سے چلا سکے" ایک اور چینی دوست کا کہنا تھا کہ "ماؤ نے قدیم چینی تاریخ کا بہت مطالعہ کر رکھا تھا' مگر وہ بالکل بے خبر تھا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے' حتیٰ کہ برسر اقتدار آنے کے بعد وہ صرف ایک ملک کے دورے پر گیا اور وہ روس تھا" اس دوست کا کہنا تھا کہ "ایک عام شخص کی غلطی معاف کی جا سکتی ہے' لیکن لیڈر کی غلطیوں کو معاف نہیں کیا جا سکتا

کیونکہ ان کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے" میں نے پوچھا کہ "وہ غلطیاں کیا تھیں" اس کا کہنا تھا کہ "سب سے بڑی غلطی ثقافتی انقلاب تھی' جب ثقافتی انقلاب شروع ہوا اس وقت میری عمر صرف سات سال تھی اور جب یہ اپنے اختتام کو پہنچا' اس وقت میں سترہ برس کا تھا' چنانچہ میں نے اپنی بلوغت کے پورے دور میں یہی دیکھا کہ ریڈ گارڈ گلے میں سرخ کتاب اور ہاتھوں میں ڈنڈے لئے سڑکوں پر پھرتے تھے' جس شخص کو چاہتے تھے' اسے انقلاب دشمن قرار دے کر اس کی پٹائی شروع کر دیتے تھے' چنانچہ اس خوفناک دور میں نہ صرف یہ کہ معزز لوگوں کو سرعام ذلیل کیا گیا' بلکہ کچھ لوگوں کو جان سے بھی مار دیا گیا۔ میں نے اپنے بچپن سے بلوغت کے زمانے تک یہی کچھ دیکھا۔ اس دور میں مجھ سے میرا آئیڈیل چھین لیا گیا!"

ایک اور چینی دوست نے بتایا کہ "ماؤ کے ساتھی دانشوروں کو اپنا ساتھی نہیں سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ لانگ مارچ سے لے کر باقی تمام مراحل تک ملک کے کسانوں اور مزدوروں نے ان کی جدوجہد کا ساتھ دیا' چنانچہ ملک کی قیادت بھی مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھوں میں رہے گی' حالانکہ ملک کی قیادت ان ہاتھوں میں ہونی چاہئے جو جانتے ہوں کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور یوں وہ اس نازک کام کی نزاکتوں سے پوری طرح واقف ہوں" بہرحال مجھے لگتا یوں ہے کہ جسمانی کام کرنے والوں اور ذہنی کام کرنے والوں کے درمیان کہیں نہ کہیں کوئی الجھاؤ ضرور موجود ہے۔ اگرچہ چین کی موجودہ قیادت نے اس الجھاؤ کو کم کرنے کے لئے بہت سے مثبت اقدامات کئے ہیں۔ لیکن اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ایک ڈاکٹر یا انجینئر بعض صورتوں میں ایک جھاڑو پھیرنے والے سے کم تنخواہ پاتا ہے' اس وقت ملک میں سب سے خوشحال طبقہ ٹیکسی ڈرائیوروں کا ہے اور ان سے بھی زیادہ خوشحال وہ دکاندار ہیں جنہیں نجی کاروبار کرنے کی اجازت مل گئی ہے' سو پڑھے لکھے افراد کی فرسٹریشن اتنی بے جا بھی نہیں' مجھے حیرت ہوئی جب چینی ایئر لائن میں سفر کرتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ جہاز کے پائلٹ کی تنخواہ ایئر ہوسٹس کی تنخواہ کے برابر برابر ہے۔ اس کا اندازہ مجھے جہاز کی لینڈنگ سے بھی ہوا!

یہ عجیب بات ہے کہ موجودہ چین کے دانشوروں اور نئی نسل کے لوگوں میں جہاں ماؤ کے خلاف کچھ شکایات پائی جاتی ہیں' وہاں ان کے ساتھی چو این لائی ان طبقوں میں بہت مقبول ہیں' ویسے ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ ماؤ کی تمام تر "غلطیوں" کے باوجود ابھی تک اس کا احترام بہرحال باقی ہے' چنانچہ ایک پاکستانی دوست کے مطابق "چینیوں نے ماؤ کو خدا کے درجے سے ہٹا کر اب اسے صرف ولی اللہ ماننا شروع کر دیا ہے" بہرحال چو این لائی اس طبقے میں بہت ہردلعزیز ہیں جس طبقے میں مجھے گھومنے پھرنے اور گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے' یہ بات میں یوں کہہ رہا ہوں کہ مزدوروں' کسانوں اور پرانی نسل کے افراد سے ملاقات کا موقع مجھے نہیں ملا' جب پروفیسر پریشان خٹک' پروین شاکر' مہتاب چنا (اب مہتاب راشدی) بشیر بلوچ اور میں شنگھائی میں اندرون شہر کے گلی کوچے دیکھنے گئے تو میں نے ایک ستر سال کے بوڑھے کو روکا اور ایک ترجمان کی مدد سے پوچھا کہ "تم پرانے زمانے اور آج کے زمانے میں کیا فرق محسوس کرتے ہو؟" اس نے جواب دیا "میری صحت ٹھیک نہیں ہے!" میں نے ترجمان سے کہا "یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں ہے!" اس پر ترجمان نے ایک بار پھر میرا سوال دہرایا

اور پھر مجھے بتایا کہ وہ اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا...... اور پھر تر جمان نے مسکرا کر کہا "شاید وہ تم سے ڈر گیا ہے' وہ تمہیں ریڈ گارڈ سمجھا ہے کیونکہ تم نے انہی کی طرح گردن میں بیگ لٹکایا ہوا ہے!"

میں نے ماؤ کا چین نہیں دیکھا' لیکن جو چین میں نے دیکھا ہے' وہ اس چین سے بہت مختلف ہے۔ جو میں نے سنا تھا' خاندان کا کوئی بزرگ جو بہت ٹوک ٹوک کرتا ہو' ذرا ذرا سی بات پر معترض ہوتا ہو' جب مر جائے تو اس خاندان کی بہو بیٹیاں فوراً برقعہ اتار دیتی ہیں' کچھ اسی قسم کی صورتحال ماؤ کے مرنے کے بعد چین میں نظر آتی ہے لوگوں کو بہت سی آزادیاں اچانک مل گئی ہیں۔ چنانچہ ان کا مکمل استعمال ہر جگہ نظر آتا ہے' لوگ اپنی مرضی کے کپڑے پہنتے ہیں' لڑکیاں خوب میک اپ کرتی ہیں اور بازاروں میں اپنے بوائے فرینڈز کے بازوؤں میں جھولتی پھرتی ہیں' فائیو سٹارز ہوٹلوں اور فرینڈز شپ سٹورز میں دنیا کے ہر کونے سے امپورٹ کی گئی تمام آسائشیں ملتی ہیں' مساوات کے تصور میں ایک تبدیلی نظر آتی ہے بلکہ آئندہ دس برسوں میں یہ تبدیلی انتہائی نمایاں صورت میں سامنے آنے کی توقع ہے۔ چین ہمارا دوست نہیں' برادر ملک ہے' چنانچہ میں اگر اپنے پاکستانی دوست کی فرمائش پوری نہیں کر سکا اور پوری تلاش کے باوجود اگر اس کے لئے ماؤ کیپ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا' تو مجھے اس کا افسوس نہیں' خوشی ہے کہ انقلاب کے فلسفے کے عین مطابق ہمارے چینی بھائی ماؤ کیپ تک آکر رک نہیں گئے بلکہ اس سے آگے نکل گئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کے سروں پر اگر ماؤ کی ٹوپی نظر نہیں آتی' تو ان سروں پر فرنگی کا ہیٹ بھی کبھی نظر نہیں آئے گا۔

۲۹ مئی ۸۷ء

چین کی سیاحی اور "سیاہی"

جب میں نے چین کے لئے رخت سفر باندھا تو ایک دوست نے مجھے بتایا کہ تمہیں سارے چین میں ایک مکھی بھی نہیں ملے گی، چنانچہ میں نے چین کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مکھیوں کی تلاش شروع کر دی۔ پی آئی اے کی کراچی سے بیجنگ تک کی فلائٹ میں ایک مکھی موجود تھی، چنانچہ میرا خیال تھا کہ وہ میرے ساتھ ہی بیجنگ میں لینڈ کرے گی اور اس کے بعد مختلف مقامات پر اس سے ملاقات رہے گی، جس سے میں "ہوم سک" محسوس نہیں کروں گا، لیکن اللہ جانے اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی کیونکہ پورے دورے کے دوران موصوفہ کہیں نظر ہی نہیں آئیں، شاید اسے چین میں داخلے کا ویزا ہی نہیں ملا اور یوں اسے ایئرپورٹ پر ہی روک لیا گیا۔ بہرحال یہ سطور لکھتے وقت میں شنگھائی میں ہوں، بیجنگ، کینٹن اور ہانگ چو میں بھی مکھیاں تلاش کیں شنگھائی میں بھی دوربین سے مکھیاں ڈھونڈتا رہا، مگر افسوس کہ پورے چین میں واقعی کوئی مکھی نہیں ہے، اس قوم نے جہاں دوسرے کمالات دکھائے ہیں، ان میں سے ایک کمال یہ بھی ہے کہ چین میں مکھیوں کی نسل ہی ختم کر دی ہے۔

چین میں صرف "اصلی تے وڈی" مکھیوں کی نسل ہی ختم نہیں کی گئی بلکہ گندگی پر پلنے والی اور بہت ساری مخلوقات کا بھی خاتمہ کر دیا گیا ہے، مجھے یہاں ایک جوتا خریدنا تھا، ہمارا تر جمان لیو ساتھ تھا۔ میں نے جوتوں کی دکان سے ایک جوتا پسند کیا، قیمت ادا کرنے سے پہلے لیو سے پوچھا کیا یہ خالص چمڑے کا ہے؟ لیو نے کہا میں دکاندار سے پوچھتا ہوں اور پھر اس نے مجھے بتایا کہ ہاں یہ خالص لیدر ہے۔ میں نے لیو سے پوچھا کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ واقعی لیدر کا ہے۔ اس نے کہا ہاں! مجھے دکاندار نے یہی بتایا ہے، میں نے کہا دکانداروں کا کیا ہے، تم اپنی تسلی کر کے بتاؤ۔ اس پر لیو نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا "مجھے سمجھ نہیں آتی، تمہیں اس سلسلے میں یقین کیوں نہیں ہے، اگر دکاندار کہتا ہے کہ یہ جوتا لیدر کا ہے تو یہ لیدر ہی کا ہے"۔

اسی طرح چین میں گداگری کا مکمل طور نہیں تو ۹۸ فیصد تک ضرور خاتمہ کر دیا گیا ہے چین کے متذکرہ شہروں میں سے گزرتے ہوئے کسی ایک گداگر نے بھی ہمارا راستہ نہیں روکا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ نہیں کہا کہ وہ دو دنوں سے بھوکا ہے یا اس کا بچہ بیمار ہے بلکہ ہم نے یہاں ایک سو یوآن (تقریباً پانچ سو روپیہ) ماہانہ تنخواہ پانے والے مزدوروں کے چہروں پر بھی مسرت اور اطمینان کی وہ چمک دیکھی ہے جو ہمارے ہاں بعض کروڑ پتیوں کے چہروں پر بھی نظر نہیں آتی۔ ایک چینی دوست نے بتایا کہ ملک کے کچھ حصوں میں ابھی کچھ گداگر موجود ہیں اور وہ عموماً کسی ریلوے سٹیشن پر چوری چھپے بھیک مانگتے ہیں، لیکن ان کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری

رہتا ہے جب تک پولیس کی نظر ان پر نہیں پڑتی کیونکہ حکومت نے سب کے روزگار کا اہتمام کیا ہے' اگر کوئی بھیک مانگتا ہے تو وہ محض ہڈ حرام ہے اور موجودہ چین میں ہڈ حرامی کی کوئی گنجائش نہیں ہے!

چین میں گداگروں کے علاوہ قلی بھی ناپید ہیں چینیوں کو یہ بات سمجھ ہی نہیں آتی کہ ایک انسان دوسرے انسان کا سامان اٹھا کر کیوں چلے' ہانگ چو سے شنگھائی جانے کے لئے ہم نے ٹرین کے سفر کو ترجیح دی تھی' لیکن ہمیں یہ فیصلہ بہت مہنگا پڑا کیونکہ ریلوے سٹیشن پر ٹرالی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہمارے میزبانوں نے پروین شاکر اور مہتاب راشدی کا سامان تو اٹھالیا کہ وہ خاتون ہیں' لیکن مجھے بشیر بلوچ اور پروفیسر پریشان خٹک کو ہٹا کٹا سمجھ کر انہوں نے رسمًا ہمارے سامان کو چھوا اور ہمارے رسمی انکار کو حقیقی سمجھ کر چپ ہو رہے جس کے نتیجے میں کار سے لے کر پلیٹ فارم تک جاتے جاتے ٹانگوں میں "کھلیاں" پڑ گئیں! ایک اور عجیب چیز جو میں نے یہاں نوٹ کی' وہ یہ کہ اگر دکان پر پڑی کسی چیز کی تیاری میں ذرا سا بھی نقص رہ گیا ہے' تو دکاندار گاہک کے اصرار کے باوجود اسے فروخت کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا' جبکہ ہمارے ہاں دکاندار سب سے پہلے اس قسم کا مال فروخت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے کسی دوست گاہک کا انتظار کرتے ہیں جو جاننے کے باوجود مارے مروت کے وہ چیز خریدنے سے انکار نہ کر سکے' اسی طرح یہاں رشوت اور اس نوع کی دوسری "مکھیوں" کے پلنے کے امکانات بھی ممکنہ حد تک ختم کر دیئے گئے ہیں' قتل' زنا بالجبر' اغوا اور ڈاکہ وغیرہ کے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں' البتہ آج کے "چائنا ڈیلی" میں ایک خوفناک ڈاکے کی خبر پڑھی ہے۔ جو ڈبل کالمی سرخی کے ساتھ بہت نمایاں طور پر لگائی گئی ہے' خبر یہ ہے کہ بیجنگ ریلوے سٹیشن پر ایک سو کے قریب افراد نے زبردست ڈاکہ زنی کی واردات کی' جس کے نتیجے میں وہ تربوزوں کی ایک بڑی تعداد لوٹ لینے میں کامیاب ہو گئے' ان میں سے بعض ڈاکو تربوزوں سمیت گرفتار کر لئے گئے ہیں جبکہ باقی تربوز برآمد کرنے کے لئے دیگر مقامات پر چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ دراصل گاؤں سے کچھ کسان تربوزوں کی کھیپ فروخت کرنے کے لئے بیجنگ لائے۔ ریلوے سٹیشن پر پرائیویٹ دکانداروں نے ان سے یہ تربوز خریدنے کی کوشش کی' لیکن جب ان کے اصرار کے باوجود یہ کسان تربوز بیچنے پر رضامند نہ ہوئے تو انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور جس کے ہاتھ جتنے تربوز لگے' وہ لے کر چلتا بنا۔ یہ خبر پڑھ کر میں نے بے اختیار قہقہہ لگایا تو ایک چینی دوست نے حیرت سے میرے ہنسنے کی وجہ پوچھی' اب میں اسے کیا بتاتا کہ برادرم! ڈاکہ یہ نہیں ہوتا' ڈاکہ تو یہ ہوتا ہے جس میں لاکھوں روپے کا مال اور کروڑوں روپوں کی عزتیں جاتی ہیں' ہمارے ہاں تو ایسے لوگ کھلنڈرے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کی اس نوع کی حرکتوں سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔

اور ہاں کالم کے آخر میں ہمیں یاد آیا کہ چین میں اس نوع کی "مکھیاں" تو ختم کر دی گئی ہیں' لیکن دیواروں پر "شیرا" لگانے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ یہ "شیرا" یورپین سیاح لگا رہے ہیں جنہوں نے ان دنوں چین پر یلغار کی ہوئی ہے اور فروغ سیاحت کا ادارہ زرمبادلہ کمانے کے چکر میں ان کی آؤ بھگت میں لگا رہتا ہے' یورپین سیاح یہ "شیرا" اپنی دولت کے مظاہرے' اپنے چکا چوند کرنے والے کلچر کی نمائش اور اپنی بے حجابانہ

تہذیب کی صورت میں لگا رہے ہیں، چین کی نوجوان مکھیوں نے ان شیرا نگی دیواروں پر بیٹھنا شروع کر دیا ہے۔ اور یوں ان کی فرسٹریشن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پیشتر اس کے کہ یہ سیاحی چین کے لئے "سیاہی" بن جائے، اس کا ابھی سے مداوا کر لینا چاہئے!۔

۲۸ مئی ۱۹۸۷ء

پھنگیو۔ پھنگیو

چین میں آ کر معلوم ہوا کہ "زبان یار من ترکی" والے شعر کا کیا مطلب ہے کسی فائیو اسٹار ہوٹل سے باہر قدم رکھیں تو غیر ملکیوں کے لئے "علاقہ غیر" شروع ہو جاتا ہے اور وہ یوں کہ ڈھونڈے سے بھی کوئی انگریزی جاننے والا نہیں ملتا کہ جس سے رستہ ہی پوچھ سکیں اور اگر کوئی انگریزی جانتا بھی ہے تو وہ "تقیہ" کرتا ہے۔ چنانچہ کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ اپنے ترجمان مسٹر لیو کی وساطت سے انگریزی میں میں گفتگو کرتے کرتے جب ہمارے جبڑے دکھنے لگے تو مخاطب نے گفتگو کے اختتام پر اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے انتہائی شستہ انگریزی میں خیر سگالی کے کلمات کہے اور گڈبائی کہہ کر رخصت ہو گیا۔ بس اس وقت ہم دانت کچکچا کر رہ جاتے ہیں اور "لارڈ میکالے" کی شان میں نازیبا کلمات کہنے لگتے ہیں، جس نے ہمیں انگریزی پر ڈال دیا اور چینیوں کو چین سے رہنے دیا۔ ویسے جہاں تک ہماری اپنی انگریزی کا تعلق ہے، وہ اپنے طور پر انگریزوں کو کو چڑانے کے لئے کافی ہے۔ آج کینٹن سے ہانگ چو آتے ہوئے ہم نے ایئر ہوسٹس سے بزبان انگلیسی پانی لانے کے لئے کہا اور اس کی انگریزی دانی پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا، جس پر اس بی بی نے استفہامیہ انداز میں کہا "ٹی"؟ ہم نے کہا "نوٹی۔ واٹر!" جس پر اس نے ڈبلیو کو اس کے صحیح مخرج سے ادا کرتے ہوئے کہا "اوہ، یُو مِین ووٹر" ہم نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ مسکراتی ہوئی پانی لینے چلی گئی، تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی اور اس نے ابلتے ہوئے پانی کا گلاس ہمارے ہاتھ میں تھما دیا واضح رہے کہ چین میں سادہ پانی کا کوئی تصور نہیں ہے، پینے والے کھانے کے ساتھ یا تو بیئر پیتے ہیں۔ ورنہ سخت گرمیوں میں بھی ابلتے ہوئے پانی سے پیاس بجھائی جاتی ہے، ہوٹل میں ہماری فرمائش پر پانی فراہم کیا جائے تو وہ گرم ہوتا ہے اور ٹھنڈے پانی پر اصرار کیا جائے تو اس میں برف کے ٹکڑے ڈال دیئے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے ہمیں ہر وقت "گرم سرد" ہونے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔

چینیوں کو اپنی قومی زبان چینی اور ہمیں اپنی "قومی زبان" انگریزی پر جس قدر اصرار ہے، اس کا ایک مظاہرہ بیجنگ ایئرپورٹ پر بھی ہوا، ہم بسکٹ خریدنے کے لئے ایئرپورٹ پر واقع ایک دکان پر گئے اور سیلز گرل سے کہا "ون پیکٹ بسکٹ پلیز" اس نے اپنے کاندھوں کو جھٹکا اور چینی میں کہا کہ اسے میری بات سمجھ نہیں آئی (ظاہر ہے اس نے یہی کہا ہو گا!) چنانچہ ہم بے نیل و مرام واپس آ گئے۔ اے پی پی کے عُزیر صاحب پاکستانی سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹری حبیب صاحب کے ساتھ ہمیں کینٹن کے لئے الوداع کہنے آئے ہوئے تھے، ہم نے ان کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے کہا آپ میرے ساتھ آئیں، عزیر صاحب برس ہا برس سے چین میں

رہ رہے ہیں چنانچہ ہمیں اپنا مسئلہ حل ہوتا محسوس ہوا اور ہم ان کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ عزیر صاحب نے سیلزگرل کو مخاطب کیا اور بسکٹ کی س کوش میں بدلتے ہوئے کہا "بشکٹ پلیز" اور مطمئن ہو گئے کہ انہوں نے اپنا مافی الضمیر بیان کر دیا ہے مگر اس دفعہ سیلزگرل نے زیادہ زور سے اپنے کاندھے اچکائے اور چینی زبان میں ہمیں مخاطب کر کے کہا "بڑے آئے تھے اپنا حمایتی لے کر۔ اونہہ" (ظاہر ہے اس نے یہی کہا ہوگا) تب عزیر صاحب کی نظر اچانک شوکیس میں پڑے بسکٹ کے ڈبے پر پڑی اور انہوں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ش پر کچھ مزید زور دیا اور کہا "بشکٹ پلیز!" اس دفعہ سیلزگرل کو عزیر صاحب کی چینی سمجھ آ گئی' جس پر عزیر صاحب نے فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھا' حالانکہ ان نظروں سے انہیں اپنی انگلی کی طرف دیکھنا چاہیے تھا۔

چین میں ہم پاکستانیوں کے لئے ایک مسئلہ زبان کے علاوہ بھی ہے اور وہ کلچر کا ہے۔ چین کا کلچر چینی ہے اور ہم پاکستانیوں کا کلچر مغربی ہے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہیں تو چینی اپنی تہذیب کے مطابق لکڑی کی دو چھڑیوں سے کھانا کھاتے ہیں اور ہم "اپنی" تہذیب کے مطابق چھری کانٹے سے کھانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں ہر دفعہ خصوصی طور پر چھری کانٹے کا آرڈر دینا پڑتا ہے۔ اسی طرح چینی جب چائے پیتے ہیں تو وہ قہوہ نما ہوتی ہے جس میں وہ دودھ اور چینی کی "ملاوٹ" نہیں کرتے جبکہ ہم چائے وہ پیتے ہیں جو انگریز پیتا ہے۔ لیکن ہر جگہ ہماری فرمائش پوری ہونا ممکن نہیں چنانچہ اب ہم نے کالی چائے کا ایک پیکٹ' خشک دودھ اور چینی علیحدہ منگوالی ہے' ابلتے ہوئے پانی کا تھرماس تو کمرے میں موجود ہوتا ہی ہے۔ بس جب چائے کی طلب ہوتی ہے' ابلتا ہوا پانی کپ میں انڈیلتے ہیں اور دودھ چینی اور ٹی بیگ اس میں ڈال کر انگلی سے ہلانے کی کوشش کرتے ہیں' انگلی سے اس لئے کہ چین میں "چمچے" آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے' چنانچہ ابلتے ہوئے پانی کو انگلی سے ہلانے کی کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو چائے پی لیتے ہیں ورنہ اس پانی کا کوئی اور مصرف تلاش کرتے ہیں۔

ویسے پاکستانیوں اور چینیوں کے اتنے "اختلافات" کے باوجود ایک رابطہ ایسا موجود ہے جس سے یہ ساری رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں' "اختلافات" تو ہم نے بیان کر دیئے ہیں یعنی یہی کہ چینی آزاد قوموں کی طرح اپنی زبان اور اپنے کلچر سے محبت کرتے ہیں' جبکہ ہم نے آزادی کے چالیس سال بعد بھی مغربی اطوار اپنائے ہوئے ہیں' تاہم ایک لفظ ایسا ہے جو چینی فوراً سمجھ جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی "زبان و بیان" کی ساری مشکلیں دور ہو جاتی ہیں۔ یہ لفظ "پاکستان" ہے ہم نے اس لفظ کے ساتھ "ساتواں در" بھی کھلتے دیکھا ہے' جب اپنا مفہوم بیان کرنے میں پوری طرح ناکام ہو جائیں' اس وقت اپنی طرف اشارہ کر کے صرف "پاکستان" کہہ دیا جائے تو چینیوں کے چہرے کھل اٹھتے ہیں اور وہ "پھنگیو' پھنگیو" (دوست' دوست) کہتے ہوئے وارفتگی کا وہ انداز اپناتے ہیں کہ پاکستانیوں کے لئے جس کی نظیر صرف ترکی میں ملتی ہے۔ اس کے بعد آپ کو جو کچھ درکار ہوتا ہے' اس کا پتہ وہ خود چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیجنگ میں مقیم اردو کے غزل گو شاعر اور "چین باتصویر" کے ایڈیٹر چنگ شوشیا جو عالم تخلص فرماتے ہیں۔ تقریباً تیس کلو میٹر کا فاصلہ بس کے ذریعے طے کر کے ہمارے ہوٹل

میں ہمیں ملنے آئے اور کہا "ہم چینیوں کو آپ سے اتنی محبت ہے جتنی اردو غزل کے عاشق کو اپنے محبوب سے ہوتی ہے" جن ملکوں سے ہمارا چھری کانٹے کا تعلق ہے' انہیں ہماری بات ہی سمجھ نہیں آتی اور چین کو ہماری بات مکمل طور پر سمجھ میں آجاتی ہے' بس اس کے لئے اسم اعظم "پاکستان" کا لفظ ہے اور "پاکستان" کا مطلب یہاں صرف "پھنگیو" ہے!۔

۲۷ مئی ۱۹۸۷ء

چینی قاعدہ

بیجنگ، شنگھائی، کینٹن، ہانگ چو اور نان جنگ میں سولہ دنوں کے دوران لاکھوں کی تعداد میں سائیکل سوار دیکھے ہیں، اب اگرچہ وطن لوٹے ایک ہفتہ ہونے کو ہے، مگر خواب میں اب بھی ہر طرف سائیکلیں نظر آتی ہیں۔ بلکہ وطن واپسی پر پہلے روز تو یوں ہوا کہ ہم جس اکا دکا سائیکل سوار کو دیکھتے، اسے چینی سمجھ کر ہاتھ ہلا ہلا کر "نی ہانی ہا" (ہیلو ہیلو) کہنے لگتے ویسے چین جا کر ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے انقلابی دانشور جب "جلاوطنی" اختیار کرتے ہیں تو پاکستان کے عظیم ترین دوست اور مایہ ناز انقلابیوں کے وطن چین کا رخ کرنے کی بجائے برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، بیلجیم، ناروے، سویڈن، اور امریکہ کیوں سدھارتے ہیں، پتہ چلا کہ انہیں دراصل سائیکل چلانے کی پریکٹس نہیں ہے بلکہ خود سائیکل چلانا تو در کنار، یہ کسی اور کے ساتھ سائیکل پر بیٹھیں تو اس کے "کتے" بھی فیل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ ایوب خاں سے لے کر ذوالفقار علی بھٹو تک میں سے جس کی "عوامی" سائیکل پر بھی بیٹھے، اس کے کتے فیل ہو گئے۔ بہر حال اس گئے گزرے زمانے میں بھی دانشوروں میں تین چار سائیکل سوار مل جاتے ہیں، ان میں سے ایک ڈاکٹر سلیم اختر، دوسرے مبارک احمد اور تیسرے پروفیسر مسعود الحق صدیقی ہیں اور یہ تینوں "دانے" لاہور کے ہیں، اگر ان دوستوں کو چین کی سیاحت کا کبھی موقع ملے تو یہ زیادہ سے زیادہ عرصہ چین میں گزارنا پسند کریں کہ سائیکل سواری کے حوالے سے تو پاکستان میں ان دانشوروں کا شمار اقلیت میں ہوتا ہے۔ جبکہ وہاں یہ غالب اکثریت میں ہوں گے۔

ویسے شنگھائی میں ہماری ملاقات وہاں کے معروف ناول نگار مسٹر سون (   ) سے ہوئی، جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ ان دو ادیبوں میں سے ایک ہیں جن کے پاس موٹر سائیکل ہے، ہم نہیں جانتے کہ شنگھائی میں لاہور کے ٹی ہاؤس جیسا کوئی ٹی ہاؤس ہے کہ نہیں جہاں شام کو ادیب اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کی چغلیاں کرتے ہیں، اگر ہے تو پھر اس کی میزوں پر یقیناً مسٹر سون کو "بورژوا" قرار دیا جاتا ہوگا کیونکہ ان کے بارے میں ایک بات یہ بھی بتائی گئی تھی کہ انہوں نے گھر میں کتا بھی پالا ہوا ہے۔ ہمارے بعض جاگیردار قسم کے ادیبوں نے بھی کتے پالے ہوئے ہیں جو شرفاء پر بھونکنے میں لگے رہتے ہیں مگر شنگھائی میں مسٹر سون کے کتے کا بطور خاص ذکر غالباً اس لئے اہم ہے کہ انہوں نے ابھی تک یہ "لذیذ" جانور سنبھال کر رکھا ہوا ہے، بہر حال مسٹر سون کی وضعداریاں ہمیں تاحیات نہیں بھولیں گی، وہ وکٹورین عہد کے کسی جنٹل مین کی طرح اپنا ہاتھ بڑھا کر خواتین کو جس اہتمام سے سیڑھیاں اترنے میں مدد دیتے، کھانے کی میز پر جس طرح ادب آداب اور رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ

کرتے اور اپنے مہمانوں کی ذرا ذرا سی ضرورت کا جس طرح خیال رکھتے' وہ وفد کے تمام ارکان کا دل موہنے کے لئے کافی تھا' چنانچہ مسٹر سون ہمیں تمام چینی دوستوں میں سب سے زیادہ یاد آتے ہیں۔

یہ مسٹر سون کا ذکر درمیان میں بلاارادہ آگیا' جبکہ ذکر تو چین میں سائیکلوں کی بہتات کا ہو رہا تھا' سائیکل کے علاوہ چین میں دوسری عوامی سواری بس ہے' جو اکہری نہیں دوہری ہے' یعنی لوگ باقاعدہ دو بسوں پر سفر کرتے ہیں' دور دراز شہروں کو جانا ہو تو ٹرینیں ہیں جو کبھی لیٹ نہیں ہوتیں' یہاں ایک دلچسپ بات کا بیان ضروری ہے اور وہ یہ کہ چین میں جہاز ہمیشہ لیٹ ہوتا ہے اور ٹرین کبھی لیٹ نہیں ہوتی۔ جہاز کی تاخیر کے بارے میں تو لوگ اتنے یقینی ہوتے ہیں کہ جیب میں تاش ڈال کر گھر سے چلتے ہیں۔ چنانچہ کینٹن ایئرپورٹ پر میں نے سینکڑوں چینیوں کو دیکھا کہ گرمی کی وجہ سے قمیص اتار کر کاندھوں پر رکھی ہوئی ہے اور چار چار' پانچ پانچ کی ٹکڑیوں میں بورڈنگ ہال کے فرش پر بیٹھے "ننگ پتہ" کھیل رہے ہیں' بلکہ بیجنگ ایئرپورٹ پر جہاز کے لیٹ ہونے کی وجہ سے تو ایک سگھڑ قسم کے چینی شوہر نے تھیلے میں سے مٹر نکال کر میز پر انڈیلے اور ان کے دانے الگ کرنا شروع کر دیئے تاکہ گھر پہنچنے پر کھانے میں تاخیر نہ ہو۔ ویسے چینی ایئرلائن میں مہمانوں کی خاطر مدارات بہت ہوتی ہے' ان کی اندرون ملک پروازوں میں بھی مہمانوں کو تحفے تحائف دیئے جاتے ہیں' ہم تو وہاں اکانومی کلاس میں سفر کرتے رہے' فرسٹ کلاس کے مسافروں کے تو اللہ جانے کتنے ناز نخرے اٹھائے جاتے ہوں گے۔ البتہ اس کا ایک مظاہرہ ہم نے ٹرین کی فرسٹ کلاس میں تو دیکھا ہے کہ اٹینڈنٹ لڑکی مسلسل مہمانوں کی خاطر مدارات میں مشغول رہتی ہے' تھرڈ کلاس میں شاید یہ ممکن نہ ہو کیونکہ یہ ڈبہ ہمارے ڈبے کے ساتھ جڑا ہوا تھا اور ہم نے دیکھا کہ وہاں صحیح معنوں میں بندے پر بندہ چڑھا ہوا تھا' اور یوں اٹینڈنٹ لڑکی کو تو اس بھیڑ میں سے گزرنے کی جگہ بھی نہیں ملتی ہوگی۔

بات سائیکلوں سے چلی تھی' مگر اس کا دائرہ پھیلتے پھیلتے ہوائی جہاز اور ٹرین تک وسیع ہو گیا' سو اس "وسعت بیاں" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ ذکر چین کے ہوٹلوں کا بھی ہو جائے' ہمارے میزبانوں نے ہمیں شنگھائی میں اس ہوٹل میں ٹھہرایا جہاں گذشتہ برس امریکہ کے صدر مسٹر ریگن کو ٹھہرایا گیا تھا' کینٹن میں ہمارا قیام فائیو سٹار ہوٹل "وائٹ سوان" میں تھا' اسی طرح دوسرے شہروں میں بھی ایسے ہوٹلوں میں ہماری بکنگ کرائی گئی' جہاں اگر اپنے خرچ پر ٹھہرتے تو ہم ورلڈ بنک کے مقروض ہو جاتے۔ ہمیں تو حیرت ان چینیوں پر تھی جو ان ہوٹلوں میں مقیم تھے اور ڈائننگ ہال میں نہایت مہنگے کھانے کھاتے نظر آتے' تاہم ہماری یہ پریشانی ہمارے مترجم نے دور کر دی' اس نے بتایا کہ یہ لوگ اعلیٰ سرکاری افسران ہیں اور اپنے محکموں کے خرچ پر ان ہوٹلوں میں آکر ٹھہرتے ہیں اور یہ جو تم جاپان کی بنی ہوئی ایئر کنڈیشنڈ کاریں ان کے زیر استعمال دیکھتے ہو یا اگر یہ تمہیں ہوائی جہاز یا ٹرین کی فرسٹ کلاس میں سفر کرتے نظر آتے ہیں تو یہ سب کچھ سرکاری خرچ پر ہے' ورنہ ان بیچاروں کی تنخواہ بھی ایک عام چینی مزدور کی طرح چار پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں۔

اور آخر میں ایک بہت "ضروری" بات! اور وہ یہ ہے کہ ہم نے پورے چین میں کوئی گنجا نہیں دیکھا' ایسا

نہیں کہ وہاں گنجوں کو ڈومیسائل نہیں ملتا گنجے ضرور ہوں گے' جیسا کہ وفد کے قائد پروفیسر پریشان خٹک سے جونہی ہم نے کہا کہ چین میں ہمیں کوئی گنجا شخص نظر نہیں آیا تو انہوں نے فوراً انگلی سے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا اور کہا "ایک گنجا تو اس وقت تمہارے سامنے کھڑا ہے!" اور وہ چینی گنجا ہی نہیں بہت ہی گنجا تھا' چنانچہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سولہ سترہ دنوں کے دوران ہمیں صرف ایک "گنج گراں مایہ" نظر آیا اسی طرح ہمیں چین میں موٹے لوگ بھی بہت کم دکھائی دیئے' بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں ذاتی طور پر کوئی ایک موٹا چینی دیکھنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا' پوری قوم صحت مند اور سمارٹ ہے اور یہ قوم صحت مند اور سمارٹ کیوں نہ ہو' خون پسینہ ایک کر کے روزی کماتی ہے اور کھایا پیا ہضم کرنے کے لئے سائیکل چلاتی ہے۔ جس روز اس قوم میں گنجے اور موٹے لوگ نظر آنا شروع ہو گئے' اس روز ہمارے تعلقات چین سے مزید بہتر ہو جائیں گے۔ خدا کرے یہ تعلقات مزید بہتر بنانے کے لئے چینیوں کو ہمارے جیسا نہ ہونا پڑے بلکہ ہم لوگ اپنی حرام کی تجوریوں جیسی موٹی توندوں کو "قانون" اور اخلاق کی حدود میں لائیں۔ آج کے کالم میں چینی قاعدے میں سے سیکھنے کے لئے یہی ایک سبق کافی ہے!

۴ر جون ۱۹۸۷ء۔

خوشگوار ازدواجی زندگی

ہم نے اپنے امریکہ کے ایک سفرنامے میں ایک امریکی خاتون کے اس الزام کہ پاکستان میں شادی سے قبل لڑکے لڑکیوں سے ان کی رائے پوچھی نہیں جاتی کی تردید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ہمارے ہاں شادی سے قبل جوڑے سے ضرور پوچھا جاتا ہے کہ کیا تمہیں یہ رشتہ منظور ہے اگر وہ" ہاں " کہہ دے تو شادی کی جاتی ہے اور اگر " نہ " کہہ دے تو بھی کر دی جاتی ہے چنانچہ یہ الزام بالکل غلط ہے کہ ہمارے ہاں شادی سے قبل جوڑے سے پوچھا نہیں جاتا کیونکہ پوچھا بہر حال جاتا ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کرنے والوں کی تعداد ماشاءاللہ خاصی زیادہ ہے اور ایسے خوش و خرم جوڑوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ابھی گزشتہ روز ایک ایسے ہی شوہر نامدار سے ہماری ملاقات ہوئی جن کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا ثبوت ان کی قابل رشک جسمانی صحت سے بھی مل رہا تھا۔ پھر بھی ہم نے احتیاطاً پوچھ لیا کہ ان کی صحت کا راز کیا ہے۔ کہنے لگے دن میں بیس پچیس میل لمبی واک ہم نے حیران ہو کر پوچھا وہ کیسے ؟ کہنے لگے اگرچہ خوشدلی سے نہیں مجبوراً کرتا ہوں مگر پھر بھی اس سے مجھے فائدہ ہی ہوا ہے۔ ہمارے مکرر استفسار پر انہوں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ شادی کے بعد میاں بیوی میں معاہدہ ہوا کہ دونوں میں سے جسے کسی بات پر غصہ آئے وہ اپنے غصے کو ضبط کرنے کے لئے ایک میل لمبی سیر کو نکل جائے تاکہ اس دوران اس کا غصہ سرد ہو جائے بس یہ اس معاہدے ہی کی برکت ہے کہ دن میں بیس پچیس میل سیر کرتا ہوں جس کے نتیجے میں فٹ نظر آ رہا ہوں۔

ایک اسی طرح کا خوش و خرم جوڑا ہمارے ہمسائے میں رہتا ہے ان کے گھر سے ہر وقت ہنسنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ ایک روز ہم نے مارے حسد کے پوچھ ہی لیا کہ میاں اپنی خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز ہمیں بھی بتاؤ اور یہ گر توخصوصاً سکھلاؤ جس کے نتیجے میں تم میاں بیوی سارا دن ہنستے رہتے ہو یہ سن کر میاں نے کہا اپنے کان ادھر لاؤ اور پھر رازداری کے انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ میری بیوی غصے کی تیز ہے (یہاں تیز کی بجائے انہوں نے ایک اور لفظ کہا تھا) چنانچہ اسے جب غصہ آتا ہے تو وہ مجھے برتن اٹھا اٹھا کر مارنے لگتی ہے۔ اگر اس کا نشانہ صحیح لگے تو وہ ہنسنے لگتی ہے اور اگر نشانہ خطا ہو جائے تو مارے خوشی کے میں ہنستا ہوں پس ثابت ہوا کہ یہی وہ جوڑے ہیں جو ایک دوسرے کے جوڑوں میں بیٹھ جاتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں تو سب کچھ جائز ہے وہ بھی جس کا ذکر ہم نے اوپر کی سطور میں کیا ہے۔

کالم کے آغاز میں ہم نے امریکہ کا حوالہ دیا تھا دراصل ہماری نسبت وہ لوگ بہت زیادہ تکلیف میں ہیں

کیونکہ ہم لوگ اوپر بیان کی گئی دو مثالوں اور اس جیسی دوسری مثالوں کے باعث مثالی زندگی بسر کرتے ہیں یعنی لمبی لمبی واک کرتے ہیں اور چاندماری کے دوران نشانہ لگنے یا خطا ہونے یعنی دونوں صورتوں میں ہنستے ہیں اور ان سب چیزوں کے باوجود طلاق کی نوبت نہیں آتی پس ثابت ہوا ہم لوگ خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز جانتے ہیں جبکہ مغرب کے لوگ تو اتنے نازک مزاج ہیں کہ اگر میاں بیوی میں نہ بنتی ہو تو فوراً طلاق لے کر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں اور اپنی من پسند جگہ پر شادی کر کے خوش و خرم زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ دراصل انہیں مان اس بات کا ہے کہ ان کے معاشرے کا ہر فرد معاشی طور پر خود کفیل ہے جبکہ ہمارے ہاں خوشگوار ازدواجی زندگی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عورت معاشی طور پر مرد کی محتاج ہوتی ہے بلکہ پیدائش کے فوراً بعد سماجی طور پر بھی اسے یہی سمجھایا جاتا ہے۔ کہ شادی کے بعد شوہر کے گھر سے تمہارا جنازہ ہی اٹھنا چاہئے سو یہ جنازے ہمارے ہاں اٹھتے ہی رہتے ہیں مغرب والے اس معاملے میں بدقسمت ہیں انہیں کیا پتہ کہ۔

پلٹنا جھپٹنا جھپٹ کے پلٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اگر پتہ چل جائے تو وہ بھی فوراً ہماری تقلید پر اتر آئیں۔

یہ جو باتیں ہم نے ابھی لکھی ہیں اپنے ایک دوست سے بیان کیں تو اس نے ناک بھوں چڑھایا اور کہا ہم مشرقی لوگ خواہ مخواہ ہر معاملے میں مغرب والوں پر برتری کا دعویٰ کرتے رہتے ہیں حالانکہ کئی معاملات میں وہ ہم سے بہتر ہیں ہم نے پوچھا مثلاً کہنے لگا مثلاً یہ کہ وہ زندہ دل بہت ہیں اپنی بات کی وضاحت میں اس نے بتایا کہ بسا اوقات طلاق لیتے ہوئے بھی وہ زندہ دلی کے مظاہرے سے باز نہیں آتے مثلاً ایک عورت نے طلاق لینے کے لئے عدالت میں موقف اختیار کیا کہ اس کا شوہر اس کے پالتو کتے ٹونی سے خواہ مخواہ چڑتا ہے حالانکہ وہ ٹونی سے زیادہ اپنے شوہر سے تنگ ہے کیونکہ شوہر سوتے میں خراٹے بہت لیتا ہے جبکہ ٹونی سوتے میں خراٹے تو نہیں لیتا یہ بات ہمارے دوست نے صحیح کہی کیونکہ مغرب والوں کی زندہ دلی کے تو اور بھی بے شمار واقعات مشہور ہیں مثلاً ایک شخص نے مرمت وغیرہ کے لئے گھر آئے ہوئے پلمبر کے کام سے خوش ہو کر اسے پچاس ڈالر انعام کے طور پر دیتے ہوئے کہا بیگم کو فلم پر لے جانا پلمبر شکریہ ادا کر کے چلا گیا شام ڈھلے سوٹ پہن کر واپس اسی گھر میں آیا اور کہا بیگم صاحبہ کو باہر بھیج دیں صاحب خانہ نے پوچھا وہ کیوں؟ کہنے لگا آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ شام کو بیگم صاحبہ کو فلم پر لے جانا۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے ہم تھوڑا سا ٹریک سے اتر گئے جبکہ بات مشرق اور مغرب کے حوالے سے ہو رہی تھی اور صرف خوشگوار ازدواجی زندگی کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ دراصل ہمارے ہاں خوشگوار ازدواجی زندگی کا پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ بہت فعال ہے اور اسے اپنی اعلیٰ کارکردگی کی بناء پر مثالی کہا جا سکتا ہے چنانچہ ہمارے ہاں میاں بیوی ایک طویل عرصے تک ایک ہی مکان میں رہتے ہیں اور ان کی ساری عمر۔

میرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے۔
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

کی دعا مانگتے بسر ہو جاتی ہے اور لوگ ہیں کہ ان کی مثالی خوشگوار ازدواجی زندگی کی مثالیں دیتے ہیں آخر میں ہم نے وہ مشہور مقولہ دہرانا ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے اور اس میں اضافہ صرف یہ کرنا ہے کہ ہر ناکام مرد کے پیچھے کئی عورتیں ہوتی ہیں۔ ''خوشگوار'' ازدواجی زندگی بسر کرنے والے خواتین و حضرات نوٹ فرمالیں ۔

۸ مئی ۱۹۸۶ء

عالمی طنز و مزاح کانفرنس

اس دفعہ ہم نے بھارت کو قدرے تفصیل سے دیکھا ہے۔ پہلے دو دفعہ تو ہم دہلی، لکھنؤ، امرتسر، چندی گڑھ، انبالہ اور سہارن پور وغیرہ تک گئے تھے۔ مگر اب کے ہماری مار جنوبی بھارت تک تھی۔ یعنی ہمیں راماراؤ کا آندھرا پردیش دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ اس کے علاوہ ہم بمبئی کے ساحلوں تک بھی پہنچے تاہم آج کے کالم میں خود کو حیدر آباد دکن تک محدود رکھیں گے۔ جہاں ۸ فروری سے ۱۲ فروری تک عالمی طنز و مزاح کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس گذشتہ کچھ برسوں سے زندہ دلان حیدر آباد کے زیر اہتمام منعقد ہو رہی ہے۔ مگر اس دفعہ کانفرنس کا دائرہ وسیع کر کے اسے بین الاقوامی سطح پر منعقد کیا گیا۔ جس کے لئے زندہ دلان حیدر آباد نے حکومت ہند کا تعاون حاصل کیا۔ چنانچہ دوسرے ملکوں سے آنے والے وفود کی میزبانی کے فرائض بھارتی حکومت نے انجام دیئے۔

اب ایک سچی بات ہم آپ کو کالم کے شروع ہی میں بتا دیں کہ جب سید ضمیر جعفری اور راقم الحروف اس کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کے لئے بھارت روانہ ہوئے تو ہم نے اس کانفرنس کو بھی اسی طرح کی "بین الاقوامی" کانفرنس سمجھا تھا۔ جس طرح کا "بین الاقوامی" مشاعرہ اپنے برادرم غضنفر مہدی اسلام آباد میں منعقد کرواتے ہیں مگر یہ بھید تو وہاں جا کر کھلا کہ یہ تو سچ مچ کی عالمی کانفرنس ہے اور اس میں بھارت کی تمام زبانوں کے مزاح نگار بھی شریک ہیں مزید یقین اس وقت آیا جب ہم نے سٹیج پر پاکستان سمیت چودہ ملکوں کے پرچم لہراتے دیکھے اور ان پرچموں کے پیچھے ان ملکوں کی نمائندگی کرنے والے امریکی، روسی، جرمن، جاپانی، مصری، بلغارین، بنگلہ دیشی، اسپینش، ساؤتھ کورین اور دوسرے ملکوں کے مزاح نگاروں کو براجمان دیکھا۔ کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں بھارتی ٹیلی ویژن، ریڈیو اور بھارت میں شائع ہونے والے تمام زبانوں کے اخبارات نے کانفرنس کی مکمل کوریج کی، وہاں بیرونی خبر رساں ایجنسیوں کے نمائندے بھی یہاں موجود تھے۔ چنانچہ بی بی سی سے اس عالمی مزاح کانفرنس کے حوالے سے آدھ گھنٹے کا پروگرام نشر کیا گیا۔ بھارت کے محکمہ ڈاک نے اس موقع پر خصوصی ٹکٹ جاری کئے جن پر چارلی چپلن کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ نیز ڈاک کا لفافہ بھی شائع کیا گیا۔ کانفرنس کے ضمن میں بھارتی حکومت کے تعاون اور دلچسپی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے مختلف اجلاسوں کی صدارت سرکردہ صاحبان اقتدار نے کی۔ ایک اطلاع کے مطابق آنجہانی مسز اندرا گاندھی کو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرنا تھی۔ مگر ان کے ناگہانی قتل

کی وجہ سے اس فیصلے پر عمل در آمد نہ ہو سکا۔

کانفرنس کا افتتاح لوک سبھا کے سپیکر مسٹر بلرام جاکھر نے شمع روشن کر کے کیا۔ جب وہ شمعیں جلا چکے تو رویندر بھارتی ہال میں لگے سپیکروں سے فلک شگاف قہقہے سنائی دینے لگے اور یہ قہقہوں کی ٹیپ تھی جو اس وقت آن کر دی گئی تھی۔ ایک دفعہ تو بلرام جاکھر بھی گھبرا گئے کہ ان پر اتنے سارے قہقہے لگانے والے کہاں سے آ گئے اور ان کی یہ گھبراہٹ اتنی بے جا بھی نہ تھی کیونکہ وہ حکومتی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور بھارت کی مضبوط ترین اپوزیشن کے لیڈر راما راؤ کے علاقے میں آئے ہوئے تھے۔ لیکن یہ غالباً ہمارا اپنا وہم تھا کیونکہ بھارت میں بری بھلی جمہوریت کی بنیادیں بھی بہر حال اتنی مضبوط ہیں اور اس میں اتنی رواداری موجود ہے کہ متذکرہ افتتاحی اجلاس کی صدارت اگر لوک سبھا کے سپیکر بلرام جاکھر کر رہے تھے تو یہاں مہمان خصوصی راما راؤ حکومت کے وزیر صحت آنند گجپتی راجو تھے۔ بلرام جاکھر طویل القامت اور بارعب شخصیت کے حامل ادھیڑ عمر شخص ہیں وہ پنجابی ہیں انہوں نے اپنی تعلیم لاہور میں حاصل کی، ململ کا کرتا اور ہندوؤں کے مخصوص انداز میں دھوتی باندھے ہوئے جب وہ مائک پر آئے تو ہمارا خیال تھا کہ موصوف لیڈروں کے انداز میں تقریر فرمائیں گے کہ ہنسنا اچھی چیز ہے۔ تاہم ملک و قوم کا مفاد ہمیں مقدم رکھنا چاہئے وغیرہ وغیرہ مگر انہوں نے تو آتے ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لطیفے سنانے شروع کر دیئے اور محفل کو کشت زعفران بنا دیا ان لطیفوں میں سے ایک لطیفہ تو اس مراثی کا بھی تھا جسے رنجیت سنگھ نے موت کی سزا دی تھی اور وہ رنجیت سنگھ کو دیکھ دیکھ کر بس یہی کہے جا رہا تھا کہ "لگدا تے نیں پر خورے" یعنی "لگتا تو نہیں مگر شاید" رنجیت سنگھ نے تنگ آ کر پوچھا "اوئے یہ تم کیا کہہ رہے ہو میں کیا نہیں لگتا؟" اس پر مراثی نے ہاتھ باندھ کر کہا "حضور جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ بچپن میں ایک نجومی نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ تمہاری موت ایک بے وقوف شخص کے ہاتھوں ہوگی۔ حضور لگدا تے نیں پر خورے" اصل لطیفہ نہ بلرام جاکھر سنا سکتے تھے نہ ہم نقل کر سکتے تھے۔ سو اس میں کچھ ترمیم انہوں نے کی اور کچھ ہم نے کر دی اور یوں اس کی صورت ویسی ہی ہو گئی ہے جیسی ۷۳ء کے آئین کی ہوتی جا رہی ہے "نظریہ ضرورت" اسی کو کہتے ہیں۔

حیدر آباد دکن میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں ایک بات ہم نے یہ دیکھی کہ اس کے ہر سیشن میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے تھے اور دل کھول کر ہنستے تھے چنانچہ سید ضمیر جعفری کو یہ پوچھنا پڑا کہ بھئی اس شہر پر کیا سانحہ گزر گیا ہے جو یہاں کے لوگ اتنے بھرپور قہقہے لگاتے ہیں؟ حیدر آباد دکن کی اس عالمی طنز و مزاح کانفرنس کے سامعین کسی ایک اجلاس میں شرکت کے بعد آرام سے نہیں بیٹھ گئے۔ بلکہ وہ اس کے سبھی اجلاسوں میں پورے تواتر کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔ ایک تو افتتاحی اجلاس تھا جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے اس کے علاوہ اردو میں طنز و مزاح کے موضوع پر ایک مذاکرہ ہوا، مزاحیہ فلموں کا شو ہوا، بین الاقوامی لطیفوں کا سیشن ہوا، جس میں مختلف ملکوں کے لوگوں نے بہت مزے مزے کے لطیفے سنائے۔ ایک عظیم الشان اردو ہندی مزاحیہ مشاعرہ ہوا۔ جس میں کم از کم پندرہ ہزار سامعین نے شرکت کی۔ ایک سیشن اردو میں نثری طنز و مزاح کا ہوا ان کے علاوہ

ہندوستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے علیحدہ علیحدہ سیشن منعقد ہوئے۔ ایک بین الاقوامی سیشن ان کے علاوہ تھا۔ جس میں مزاح کی ایک عالمی انجمن تشکیل کی گئی۔ غرضیکہ پانچ روز تک زندہ دلان حیدر آباد نے غالباً ہنسنے ہنسانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا۔ زندہ دلان حیدر آباد کے عہدیداران نریندر لوتھر' حمایت اللہ' مصطفیٰ بیگ' مصطفیٰ کمال اور طالب خوندمیری ایک اجلاس سے فارغ ہوتے تھے تو دوسرے اجلاس کی تیاریوں میں مشغول نظر آتے تھے۔ ان پانچ دنوں کے علاوہ گذشتہ تین مہینوں سے وہ اس کانفرنس کی تیاریوں میں شب و روز مشغول تھے۔ یہ سب کے سب مزاح نگار ہیں اور یوں انہوں نے ثابت کیا کہ مزاح نگاروں کے اعصاب دوسروں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ مزاح لکھنے والا تو مزاح لکھ کر خود ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے اعصابی نظام تو دوسروں کا متاثر ہوتا ہے ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین دہلی میں ہوتے ہیں مگر حیدر آبادی ہیں۔ اور زندہ دلان حیدر آباد کے بنیادی ارکان میں سے ہیں چنانچہ وہ دہلی میں بیٹھ کر کانفرنس کی تیاریوں میں مشغول رہے اور کانفرنس سے صرف ایک دن قبل حیدر آباد پہنچے۔ کانفرنس کے عہدیداروں کے علاوہ یہاں جن دوسرے ادیبوں کو کانفرنس کی کامیابی کے لئے دن رات ایک کرنا پڑا ان میں مسیح انجم' بیگ احساس اور ذہانت بیگ شامل تھے۔ حیدر آباد کے موقر روزنامہ "سیاست" نے اس موقع پر کانفرنس کے منتظمین کے ساتھ بھرپور تعاون کر کے علم و ادب کے ساتھ اپنی وابستگی کی روایت کو پوری طرح نبھایا اور غالباً یہ اتنے سارے لوگوں کے خلوص اور شبانہ روز محنت کا نتیجہ تھا کہ یہ کانفرنس طنز و مزاح کے حوالے سے عالمی سطح پر ایک بھرپور کوشش کا نقطہ آغاز ٹھہری اور یوں اس کے بعد جو کچھ ہو گا وہ تقلید میں شمار ہو گا۔

ہم کانفرنس کے ذکر میں کچھ اس قدر محو ہوئے کہ اس کے بعض خصوصی مندوبین کا ذکر ہی بھول گئے۔ جب سید ضمیر جعفری اور راقم حیدر آباد کے ایئرپورٹ پر اترے تو ہم نے دیکھا کہ استقبال کے لئے آنے والے منتظمین ہمارے علاوہ ایک اور شخص کو بھی خوش آمدید کہہ رہے ہیں یہ ایک دراز قد خوبصورت نوجوان تھا شکل سے کشمیری بٹ لگتا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ روسی مزاح نگار ہے۔ روسی ہمیں روز اول سے چاقو سے گدگدیاں کر کے ہنسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ نوجوان ہمیں بہت بھلا لگا۔ شاید اس لئے کہ یہ سیاست دان نہیں سچ مچ مزاح نگار تھا۔ بنگلہ دیش کے خوندکر علی اشرف ہمیں ملے اور اتنی گرمجوشی سے بغل گیر ہوئے کہ سارے گلے شکوے جاتے رہے۔ بلغاریہ سے "ہاؤس آف ہیومر" کے نمائندہ دو مزاح نگار کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے' ایک مسٹر سٹیفن اور دوسری مس گلینا' خوبصورت خدوخال والی گلینا کو جو مزاح نگار بھی دیکھتا سیریس ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد باقی مندوبین کا ذکر کیا کریں؟۔

۲۴ فروری ۸۵ء

طبیب اور مریض

بہت عرصے سے نزلے نے ہمیں اور ہم نے نزلے کو کچھ نہیں کہا تھا۔ ہم دونوں پر امن بقائے باہمی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کی' دوسروں پر جارحیت کو نظر انداز کر رہے تھے۔ کیونکہ طے یہی پایا تھا کہ برادرم نزلہ صاحب کو جہاں کوئی عضو ضعیف نظر آئے وہ اس پر گرنا چاہیں تو گر جائیں' انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا بس وہ اتنا خیال رکھیں کہ ہم سے سات گھر پرے رہیں۔ اس کے جواب میں ہماری طرف سے خیر سگالی کے طور پر انہیں یہ پیشکش تھی کہ ہم دنیا جہاں کی "بیماریوں" پر اظہار خیال کریں گے مگر قلم کا رخ کبھی ان کی طرف نہیں پھیریں گے۔ اس معاہدے پر ہماری طرف سے پوری دیانت داری کے ساتھ عمل ہو رہا تھا۔ مگر اب گذشتہ روز نزلے زکام نے ہم پر شبخون مار کر اس معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ سو ہمارا مشتعل ہونا ایک فطری چیز ہے۔ لہٰذا اب اگر ایک آدھ جملہ ہماری طرف سے بھی ہو جائے تو موصوف کو پوری وسیع النظری اور فراخدلی سے اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے. بالکل اسی طرح جس طرح اہل ہند اپنے بیرونی "دوستوں" کا کھلے بازوؤں سے "خیر مقدم" کرتے رہے ہیں۔

سو خواتین و حضرات بات دراصل یہ ہے کہ یہ نزلہ زکام ایک انتہائی گھٹیا قسم کی بیماری ہے۔ اس کا حسب نسب بھی مشکوک ہے۔ یہ انتہائی بزدل قبیلے کا فرد ہے کبھی اپنے سے طاقتور پر حملہ آور نہیں ہوتی بلکہ جسے کمزور پاتی ہے اس پر حملہ آور ہو جاتی ہے۔ اور حملے کی صورت بھی وہ نہیں جو مرگی' ہارٹ اٹیک یا گردے کی تکلیف ہے کہ دیکھنے والے کو بھی محسوس ہو کہ واقعی کسی موذی بیماری نے حملہ کیا ہے اور یوں اس کی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں۔ بلکہ اس کی بجائے یہ اپنے ہدف کو بظاہر تروتازہ رکھتی ہے' وہ کھانا بھی کھاتا ہے' چلتا پھرتا بھی ہے۔ اٹھتا بیٹھتا بھی ہے۔ دوست آجائیں تو ہنس بول بھی لیتا ہے۔ مگر ان سب سرگرمیوں کے باوجود وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ نہ لکھ سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے اور نہ سوچ سکتا ہے اور یوں اگر دیکھا جائے تو یہ بیماری خاصی آمرانہ قسم کی خصوصیات کی حامل ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اس کا زوال بھی بہت جلد شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بقول شخصے اس کا اگر علاج کرایا جائے تو ایک ہفتے میں آرام آجاتا ہے اور اگر علاج نہ کرایا جائے تو مریض ساتویں دن ٹھیک ہو جاتا ہے۔

سچ پوچھیں تو اس مرض کو سر پر چڑھانے والے بھی ہمارے طبیب ہی ہیں۔ جو مریض کو اس آمر بیماری کے خلاف سینہ سپر ہونے کی تلقین کی بجائے اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مشورے دیتے ہیں۔ ان طبیبوں کی

منطق یہ ہے کہ یہ مرض گرد وغبار کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا مریض کو چاہئے کہ وہ فوراً گھر میں محبوس ہو کر رہ جائے اور "تا حکم ثانی" سڑکوں پر نہ نکلے یہ طبیب حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ مریض کو اس مرض کے دوران آرام کرانا چاہئے۔ چنانچہ وہ خواب آور گولیاں مریض کو کھلا دیتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ جاگتے ہوئے بھی غنودگی کی کیفیت میں رہتا ہے اور یوں کسی کام کا نہیں رہتا۔ ہمارے طبیب اس مرض کے دوران مریض کو سوچنے سمجھنے اور لکھنے پڑھنے کے کام سے بھی روکتے ہیں اور مریض بیچارہ ان تمام احکامات کی تعمیل کرتا ہے۔ جس کے "مثبت نتائج" یہ بر آمد ہوتے ہیں کہ وہ واقعی ٹھیک ہو جاتا ہے مگر یہ ٹھیک ہونا ایسا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

سو اب جبکہ زکام نے ہم پر حملہ کیا ہے اور یوں پر امن بقائے باہمی کے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس ذاتی مسئلے کو قومی مسئلہ بنا کر پیش کریں۔ کیونکہ جو بیشتر قومی مسائل ہمارے سامنے آئے ہیں ان کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی ذاتی مسئلہ ہی ہوتا ہے اور یہ تو ویسے بھی قومی مسئلہ ہے کیونکہ آج کل صرف ہم ہی نہیں پوری کی پوری قوم نزلے زکام کے حملے کی زد میں آئی ہوئی ہے اور اپنے طبیبوں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے گھروں میں محبوس ہے خواب آور گولیاں کھا رہی ہے۔ غنودگی کی کیفیت میں ہے اور لکھنے پڑھنے سوچنے سمجھنے سے توبہ تلہ کر چکی ہے چنانچہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم مرض ہی کے نہیں 'ان طبیبوں کے خلاف بھی صف آرا ہوں۔ جو اس مرض کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں ہم ذاتی طور پر کسی قسم کے تعاون سے معذور ہیں کیونکہ ہم ان دنوں ذرا بیمار شمار ہیں۔ البتہ ہماری دعائیں اور تمام نیک خواہشات عوام کے ساتھ ہیں اس کے علاوہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جب مریض اپنے مرض سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خوشی میں جلوس نکالیں گے۔ ہم اس جلوس کی قیادت کریں گے اور اس سلسلے میں کسی قسم کے گرد وغبار کو بھی خاطر میں نہیں لائیں گے۔

۱۴ جنوری ۱۹۸۳ء

لو بلڈ پریشر

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کیسی کیسی نعمتیں پیدا کی ہیں ' جن میں سے ایک لو بلڈ پریشر بھی ہے ' ہم خود اس نعمت سے بہرہ ور ہیں چنانچہ ایک عرصے سے ہمارا بلڈ پریشر سو سے اوپر نہیں گیا ' جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ڈاکٹروں نے تنگ آ کر اسے نارمل قرار دے دیا ہے۔ لو بلڈ پریشر کو ہم نے اگر نعمتوں میں شمار کیا ہے تو ایسے ہی نہیں کیا ' بلکہ ہمارے پاس اس کی واضح وجوہ ہیں ' مثلاً یہ وہ "مرض" ہے ' جس میں مریض کے کھانے پینے پر نہ صرف یہ کہ کوئی پابندی نہیں ' بلکہ مرغ مسلم ' کڑاہی گوشت ' یخنی ' پلاؤ کباب ' نہاری ' پائے اور اس نوع کی دوسری چیزیں "مریض" کے لئے خاصی مفید سمجھی جاتی ہیں ' آپ یوں سمجھئے کہ ایک لو بلڈ پریشر کے مریض کو اگر دن میں دوائی تین خوراکیں لینا ہیں ' تو ان میں سے صبح کی "خوراک" نہاری یا پائے ' دوپہر کی "خوراک" پلاؤ کباب اور شام کی "خوراک" مرغ مسلم یا کڑاہی گوشت ہو سکتی ہے۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

لو بلڈ پریشر کا "مریض" نمک زیادہ سے زیادہ استعمال کرتا ہے اور اسے حلال کم سے کم کرتا ہے ' کیونکہ وہ حسن اتفاق سے ست الوجود بھی ہے یعنی وہ اگر نمک پوری طرح حلال بھی کرنا چاہے تو جسمانی طور پر اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا لو بلڈ پریشر والوں کے مقابلے میں ہم نے ہائی بلڈ پریشر والوں کو دیکھا ہے کہ اگر انہیں کسی بات پر غصہ آ جائے تو ان کا بلڈ پریشر مزید ہائی ہو جاتا ہے۔ جبکہ لو بلڈ پریشر والوں کے لئے غصہ بھی مفید ہے کہ اسی بہانے بلڈ پریشر کچھ ہائی تو ہوتا ہے!

لو بلڈ پریشر والوں پر اللہ تعالیٰ کے جتنے احسانات ہیں ' اگر ہم گنوانے پر آ جائیں تو دفتر کے دفتر بھر دیں ' تاہم ان میں سے نمایاں ترین احسانات میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کی یادداشت کمزور ہوتی ہے ' اس کا فائدہ تو اس شاعر سے پوچھیں جس نے۔

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

والا شعر کہا تھا۔ علاوہ ازیں لو بلڈ پریشر والے شخص کے جسم میں چونکہ خون کی سرکولیشن پوری طرح نہیں ہوتی اور سر اور آنکھیں بھی جسم کا حصہ ہیں۔ لہٰذا اس سے یہ استخراج کیا جا سکتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں خون نہیں اترتا ' ذرا مناسب لفظوں میں یہ بات ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اس میں جھوٹی غیرت نہیں ہوتی کہ یونہی بات

بات پر آنکھوں میں خون اتر آئے۔ لوبلڈ پریشر والے پر ہر وقت غنودگی کی کیفیت بھی طاری رہتی ہے اور یوں وہ بغیر کسی مہلک نشے کے۔

بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

والی کیفیت کے مزے لوٹتا ہے' اسی طرح وہ یکسوئی یعنی " کنسنٹریشن " کے عذاب سے بھی محفوظ ہوتا ہے یعنی یہ نہیں کہ وہ ہر کام جان جوکھوں میں ڈال کر کرے اور یوں ایک ہی دھن میں مگن رہے بلکہ اس کے برعکس یہ بندہ آزاد ضروری سے ضروری کام سے دامن جھٹک کر کسی دیوار کے سائے تلے جا کر بیٹھ سکتا ہے۔

ہو گا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر

کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اس شعر اور اس نوع کے دوسرے شعروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر تقی میر بھی لوبلڈ پریشر کے مریض تھے۔ تاہم ہمارے نزدیک لوبلڈ پریشر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر خون دینے کا وقت آئے لوبلڈ پریشر والوں کے پاس خون نہ دینے کا طبی جواز ہوتا ہے' چنانچہ ان دودھ پینے والے عاشقوں کو خون دینے کی ضرورت کم ہی پڑتی ہے!

ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ ہم نے اوپر کی سطور میں لوبلڈ پریشر کے فوائد محض ایک ایک فقرے میں بیان کر دیئے ہیں۔ جبکہ ان کی افادیت پوری طرح واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس اجمال کی تفصیل بیان کی جائے۔ مثلاً ہم نے کالم کے آغاز میں بتایا ہے کہ یہ لوگ جو جی چاہے ڈٹ کر کھا سکتے ہیں اور یوں ان کی پوری زندگی۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

کی عملی تفسیر بن جاتی ہے' یہ لوگ ہمارے آئیڈیل ہیں کیونکہ۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

والا نظریہ انہی لوگوں کی وجہ سے باطل ٹھہرتا ہے۔ اسی طرح نمک کھا کر پوری محنت سے اسے "حلال" کرنے کے وتیرے سے اگرچہ لوگوں میں واہ واہ تو ہو جاتی ہے مگر اس زندگی میں کامیاب ہم نے انہی کو دیکھا ہے جو نمک ہر حکومت کا کھاتے ہیں' مگر حلال کسی کا نہیں کرتے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی کامیابی کا اندازہ لگانا ہو تو قیام پاکستان سے لے کر اب تک وجود میں آنے والی حکومتوں کے ارباب اختیار پر نظر ڈالیں' ان کی ایک معقول تعداد سابقہ حکومتوں کے نمک خوروں پر مشتمل ہو گی۔ ایک دفعہ ایک وزیر خزانہ صاحب کا ہم نے بیان پڑھا کہ سابقہ حکومتوں کی غلط معاشی پالیسیوں کی وجہ سے ملک اس حال کو پہنچا ہے حالانکہ سابقہ تمام حکومتوں کی معاشی پالیسیاں خود انہی وزیر خزانہ صاحب نے بنائی تھیں' اور یہ جو بلڈ پریشر والوں کو غصہ کم آتا ہے یا اصولاً کم آنا چاہئے تو اس سے مفید چیز تو اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے ملک اجڑتا دیکھیں اور اس پر ذرا بھی غصہ نہ آئے' تو اس سے ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں' چنانچہ متواتر آٹھ آٹھ دس دس سال جنہوں نے حکومت کی ہے' ایسے ہی نہیں

کی 'بلکہ ملک دشمنوں کے ساتھ ان کی نرم خوئی نے بھی ان کے اقتدار کو استحکام بخشا ہے اور جہاں تک یادداشت کی کمزوری کا تعلق ہے 'اس کا فائدہ ہم سے کیا پوچھتے ہیں ' راہنماؤں سے پوچھیں جن کی ساری رہنمائی عوام کی کمزور یادداشت پہ قائم ودائم ہے۔ بلکہ کمزور یادداشت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ سقوط ڈھاکہ کا سانحہ بھی ہمیں یاد نہیں رہا۔ ہمیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہمارے نوے ہزار فوجیوں نے بھارت کی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ اگر یہ سب کچھ ہمیں یاد رہ جاتا تو آج ہم بڑے بڑے بنگلوں میں رہنے کی بجائے خندقوں میں رہ رہے ہوتے اور یوں اس چندروزہ زندگی کا مزا کرکرا کر بیٹھتے۔ لو بلڈ پریشر کے فوائد میں سے ایک فائدہ ہم نے یہ بھی گنوایا تھا کہ خون کی گردش "سلو" ہونے کی وجہ سے بات بات پر آنکھوں میں خون بھی نہیں اترتا۔ دوسرے لفظوں میں انسان جھوٹی غیرت کا اسیر ہو کر نہیں رہ جاتا 'اب اس کا فائدہ ہم بتلاتے کچھ اچھے نہیں لگتے کیونکہ شرم کرنے والوں کے بارے میں تو بزرگوں نے بھی۔

جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم

والی بات کہی ہے۔ اور آخر میں اس "مرض" کا ایک فائدہ ہم نے یہ بتایا تھا کہ بوقت ضرورت اگر خون کا عطیہ دینا پڑے تو بلڈ پریشر والے کے پاس اس سلسلے میں ہزار عذر ہوتے ہیں اور ظاہر ہے اس صورت میں وہ فائدے ہی میں رہتا ہے کیونکہ ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک جن لوگوں نے ہمارے لئے اپنا خون بہایا ہے 'ہم نے انہیں کون سا یاد رکھا ہے کہ خون نہ دینے والوں کو طعنے ماریں؟

اوپر کی سطور میں ہم نے لو بلڈ پریشر کے صرف فوائد گنوائے ہیں۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے بلکہ صحافتی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے نقصانات پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ مثلاً اس مرض میں آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے 'یعنی دنیا اندھیر نظر آنے لگتی ہے 'چکر آتے ہیں 'کمزوری محسوس ہوتی ہے 'دل ڈوبتا ہے اور بسا اوقات انسان بے ہوش بھی ہو جاتا ہے 'تاہم اصل مسئلہ یہ نہیں جو ہم اس کالم میں زیر بحث لانا چاہتے ہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ لو بلڈ پریشر اب افراد تک محدود نہیں رہا بلکہ اداروں کو بھی لو بلڈ پریشر ہو گیا ہے جن میں انصاف اور احتساب تک کے ادارے شامل ہیں ایک صوفی کا کہنا ہے کہ خوف زدہ شخص کھاتا بہت ہے 'ہنستا بہت ہے زنا بہت کرتا ہے لوگوں کی یہ خوفزدگی لو بلڈ پریشر کی وجہ سے ہے 'جس کے نتیجے میں ہم تمام تر خطرات کے باوجود کھاتے بہت ہیں 'عیش بہت کرتے ہیں اور ہنستے بہت ہیں۔ ممکن ہے ہم لوگ من حیث القوم لو بلڈ پریشر کا شکار ہو چکے ہوں کہ ہمارے پاس ایک ماضی تھا اور اب وہ بھی ہماری یادداشت میں محفوظ نہیں رہا!

پھوپھی امیر علی

لاہور کے بارہ ہیجڑوں نے جن کے سربراہ پھوپھی امیر علی عرف نیلوفر ہیں' حکومت پاکستان سے اپیل کی ہے کہ انہیں شہزادی ڈیانا کے نومولود بچے کی خوشی میں لندن بھجوایا جائے تاکہ وہ خیر سگالی کے جذبے کے تحت اور اس خوشی کے موقع پر وہاں شہزادی ڈیانا اور پرنس چارلس کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کر سکیں۔ پھوپھی امیر علی عرف نیلوفر نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ہیجڑوں کے اس بارہ رکنی ثقافتی طائفے کے دورہ انگلستان سے دونوں ملکوں کے درمیان خیر سگالی کے جذبات میں اضافہ ہو گا پھوپھی امیر علی نے بتایا ہے کہ اگر انہیں لندن بھجوانے کا انتظام کیا گیا تو شاہی خاندان کے سامنے پنجابی اور اردو کے معروف فلمی گانوں کے علاوہ انگریزی ماہئے اور ٹپے بھی پیش کریں گے ان کا مخصوص رقص شاہی خاندان کے لئے بالکل نئی چیز ہو گی۔ چنانچہ وہ بیلے ڈانس اور بیلی ڈانس دونوں کو بھول جائیں گے۔

یہ خبر ہم نے جب سے پڑھی ہے' ہمیں رہ رہ کر اپنے ایک ڈاکٹر دوست یاد آ رہے ہیں' وہ اگر آج پاکستان میں اسی منصب جلیلہ پر فائز ہوتے جس پر وہ ایک عرصے تک فائز رہے ہیں' تو آج پھوپھی امیر علی عرف نیلوفر کی یہ اپیل یوں رائیگاں نہ جاتی کیونکہ ڈاکٹر صاحب قبلہ خالی خولی سیاست دان ہی نہیں اعلیٰ درجے کے دانشور بھی تھے اور وہ عوامی فنون لطیفہ کے بہت بڑے داعی اور سرپرست بھی تھے۔ اسی طرح پنجاب کے ایک سابق وزیر اعلیٰ بھی اگر آج پاکستان میں ہوتے اور کچھ کرنے کے قابل ہوتے' تو پھوپھی امیر علی کے لئے ضرور کچھ کرتے' لیکن یہ پھوپھی عرف نیلوفر کی بدقسمتی ہے کہ جن صاحبان اقتدار سے انہیں اگر اور کچھ نہیں "مورل سپورٹ" مل سکتی تھی' وہ آج اقتدار میں نہیں ہیں اور جو آج اقتدار میں ہیں ان کے آگے پیچھے کئی پھوپھی امیر علی پھرتے ہیں کہ ان سے کوئی خدمت لی جائے چنانچہ ان کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں مگر ظاہر ہے سب کو تو ایڈجسٹ نہیں کیا جا سکتا باقیوں کے جذبہ خلوص کو تو صرف سراہا ہی جا سکتا ہے۔

ویسے پھوپھی امیر علی عرف نیلوفر نے حکومت سے جو فرمائش کی ہے اس سے ہم اصولی طور پر متفق ہیں ان کے مطالبے کو ہم نے "فرمائش" اس لئے کہا ہے کہ ہیجڑے مطالبے نہیں فرمائش ہی کیا کرتے ہیں سو ہم ان کی اس فرمائش کو پورا کرنے کے حق میں ہیں بلکہ اسے قدرے وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں۔ یعنی ہمارا خیال یہ ہے کہ بارہ ہیجڑوں اور ان کے سربراہ پھوپھی امیر علی پر مشتمل جو ثقافتی طائفہ شہزادہ چارلس اور لیڈی ڈیانا کی خوشی میں شرکت کے لئے لندن بھیجا جائے۔ اسے بعد ازاں ایک مستقل طائفے کی صورت دے دی جائے اور اسے اندرون ملک

بھی خوشی وغیرہ کے موقع پر استعمال کیا جائے۔ مثلاً دوسرے ملکوں سے سربراہان مملکت پاکستان آتے رہتے ہیں۔ اس سے قبل پنجاب آرٹس کونسل یا پی آئی اے کا ثقافتی طائفہ ان مہمانوں کے سامنے رقص و سرود کا مظاہرہ کیا کرتا تھا' اب یہ خدمت پھوپھی امیر علی کے طائفے کے سپرد کر دی جائے' اس سے ایک شرعی مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ کیونکہ خواتین کے رقص پر دینی حلقوں کی طرف سے اعتراضات ہوتے رہتے تھے ہیجڑوں کے رقص پر کسی کو اعتراض نہ ہو گا کیونکہ یہ رقص تو گلی گلی اور کوچے کوچے میں ہوتا ہے اور آج سے نہیں برس ہا برس سے ہو رہا ہے۔ دراصل ہیجڑوں کا رقص بے ضرر ہوتا ہے یہ نہ تو جذبات کو مشتعل کرتا ہے اور نہ کسی کو اکساتا ہے' یہ ہیجڑے دیکھا جائے تو مرد ہی ہوتے ہیں بس اتنا ہے کہ انہوں نے اپنی بچی کھچی مردانگی چھپانے کے لئے رگڑ رگڑ کر شیو کیا ہوتا ہے چہرہ پر غازہ اور ہونٹوں پر سرخی ملی ہوتی ہے سو یہ اگر رقص کریں گے بھی تو کیا کریں گے کولہے مٹکائیں گے بھی تو کیا مٹکائیں گے ٹھمکا لگائیں گے بھی تو کیا لگائیں گے اور اگر ہلائیں گے بھی تو کیا ہلائیں گے' سوان کا رقص کسی کو مشتعل نہیں کرتا اگر مشتعل کرتا ہے تو صرف اس تھوڑی بہت جمالیاتی حس کو جو ہر انسان میں موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا پھوپھی امیر علی کا ثقافتی طائفہ ایک بے ضرر ثقافتی طائفہ ہو گا اس کے ارکان تو مجلس شوریٰ کے ارکان کے سامنے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کر سکتے ہیں بلکہ ہماری تجویز تو یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کے افتتاحی یا اختتامی اجلاسوں میں ارکان کی تفریح طبع کے لئے پھوپھی امیر علی کو بھی "دعوت سخن" دی جائے جہاں وہ پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر

میں پچھ پتا سے ونڈاں
اج قیدی کر لیا ماہی نوں

کے بول پر اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔

اور آخر میں صرف ایک گزارش ہمیں یہ کرنی ہے کہ اگر پھوپھی امیر علی کی فرمائش پوری کر دی جائے اور یوں انہیں شہزادہ چارلس اور لیڈی ڈیانا کی خوشی میں شرکت کے لئے لندن بھیجنے کا فیصلہ ہو جائے' تو وہ واپسی پر اپنے ثقافتی طائفے سمیت عرب ملکوں کا بھی ایک خیر سگالی دورہ کریں جو اس وقت اسرائیل کے خلاف حالت جنگ میں ہیں جنھوں نے اپنے پیٹرول کی ساری دولت اپنے فلسطینی بھائیوں پر نچھاور کر دی ہے اور اب وہ محلوں کے بجائے خیموں میں رہ رہے ہیں اور جن کے ہاتھوں پر "شکروں" کی بجائے بندوقیں ہیں۔ بس پھوپھی امیر علی وہاں جائیں اور پاؤں میں گھنگرو باندھ کر انہیں ان کی غیرت ملی پر مبارک باد دیں۔

۲۸ جون ۱۹۸۲ء

مجلسِ شوریٰ

مجلس شوریٰ کا اعلان ہوتے ہم نے دیکھا اور سنا بھی ہے اور اخباروں میں پڑھا بھی ہے، تاہم ہمیں سب سے زیادہ دلچسپی اپنے بزرگ اور ملک کے ممتاز صحافی جناب م ش کی ذات گرامی سے تھی اور سوچ رہے تھے کہ اگر وہ مجلس شوریٰ میں آ گئے تو مجلس شوریٰ کو چار چاند لگ جائیں گے۔ اور اگر وہ نہ آئے تو بھی وہ مجلس شوریٰ ہیں، کیونکہ ان کا قلمی نام یعنی م۔ ش اپنے طور پر "مجلس شوریٰ" کا مخفف ہے، چنانچہ اب جب کہ انہوں نے مجلس شوریٰ کی رکنیت قبول کر لی ہے، ہمیں خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں اخبارات مستقل طور پر "مجلس شوریٰ" کو اس کے مخفف سے نہ پکارنے لگیں۔ یعنی کہیں اس طرح کی سرخیاں نہ شائع ہونے لگیں کہ "م۔ ش کا اجلاس بلا لیا گیا" یا "م۔ ش کی ناکامی" کیونکہ اس صورت میں ایک خدشہ تو یہ بھی ہے کہ اگر خدانخواستہ جناب م۔ ش کی علالت" کے عنوان سے کوئی خبر شائع ہوتی ہے تو یار لوگ اسے "مجلس شوریٰ" کی علالت سمجھ بیٹھیں گے اور یوں قیاس آرائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا تاہم یہ سب "فروعی" قسم کے خدشات ہیں، خدشہ تو ہمیں یہ ہے کہ آج کے بعد یار لوگ "م۔ ش کی ڈائری" کو کہیں "مجلس شوریٰ کی ڈائری" نہ سمجھنا شروع کر دیں اور ظاہر ہے اس صورت میں میاں صاحب کو بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ اپنی ڈائری کا نام تبدیل کرنا پڑے گا۔

لیکن یہ سطور لکھتے ہوئے ہمیں اچانک خیال آیا کہ مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لئے تو بعض دیگر اکابر کو بھی نامزد کیا گیا ہے، مگر ہم یہ کالم یونہی اپنے میاں صاحب تک محدود رکھ رہے ہیں۔ تاہم بات یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کے بیشتر دیگر ارکان سے نہ ہمارے نیاز مندانہ تعلقات ہیں اور نہ ان سے بے تکلفی ہے۔ البتہ کچھ ارکان ایسے ہیں، جو ماضی میں بھرپور طور پر اپوزیشن کا رول ادا کرتے رہے ہیں لیکن ان سے ہمارا تعارف غائبانہ ہے۔ تاہم اس حوالے سے ہمارے دل میں ان کے لئے احترام کے جذبات ضرور پائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ نامزد شدہ مجلس شوریٰ بڑی خوش قسمت ہے۔ بالکل ہمارے اس دوست کی طرح جس نے ایک مطلقہ خاتون سے شادی کی تھی اور شادی کے پہلے ہی روز تین پلے پلائے بیٹوں کے باپ بن گئے تھے چنانچہ اس مجلس شوریٰ کو بھی اپوزیشن کے سلسلے میں کسی تردد کی ضرورت نہیں، کیونکہ اسے پہلے ہی روز ساری عمر اپوزیشن میں گزارنے والی بعض قابل احترام شخصیتیں مل گئی ہیں، سو اب تو صرف فرائض کی تقسیم باقی ہے، یعنی صرف یہ طے ہونا ہے کہ قومی اسمبلی کے ہال میں ۳۵۰ ارکان میں سے حزب اختلاف کا رول کسے ادا کرنا ہے اور حزب اقتدار کا کسے، تاکہ "صحت مند" مخالفت اور "صحت مند" موافقت کی قابل رشک مثالیں قائم ہو سکیں!

ہاں ایک مسئلہ البتہ ایسا ہے' جسے حل طلب قرار دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ نامزد شدہ مجلس شوریٰ میں ایک خاصی معقول تعداد ایسے ارکان کی بھی ہے جن کی سیاسی وابستگیاں کالعدم پیپلز پارٹی کے ساتھ رہی ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہونے والے بعض امیدوار بیک وقت مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہو گئے ہیں' سو اللہ جانے کیا ہو گا آگے؟ یعنی یہ دوست قومی اسمبلی کے ہال میں ایک دوسرے کے متحارب گروہ کے طور پر کام کریں گے یا نوشیروان عادل کے زمانے کی یاد تازہ کرنے کے لئے شیر بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے نظر آئیں گے؟ کچھ اسی طرح کی چھوٹی موٹی پیچیدگیاں اور بھی ہیں' مجلس شوریٰ کے ارکان کی فہرست میں ایک تعداد ایسے ناموں پر بھی مشتمل ہے' جنہیں ہم گذشتہ بیس برس میں ان کے مرنجان مرنج ہونے کے ناتے سے جانتے ہیں' یہ وہ بزرگ ہیں جو ہر دور میں محض خلق خدا کی خدمت کے لئے حزب اقتدار کی صفوں میں بیٹھے رہے ہیں' ان کے ضمن میں پیچیدگی صرف یہ ہے کہ احسان فراموش خلق خدا کہیں ان کی خدمات فراموش نہ کر بیٹھی ہو اور یوں وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہی ہو کہ یہ کون لوگ ہیں؟

اور ایک مسئلہ تو ہم بھول ہی چلے تھے' لیکن ہمیں یاد آیا یہ مسئلہ نہیں' یہ تو تجویز ہے اور تجویز یہ ہے کہ جب مجلس شوریٰ کے معزز ارکان شوریٰ کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لئے قومی اسمبلی کے ہال میں داخل ہوں تو ان کی جیبوں کی تلاشی لی جائے خدانخواستہ اس تجویز سے کسی معزز رکن کی دلآزاری مقصود نہیں بلکہ اس خدشے کا اظہار ہے کہ ان میں سے اکثر ارکان کی جیب میں سے ایک کاغذ برآمد ہو گا۔ جس میں مجلس شوریٰ کا رکن بننے کے فیصلے کی وضاحت ہو گی کہ ملک و قوم کے مفاد کے لئے یہ فیصلہ کس قدر ضروری تھا؟ اس کے بعد مجلس سے مستعفی ہونے کا اعلان ہو گا اور پھر اس امر کی وضاحت کہ ان کا مستعفی ہونا ملک و قوم کے مفاد کے لئے کس قدر ضروری تھا؟ اس بیان کے نیچے کوئی تاریخ درج نہ ہو گی۔ کیونکہ یہ تاریخ کسی مناسب وقت پر ڈالی جائے گی بس جن ارکان کی جیبوں سے اس قسم کے "رقعے" برآمد ہوں' ہماری تجویز یہ ہے کہ ان کے درجات فوری طور پر بلند کر کے انہیں وزیر وغیرہ بنا دیا جائے' کہ یہی وہ ذہین لوگ ہیں جو ملک و قوم کے لئے واقعی ایک قیمتی اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ کس وقت ایک دروازے سے داخل ہونا ملک و قوم کے مفاد میں اور کس وقت دوسرے دروازے سے باہر نکل جانا ملک و قوم کے مزید مفاد میں ہوتا ہے۔

نکاح نامہ اور پستول

رات کو ساڑھے گیارہ بجے دروازے پر گھنٹی ہوئی۔ میں اٹھ کر دروازے تک گیا اور دروازہ کھولے بغیر اندر سے بآوازِ بلند پوچھا "کون ہے؟"

"میں زیدی ہوں!" باہر سے آواز آئی۔

"زیدی کون؟" میں نے شہریوں کی جان و مال کی محافظ پولیس کی کارکردگی پر عملی طور پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ایک بار پھر دروازہ کھولے بغیر اندر ہی سے پوچھا۔

"میں حسن جعفر زیدی ہوں!" باہر سے آواز آئی۔

حسن جعفر زیدی میرا ہمسایہ ہے بلکہ بہت ہی ہمسایہ ہے۔ یعنی اتنا قریبی کہ میرے اور اس کے گھر کی دیوار سانجھی ہے اور بوقت ضرورت اپنے اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے ہم کلام ہوا جا سکتا ہے۔

میں دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اندھیرے میں مجھے زیدی کے علاوہ دو مدھم سی شکلیں اور نظر آئیں۔ ان میں سے ایک پولیس اہلکار تھا اور دوسری کوئی خاتون تھی۔ میرے لئے یہ صورت حال پریشان کن تھی۔ چنانچہ میرے دماغ میں اندیشہ ہائے دور دراز پرورش پانے لگے۔ میں ذرا آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ وہ خاتون در نجف زیدی یعنی حسن جعفر زیدی کی بیوی تھیں۔ ان میاں بیوی کے ساتھ پولیس کے دو اہلکار تھے جن میں سے ایک غالباً اے ایس آئی اور دوسرا کانسٹیبل تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس عجیب و غریب صورت حال کا معمہ حل کرنے کے لئے زیدی سے پوچھا

"میں معافی چاہتا ہوں، اس وقت تمہیں زحمت دی" زیدی نے کہا "مگر یہ ناگزیر تھا، کیونکہ تم نے شہادت دینی ہے کہ یہ خاتون جو میرے ساتھ ہے، میری بیوی ہے۔ ہم مارکیٹ تک آئس کریم کھانے گئے تھے، پولیس ہمیں وہاں سے پکڑ لائی ہے۔ انہیں یقین ہے کہ ہم میاں بیوی نہیں ہیں، کیونکہ ہماری جیب میں نکاح نامہ نہیں ہے"

یہ صورت حال بڑی شرمناک تھی۔ میں نے ایک نظر زیدی کو دیکھا جس کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے شدید آثار تھے۔ بھابھی کو جو بہت پریشان نظر آ رہی تھیں، اے ایس آئی کو جس کے چہرے پر شانتی ہی شانتی تھی، اور پھر قدرے تلخ لہجے میں اے ایس آئی کو مخاطب کیا اور کہا "آپ کمال کرتے ہیں پنجاب پولیس کی اگر کوئی نیک نامی ہے تو وہ یہ کہ وہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہے۔ اور آپ میاں بیوی کو نہیں پہچان سکتے" اس پر اے ایس آئی نے

آگے بڑھ کر کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور کہا "جناب آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کے ریڈیو کالم بہت شوق سے سنتا ہوں۔ انہوں نے آپ کا حوالہ دیا تو میں نے سوچا کہ اس بہانے آپ کی زیارت ہو جائے گی۔ جی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" اس المیہ صورت میں اس مزاحیہ صورتحال نے اندر سے مجھے کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کیا۔ مگر میں نے چہرے پر سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا "جناب آپ کی اس محبت کا بہت بہت شکریہ۔ مگر آپ نے ان میاں بیوی کو جو اتنا پریشان کیا ہے' اس کا حساب کس کے ذمے ہے۔ آپ کو شہریوں کے ساتھ ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرنا چاہئے!" اس کے جواب میں اے ایس آئی صاحب نے ایک بار پھر شرف ملاقات پر اظہار مسرت کیا اور کہا "جناب! اسی بہانے آپ کی زیارت نصیب ہو گئی۔ ورنہ یہ موقع کہاں ملتا تھا آپ کبھی تھانے تشریف لائیں آپ سے ملاقات کر کے بہت خوشی ہوئی!" اور پھر وہ مجھ سے بہت عقیدت مندانہ مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا! اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہوتے' زیدی کے کاندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے میں نے مصنوعی خوش دلی سے کہا "تم اگر آئندہ بھی سال میں ایک بار بیوی کو آئس کریم کھلانے لے جاؤ گے تو پولیس والے تمہیں پکڑ لیں گے یہ کام زیادہ کثرت سے کیا کرو تاکہ پولیس والے تمہیں پہچان جائیں!"

اور اس پہچاننے سے مجھے یاد آیا کہ ان پولیس والوں کی نسبت اس ہوٹل کے بیرے کو میاں بیوی کی زیادہ پہچان تھی۔ جہاں ایک بار میں غلطی سے چلا گیا تھا۔ ہوا یوں کہ لبرٹی مارکیٹ میں شاپنگ کرتے کرتے جب ٹانگیں دکھنے لگیں تو میں نے بیوی سے کہا کہ چلو کہیں بیٹھ کر ایک کپ پیتے ہیں اور پھر ہم برابر ہی میں واقع ایک زیر زمین ریستوران میں داخل ہو گئے نیچے اتر کر میں نے محسوس کیا کہ ہم ایک مشکوک سے ریستوران میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے' جن کے اندر صوفے بچھے تھے اور جن کے سلائڈنگ ڈور بند ہونے میں بھی وقت لیتے تھے اور انہیں کھولنے کے لئے بھی خاصی طاقت اور وقت صرف ہوتا تھا۔ میں نے چائے اور دو سموسوں کا آرڈر دیا اور جب بیرا بل لے کر آیا تو میرا شک یقین میں بدل گیا کہ ہم غلط جگہ آ گئے ہیں۔ کیونکہ بل ستائیس روپے تھا۔ اس پر میں نے بیرے سے کچھ نہیں کہا' سوائے اس کے کہ اپنی خاتون خانہ کی طرف اشارہ کیا کہ اور کہا "یہ میری بیوی ہے!" بیرے نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس نے بھی سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا کہ "بہت اچھا صاحب! ابھی آتا ہوں" اور پھر جب وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں صرف سات روپے کا بل تھا۔

مگر بات تو ان پولیس والوں کی ہو رہی تھی جو آج کل راہ چلتے لوگوں سے ان کے نکاح نامے طلب کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی جیب میں اپنے نکاح نامے لے کر نہیں پھرتے' انہیں تھانے لے جاتے ہیں چنانچہ ہماری پولیس کسی اور معاملے میں فرض شناس ہو یا نہ ہو' اس معاملے بہت فرض شناس واقع ہوئی ہے۔ ان دنوں ڈاکے' قتل اور رہزنی کی جو وارداتیں اس کثرت سے ہو رہی ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ پولیس کو اپنی اس تازہ ڈیوٹی سے فرصت نہیں ملتی کہ وہ باقی جرائم کا تدارک کر سکے جس کے ہاتھ میں پستول ہے' وہ بھرے بازار میں کسی کو بھی روک لیتا

ہے اور اسے روکنے والا کوئی نہیں اور جس کے ہاتھ میں پستول نہیں یا جیب میں نکاح نامہ نہیں ' وہ دھر لیا جاتا ہے یہ نکاح نامہ کیا ہے۔ فریقین کی رضامندی کا دستاویزی اور قانونی ثبوت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ جیون ساتھی کے طور پر رہنا چاہتے ہیں۔ مگر ہم نے دیکھا ہے کہ جس کے پاس فریقین کی رضامندی کا دستاویزی اور قانونی ثبوت یعنی " نکاح نامہ " نہیں بھی ہے ' اس کے ہاتھ میں اگر پستول ہے ' تو یہی کافی ہے۔ سو انسان کے پاس " نکاح نامے " اور " پستول " میں سے ایک چیز ضرور ہونی چاہئے تاہم ان دنوں پاکستان بلکہ تمام اسلامی ممالک میں " نکاح نامے " سے زیادہ " قانونی " حیثیت پستول کو حاصل ہے۔ چنانچہ ہمارے ایک برسراقتدار دوست کا مشورہ ہے کہ جیب میں پستول ضرور ہونا چاہئے۔ خواہ وہ غیر قانونی ہی کیوں نہ ہو اس کے مقابلے میں " نکاح نامہ " غیر ضروری چیز ہے!

(۵ جون ۱۹۸۳ء)

جنگل کا بادشاہ

ایک اخبار کے بچوں کے صفحے میں جنگل کے بادشاہ یعنی شیر کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو سے انسپائر ہو کر جنگل کے بادشاہ کا ایک انٹرویو ہم نے بھی کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

○ ...... آپ کو جنگل کا بادشاہ کیوں کہتے ہیں؟۔

☆ ...... تم انٹرویو کرنے آئے ہو یا میری بادشاہی کو چیلنج کرنے کے لئے؟ مابدولت کو اس قسم کے سوال بالکل پسند نہیں۔

○ ...... جہاں پناہ آپ یونہی برامان گئے۔ میرا مطلب ہے۔ آپ الیکشن کے ذریعے منتخب ہوئے تھے یا آپ کو اپنی بے پناہ طاقت کی وجہ سے بادشاہ تسلیم کیا گیا ہے؟۔

☆ ...... تم گستاخ بھی ہو اور بے وقوف بھی بادشاہ بھی کبھی الیکشن کے ذریعے منتخب ہوئے ہیں؟۔

○ ...... حضور والا ...... جاپان اور برطانیہ میں اگرچہ بادشاہت موروثی ہے مگر اس کے باوجود .... ؟

☆ ...... بس بس غیر ملکی نظاموں کے حوالے دینے کی ضرورت نہیں۔ ہم جنگل کے بادشاہ ہیں۔ جنگل کے قانون کے حوالے سے بات کرو!۔

○ ...... بندہ معافی کا خواست گار ہے اچھا آپ یہ بتائیے کہ آپ عموماً گھاس کھانے والے جانوروں ہی کا شکار کیوں کرتے ہیں؟۔

☆ ...... ہماری عقل گھاس چر گئی ہے جو ہم گوشت کھانے والے جانوروں کے منہ لگیں؟۔

○ ...... گستاخی معاف گھاس وغیرہ چرنے والے جانوروں میں سے بھی آپ ہاتھی گینڈے اور دریائی گھوڑے وغیرہ سے ذرا پرے پرے رہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟۔

☆ ...... اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے سے بڑوں کا احترام کرتے ہیں۔ خصوصاً بزرگوار م گینڈے کے لئے تو ہمارے دل میں بہت احترام ہے لگتا ہے تم نے کبھی گینڈا نہیں دیکھا۔

○ ...... دیکھا ہے جناب تبھی تو یہ سوال کیا تھا آپ سے ایک سوال یہ بھی پوچھنے کی جسارت کروں گا۔ لیکن لیکن اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں؟۔

☆ ...... تمہاری جان بخشی کی جاتی ہے۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے؟۔

○ ...... حضور کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے بیس گھنٹے تو آپ سوئے رہتے ہیں۔ تو

کیا اس سے نظام حکومت میں کوئی خلل نہیں پڑتا؟۔

☆......مابدولت کا خیال ہے کہ جو سوال تم کرنا چاہتے تھے وہ یہ نہیں ہے۔ اصل بات پوچھو جو پوچھنا چاہتے تھے؟۔

○......میں آپ کی اس بندہ پروری کے لئے ممنون ہوں۔ حضور مجھے پوچھنا تھا کہ آپ اس طرح بے دھڑک ہو کر سوتے کس طرح ہیں کیا آپ کو تختہ الٹ جانے کا خطرہ نہیں ہوتا؟۔

☆...... خطرہ کیسے ہو سکتا ہے جنگل میں ہم سب شیر اپنا اپنا شکار کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی شکار گاہوں میں دخل نہیں دیتے مابدولت اکیلے جنگل کے بادشاہ نہیں ہم شیروں کا پورا گروہ جنگل کا بادشاہ ہے۔

○......اس کی کیا وجہ ہے کہ جنگل کے سب جانور اکٹھے ہو کر آپ کے خلاف محاذ آراء نہیں ہوتے؟۔

☆...... تم بہت بھولے ہو نوجوان ان میں سے بہت سوں کی روزی ہماری ذات سے وابستہ ہے ہم جب سیر ہو جاتے ہیں تو بچا کھچا شکار ان کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔

○......میں آپ کی فراست سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ اب جہاں پناہ ایک بات یہ بتائیں کہ آپ کا شمار بسیار خوروں میں نہیں ہوتا بلکہ میری معلومات کے مطابق آپ اپنے شکار مثلاً ہرن وغیرہ کا چوتھائی حصہ بھی نہیں کھا پاتے تو اتنی تھوڑی سی خوراک کے لئے آپ نے پورے جنگل کا ناک میں دم کیوں کیا ہوا ہے۔ ؟

☆......تم اگر جنگل کے باسی ہوتے تو ہم تمہیں بتاتے کہ ہمیں دیکھ کر جب جانور ادھر ادھر چھپ جاتے ہیں تو اس وقت کس قدر سرور حاصل ہوتا ہے۔

○......میں حضور کی عالی ظرفی کا مزید قائل ہو گیا ہوں کہ آپ میری جسارت کو نظر انداز کر کے سوالوں کے جواب دے رہے ہیں تو جہاں پناہ جان کی امان پاؤں تو ایک سوال اور عرض کروں؟۔

☆......کرو کرو عرض کرو۔

○...... حضور میں نے ایک دفعہ جنگل کی ایک فلم دیکھی تھی۔ اس میں حضور کو مختلف جانوروں پر جھپٹتے اور ان جانوروں کو دم دبا کر بھاگتے دکھایا گیا تھا۔

☆......ہاں ہاں ہم نے بھی اس فلم کی تعریف سنی ہے۔

○......مگر سرکار والا اس میں ایک سین یہ بھی تھا کہ آپ ایک بارہ سنگھے کو شکار کے لئے منتخب کرتے ہیں اور پھر جھاڑیوں میں پیٹ کے بل رینگتے ہوئے اچانک حملے کے لئے آپ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتے ہیں اور اس احتیاط کے ساتھ کہ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تک سنائی نہ دے۔ لیکن اچانک بارہ سنگھا خطرے کی بو سونگھ لیتا ہے اور پھر وہ بجائے بھاگنے کے آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے سینگ سیدھے کر کے جوابی حملے کی پوزیشن لے لیتا ہے۔ اس پر آپ ایک نظر اس پر ڈالتے ہیں۔ جیسے اس کے عزم اور ہمت کا اندازہ کر رہے ہوں۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے آپ چپ چاپ دم لپیٹ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟۔

☆......اس کی وجہ صرف یہ ہے نوجوان کہ ہم بہادروں کی قدر کرتے ہیں اور ان سے جھگڑا مول نہیں لیتے خواہ وہ

بارہ سنگھا ہی کیوں نہ ہو۔ بہادروں کے سامنے پسپائی اختیار کرنا بھی کسی بہادر شخص کا ہی کام ہے۔

○ ...... بجا فرمایا آپ نے سوال تو اور بھی ذہن میں بہت تھے۔ مگر اب باقی سوالوں کی ضرورت نہیں رہی آپ کا بہت بہت شکریہ۔

☆ ...... کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں ویسے **احتیاطاً** مابدولت کی ایک **ٹرانسپرنسی** تم اور بنالو ویسے بھی پہلی تصور صحیح پوزیشن میں نہیں تھی۔ مابدولت دھاڑنے کے لئے منہ کھولنے لگے ہیں اور کچھ آئے نہ آئے تصویر میں مابدولت کے جبڑے ضرور آنے چاہئیں۔

☆ ○ ...... تھینک یو سر ....

۲۵ر نومبر ۱۹۸۵ء

قتل کرنے کا صحیح طریقہ

چونکہ ابھی تک بہت سے فریزروں میں قربانی کے دنبے موجود ہیں چنانچہ قریباً بیس پچیس دن گزرنے کے باوجود بی بی سی نے یہ خبر دی ہے کہ برطانیہ میں متعین ایک ایرانی سفارت کار کے عیدالاضحیٰ پر دنبہ قربان کرنے پر جھگڑا ہو گیا ہے۔ اس بارے میں اب برطانوی وزارت خارجہ کو ایک رپورٹ پیش کی جائے گی۔ واقعات کے مطابق ایران کے فرسٹ سیکرٹری سید ابوالقاسم مختاری نے جنوب مغربی لندن میں اپنے گھر کے باہر ایک دنبے کی قربانی دی تھی۔ اس کے پڑوسیوں نے ایک دنبے کو گھسیٹ کر لاتے ہوئے اور پھر ایک نالی کے قریب اس کی گردن پر چھری پھیرتے دیکھ کر پولیس کو مطلع کر دیا۔ جب پولیس وہاں پہنچی تو جناب مختاری نے جو اس وقت تک دنبے کا خون بھی دھو چکے تھے اپنی سفارتی مراعات کو استعمال کرنے کا دعویٰ کیا۔ پولیس کے ایک ترجمان نے کہا کہ اگر یہ سفارت کار نہ ہوتا تو اس کے خلاف جانوروں پر بے رحمی کے قانون کے تحت کارروائی کی جاتی۔

ہم آپ کو بتا نہیں سکتے کہ یہ خبر پڑھ کر برطانیہ جانے کے لئے ہمارے دل میں کس قدر خواہش پیدا ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس سے قبل ہم متعدد بار اس ملک کے دروازے سے لوٹ آئے ہیں۔ اندر جانے کو کبھی جی ہی نہیں چاہا لیکن اب اگر یہ ملک دیکھنے کی خواہش ہم میں بیدار ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہی خبر ہے کیونکہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برطانیہ میں یا تو دنبے اور بکرے وغیرہ ذبح ہی نہیں ہوتے اور اگر ذبح ہوتے بھی ہیں تو اس طرح نہیں ہوتے کہ انہیں گھسیٹ کر لایا جائے اور پھر ایک نالی کے قریب اس کی گردن پر چھری پھیر دی جائے بلکہ وہاں بکرے کو ذبح کرنے سے پہلے اسے اکیس توپوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ اس کے بعد بکرا بھنگڑا ڈالتے ہوئے خوشی سے ذبح ہونے آتا ہے اور وہاں جا کر گردن ایک طرف ڈال کر لیٹ جاتا ہے اور قصائی سے کہتا ہے۔ "گڈ مارننگ سر"

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

مگر قصائی آگے سے "گڈ مارننگ" کہتے ہوئے بکرے سے معذرت کرتا ہے کہ

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار مجھ سے

تاہم بکرے کے بے حد اصرار پر وہ بادل نخواستہ اسے ذبح کرتا ہے اور اس کے بعد شرم اور ندامت کے مارے کئی دنوں تک گھر سے باہر نہیں نکلتا لیکن ہم نے جو یہ مفروضہ ابھی بیان کیا ہے اسے مفروضے کی بجائے حقیقت سمجھنے میں قطعاً دیر نہ لگاتے۔ اگر ہمیں ابھی ابھی یہ یاد نہ آتا کہ جب برطانیہ والے ہندوستان پر حکومت

کرتے تھے تو یہاں وہ مقامی بکروں کو اس طرح ذبح نہیں کرتے تھے، جس طرح ہم نے ابھی بیان کیا ہے بلکہ وہ انہیں گھسیٹتے ہوئے نالی تک لے جاتے تھے اور ان کی گردن پر چھری پھیر دیتے تھے! چنانچہ حقیقت حال وہ نہیں جو ہم نے بیان کی ہے بلکہ حقیقت حال غالباً کچھ اور ہے۔

اور اب اتنے تجاہل عارفانہ سے کام لینے کی بھی ضرورت نہیں جتنے تجاہل عارفانہ سے ہم کام لے رہے ہیں۔ کیونکہ ہم اگر صرف برطانیہ نہیں گئے تو کیا ہوا' ان اہل مغرب کو تو ہم نے بہت قریب سے دیکھا اور پورے دو برس تک دیکھا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اہل مغرب ہم لوگوں کی نسبت بہت زیادہ مہذب ہیں۔ بکرے وہ بھی ذبح کرتے ہیں 'مگر ہماری طرح نہیں بلکہ وہ انہیں آٹومیٹک پلانٹ کے نیچے لٹا دیتے ہیں اور پھر ٹوکے سے ان کی گردن ٹکا ٹک کٹتی چلی جاتی ہے اور یہ قتل کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

سید ابوالقاسم مختاری نے بکرے کو ذبح کیا اور بدنام ہو گئے قتل کرتے تو ان کا چرچا نہ ہوتا۔

اہل مغرب کے مہذب ہونے اور ہم اہل مشرق کے غیر مہذب ہونے کا یہی ایک معیار نہیں جو ہم نے ابھی بیان کیا ہے بلکہ کچھ معیار اس کے علاوہ بھی ہیں نیز اہل مغرب اگر لبرل ہوں گے تو وہ کچھ دیگر معاملات میں ہوں گے۔ ان کے اخلاقی معیار بہر حال بہت سخت ہیں۔ مثلاً وہ جو چار گرہ کپڑا پہن کر بازاروں میں پھرتے ہیں وہ ان کے اخلاقی معیار کے عین مطابق ہے لیکن ان کے نزدیک پاجامہ نہایت فحش لباس ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ امریکہ میں ہم صبح کے وقت ڈبل روٹی لینے کے لئے سلیپنگ سوٹ ہی میں گھر کے سامنے واقع دکان تک چلے گئے تو دکان پر کھڑی بیبیوں اور مردوں نے جس طرح ہم سے پردہ کیا اس سے ہم اتنے نروس ہوئے کہ ڈبل روٹی خریدنا بھول گئے اور مزید ستر پوشی کا اہتمام کرنے کی کوشش کرتے ہوئے واپس گھر کو لوٹے۔ ان کے اخلاقی معیاروں کے مطابق مرد کا مرد سے معانقہ یا ایک مرد کا کسی دوسرے مرد کا ہاتھ تھامنا بھی خاصا معیوب ہے۔ چنانچہ جب ہم نے امریکہ میں اپنے ایک پاکستانی دوست کو دیکھ کر فرط مسرت سے اسے گلے لگایا تو اس کے پسینے چھوٹ گئے اور اس نے جلدی سے خود کو علیحدہ کرتے ہوئے کہا "یار خدا کے لئے پرے ہٹ جاؤ' یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ ایسے کاموں کے لئے یہاں علیحدہ محلے ہیں" چنانچہ ایسے محلوں میں ہم جنسوں کو شادی تک کی اجازت ہے وہ برس ہا برس بطور میاں بیوی رہتے ہیں اور اب تو مغربی حوالے سے ایسی خبریں پڑھیں اور ہمارے چھکے چھوٹ گئے کہ مرد حضرات بھی بچے جنا کریں گے۔ بات دور نکل گئی تاہم فی الحال اہل مغرب کے نزدیک کھلے بندوں مردوں کا ایک دوسرے سے گفتگو کرنا اور ہنسنا وغیرہ بھی خاصا مشکوک فعل ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ہم پاکستانی دوست تھڑوں پر بیٹھ کر گپ شپ لگانے والا کلچرل ٹھرک پورا کرنے کے لئے اپنے دوست کے گھر کے باہر بیٹھے گپیں لگا رہے تھے اور باآواز بلند ہنس رہے تھے کہ سائرن بجاتی ہوئی پولیس وین ہمارے پاس آ کر کھڑی ہو گئی جس میں سے تین چار مستعد پولیس والے بڑی تیزی سے باہر نکلے اور پستول دکھا کر ہم سے ہینڈز اپ کروایا۔ معلوم ہوا کہ سامنے والے گھر میں رہنے

والی ایک بوڑھی عورت نے انہیں فون کیا تھا کہ کچھ "گینگسٹرز" اس کے گھر کے سامنے جمع ہیں اور کوئی واردات کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

ان اہل مغرب کے مہذب اور ہم لوگوں کے غیر مہذب ہونے کی داستان یوں تو ویت نام سے لے کر افغانستان تک پھیلی ہوئی ہے لیکن چونکہ بات اپنے اور ان کے اخلاقی معیاروں کی چھڑ گئی ہے' لہٰذا اسی سلسلہ کی ایک اور "حکایت" ہم بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دفعہ دیار مغرب میں ہمارے ہمسائے میں رہنے والی ایک ادھیڑ عمر خاتون ہمیں پریشان نظر آئی اور جب ہم نے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ پتہ چلا اپنی جوان بیٹی کی وجہ سے سخت پریشان ہے اور پریشانی یہ ہے کہ بیٹی خیر سے بیس بائیس برس کی ہے مگر ہفتے کی دوسری شاموں کے علاوہ فرائی ڈے نائٹ اور سٹرڈے نائٹ بھی گھر پر گزارتی ہے۔ کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ باہر نہیں جاتی 'اس کے فلیٹ میں نہیں جاتی۔ چنانچہ ان سب کاموں کو نارمل سمجھنے والے معاشرے کی اس ادھیڑ عمر خاتون کو اپنی بیٹی کے ابنارمل ہونے پر تشویش تھی اور شاید بجا طور پر تشویش تھی جو ہم نے محض انسانی ہمدردی کے پیش نظر بہر حال دور کرنے کی کوشش کی۔ اور اب اس مہذب معاشرے کے بارے میں چلتے چلتے ایک چھوٹا سا واقعہ اور۔ جب فریزر اور محمد علی کے درمیان باکسنگ کا مقابلہ ہونے والا تھا تو امریکہ کے بیشتر سفید فاموں کی ہمدردیاں فریزیر کے ساتھ تھیں۔ کیونکہ فریزیر صرف کالا تھا جبکہ محمد علی کالا بھی تھا اور مسلمان بھی اور یوں امریکیوں کے نزدیک یہ وہ کریلا تھا جو نیم چڑھا بھی تھا۔ میں نے ایسے ہی ایک خاتون نینسی سے پوچھا کہ تم محمد علی اور فریزیر میں سے کس کی کامیابی کے لئے دعا گو ہو۔ اس نے کہا میری دعا تو یہ ہے کہ مقابلے کے دوران یہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے جائیں۔

ہمارے خیال میں بات کچھ زیادہ لمبی ہو گئی ہے' حالانکہ ہم تو خود کو سید ابوالقاسم مختاری تک محدود رکھنا چاہتے تھے کیونکہ انہوں نے بکرے کو مشین سے قتل کرنے کی بجائے چھری سے وہ بھی تیز چھری سے ذبح کر کے مہذب یورپ کے اخلاقی معیاروں کو جس بری طرح ٹھیس پہنچائی ہے اس سے معاملہ اتنا سنگین ہو گیا ہے کہ کسی ہلکی پھلکی بات کی گنجائش بہت کم رہ گئی ہے۔ بہر حال مختاری صاحب اس دفعہ تو شاید اپنی سفارتی مراعات کی بدولت بچ گئے لیکن آئندہ انہیں اپنے دینی فرائض کی بجا آوری بھی اہل مغرب کے اصولوں کے مطابق کرنی چاہئے۔ کیونکہ زور آور کی سیاسی ہی نہیں اخلاقی بالادستی بھی ماننا پڑتی ہے چنانچہ مختاری صاحب اس سلسلے میں خود کو خود مختار نہ سمجھیں۔ کیونکہ یہ مصرعہ غالباً مختاری صاحب کا اپنا ہے کہ۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

سو ہمارا مشورہ انہیں یہی ہے کہ آئندہ عید پر انہوں نے اگر بکرا ذبح کرنا ہو تو خود زحمت نہ کریں بلکہ اسے کسی انگریز قصائی کے پاس لے جائیں کہ قتل کرنے کا صحیح طریقہ انہی کو آتا ہے۔ دامن پہ کوئی چھینٹ پڑتی ہے نہ خنجر پہ کوئی داغ آتا ہے۔ اہل مغرب نے تو آج کے انسان کو مشینوں سے قتل کیا ہے اور الٹا مقتول کو ممنون احسان بھی کیا ہے۔ بکرا تو بیچارا پھر بکرا ہے۔

تعزیتی شذرے

مولانا قہر لدھیانوی

حضرت مولانا قہر لدھیانوی گذشتہ ہفتے انتقال کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مولانا اتحاد بین المسلمین کے بہت بڑے علمبردار تھے اور ان کی ساری عمر مسلمانوں کے تمام فرقوں میں رواداری اور اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی تبلیغ میں بسر ہوئی۔ مولانا فروعی مسائل پر بحث مباحثے اور مناظرے کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نئی نسل کو اگر مذہب سے برگشتہ ہونے سے بچانا ہے تو پھر علماء کو دین کی بنیادی چیزوں کو باہمی اتحاد کی بنیاد بنانا ہو گا۔ تاہم دین کے بنیادی اصولوں کے سلسلے میں وہ کسی قسم کے سمجھوتے کے قائل نہیں تھے اور اس ضمن میں ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ چنانچہ اس عظیم مقصد کے لئے وہ کئی مرتبہ جیل بھی گئے' جن میں سے چار مرتبہ تو انہیں دیوبندی' بریلوی تنازعے میں پرجوش کردار ادا کرنے پر جیل جانا پڑا۔ مگر ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ مولانا مرحوم و مغفور نے اسلام کے جن بنیادی مسائل کی تبلیغ و ترویج کو اپنی زندگی کا مشن بنایا' ان میں مسئلہ نور و بشر' رفع یدین اور آمین بالجہر وغیرہ کے مسائل شامل تھے۔ حضرت مولانا نے متعدد تصانیف بھی قلمبند کیں' جن میں امرود در رد مردود' اشکال فی بطن ابطال اور زحمت در مسئلہ تہمت کے علاوہ مسائل طہارت اور فضائل مسواک خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت مولانا قہر لدھیانوی نے تبلیغ اسلام کے سلسلے میں یورپ اور جنوبی افریقہ کے ممالک کے بھی کئی دورے کئے اور جن علاقوں میں مسلمانوں کی کوئی اکا دکا مسجد نظر آتی تھی' حضرت مولانا کی مساعی جمیلہ سے وہاں بیس بیس افراد پر مشتمل مسلمانوں کے علاقوں میں فی کس کے حساب سے بیس علیحدہ علیحدہ مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ مولانا قہر لدھیانوی کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے' وہ عرصہ دراز تک پر نہ ہو سکے گا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

غلیل طوفانی

جناب غلیل طوفانی کی وفات سے پاکستان کے سیاسی حلقوں کو جس بے پناہ صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے وہ اتنا قابل فہم نہیں' کیونکہ غلیل طوفانی کی ساری عمر بنیادی حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد میں بسر ہوئی اور اس کے لئے انہیں کئی مرتبہ جیل بھی جانا پڑا' تاہم انہوں نے جیل کی صعوبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا' کیونکہ مرحوم کے لئے جیل کوئی نئی چیز نہ تھی۔ وہ سیاست کے خارزار میں قدم رکھنے سے پہلے اکثر دیوانی اور

فوجداری مقدمات میں جیل جایا کرتے تھے۔ مرحوم نے جن بنیادی حقوق کے حصول کے لئے عمر بھر جدوجہد کی۔ ان میں ریاست کے خلاف جدوجہد کے حق کو تسلیم کرنا سرفہرست تھا۔ چنانچہ ان کی ہر تقریر ریاست اور بانی ریاست کے خلاف مواد پر مبنی ہوتی تھی، جو اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتی تھی، البتہ اس میں اگر حکومت وقت کے خلاف کوئی بات ہوتی تو اخبارات وہ احتیاطاً حذف کر دیتے۔ مرحوم قیام پاکستان سے پہلے کانگریس سے وابستہ تھے اور یوں وہ دو قومی نظریئے کے سخت خلاف تھے کہ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں نہیں، بلکہ ایک قوم ہیں، تاہم قیام پاکستان کے بعد ان کے نظریات میں بنیادی تبدیلی واقع ہوئی انہوں نے پاکستان میں بسنے والی مسلمان قوم کو ایک نہیں، چار قومیں قرار دینے کا مطالبہ کیا اور یوں ان کی بقیہ عمر چار قومی نظریئے کی ترویج میں بسر ہوئی۔ غلیل طوفانی مرحوم مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کی کارروائی کے خلاف تھے، مگر افغانستان میں روسی فوج کی کارروائی کو حق بجانب قرار دیتے تھے، وہ علاقائیت پر یقین رکھتے تھے یا پھر بین الاقوامیت کے پرچارک تھے اور انہوں نے مرتے دم تک اپنی یہ دونوں حیثیتیں قائم رکھیں۔ جناب غلیل طوفانی کی وفات سے قومی سیاست میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پر ہونا مشکل ہے، کیونکہ ایسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں صرف بوقت ضرورت پیدا ہوتی ہیں۔

جناب اقتدار دائمی

جناب اقتدار دائمی کی وفات سے مقتدر حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی ہے۔ مرحوم کا ایمان تھا کہ اقتدار اعلیٰ صرف خدا کی ذات ہے اور انہیں یہ بھی یقین تھا کہ اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں ودیعت ہوا ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہ نسل در نسل منتقل ہوتا ہوا ان تک پہنچا ہے۔ مرحوم نے اپنی مقتدرانہ زندگی کا آغاز ڈپٹی کمشنری سے کیا اور سارے علاقے میں اپنی دھاک بٹھادی، انہوں نے جوں جوں اقتدار کی منزلیں طے کیں، وہ اس نتیجے پر پہنچتے چلے گئے کہ عوام کا قلع قمع کئے بغیر اقتدار قائم رکھنا ممکن نہیں، تاہم یہ سب کچھ انہی کی فلاح و بہبود کے نام پر ہونا چاہئے۔ سو انہوں نے اپنی اسی پالیسی کے نتیجے میں پاکستان پر مسلسل ۳۷ برس حکومت کی۔ مرحوم ان صاحبان بست و کشاد میں سے نہ تھے، جن کی آنکھیں اقتدار سے چندھیا جاتی ہیں بلکہ وہ اپنے کان، آنکھیں، دل اور دماغ ہمیشہ کھلے رکھتے تھے اور دنیا بھر کے صاحبان بست و کشاد کی ان غلطیوں سے سبق سیکھتے تھے، جن کے نتیجے میں ان زعماء کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یہ ان کی اس احتیاط ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے ان پیشروؤں کی غلطیوں کو نہیں دہرایا بلکہ اس کی جگہ انہوں نے نئی غلطیاں کیں اور بس یہ ذرا سی لغزش ان کے پیشروؤں کی طرح ان کے زوال کا باعث بھی بنی اور یوں اقتدار دائمی، جو شخص نہیں، ادارہ تھے، اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

رفیتہ و لے نہ از دل ما!

۱۴ جولائی ۱۹۸۴ء

غیر مطبوعہ خبریں

ہم اپنے قارئین کو گاہے گاہے بین الاقوامی نوعیت کی نہایت اہم خبریں سناتے رہتے ہیں۔ چنانچہ آج کی ایک تازہ اطلاع کے مطابق برطانیہ کی شہزادی ڈیانا نے اپنا ہیئر سٹائل تبدیل کر لیا ہے۔ اس بات کا انکشاف گذشتہ روز اس وقت ہوا جب وہ اپنی ساس ملکہ الزبتھ کے ساتھ شاہی بگھی میں سوار برطانوی پارلیمینٹ گئیں۔ دریں اثناء شہزادی ڈیانا کے ہیئر ڈریسر نے بتایا ہے کہ اس سٹائل کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں لباس کے مطابق فوری طور پر ۱۰۱ قسم کی تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ اس سے قبل ہم نے قارئین کو دونوں مواقع پر لیڈی ڈیانا کے حاملہ ہونے کی خبر بروقت پہنچائی تھی تاکہ ہمارے قارئین کی معلومات اپ ٹو ڈیٹ رہیں ہم انشاءاللہ آئندہ بھی اس نوع کے اہم بین الاقوامی امور کی رپورٹنگ کے سلسلے میں اپنے قومی فرائض پوری تندہی سے انجام دیں گے۔

تاہم یہ کالم ہم لیڈی ڈیانا کے بدلے ہوئے ہیئر سٹائل کے حوالے سے نہیں بلکہ اپنے قارئین کو ایک نہایت افسوسناک صورتحال کی طرف متوجہ کرنے کے لئے لکھ رہے ہیں اور وہ یہ کہ اگرچہ اخبارات میں ہر قسم کی خبریں سوائے ضروری خبروں کے شائع ہوتی رہتی ہیں مگر اس کے باوجود کچھ خبریں ایسی ہیں جو متعلقہ رپورٹروں کی کم فہمی یا تنگ نظری کی وجہ سے محروم اشاعت رہتی ہیں۔ ہم نے بارہا اس خلا کو پورا کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار خوف فساد خلق سے خاموش رہے۔ مگر اب یہ سوچ کر کہ چونکہ قوموں کی زندگی میں سب سے کٹھن منزل یہی ہوتی ہے کہ وہ آئین نو سے ڈرتی ہیں اور طرز کہن پر اڑتی ہیں، یہ کالم لکھنے کا ارادہ باندھا ہے تاکہ ایک آواز تو ایسی اٹھے جس میں خبروں کے گھسے پٹے اور رجعت پسندانہ اصولوں کے خلاف بغاوت پائی جاتی ہو۔ چنانچہ ہم نے گذشتہ ہفتے کی بعض انتہائی اہم نوعیت کی خبریں اکٹھی کی ہیں اور یہ تاحال بالکل غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ خبریں ہمارا "سکوپ" ہیں چنانچہ ہم انہیں اپنے کالم میں شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ایسی خبروں کی عام اشاعت سے صحافت کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو جائے گا۔ یہ غیر مطبوعہ خبریں درج ذیل ہیں۔

"تمہارے حسن سے کمرہ روشن ہو گیا ہے"
عبدالودود نے کہا "میں ہمیشہ تمہارا رہوں گا"

لاہور (سٹاف رپورٹر) جان من! تمہاری یہ جھکی جھکی نظریں اور حیا سے تمتماتے گال کچھ نہ کہنے کے باوجود

مجھ سے بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ میں تمہارا ہوں اور ہمیشہ تمہارا رہوں گا۔ ان خیالات کا اظہار گذشتہ روز بیاہے جانے والے ایک دولہا عبدالودود نے اپنی دلہن فرناز عبدالودود سے حجلہ عروسی میں کیا۔ ہمارے رپورٹر کے مطابق دولہا عبدالودود نے دلہن فرناز عبدالودود کا گھونگٹ اٹھاتے ہوئے کہا کہ تمہارے حسن کی شعاعوں سے کمرہ روشن ہو گیا ہے اس موقع پر عبدالودود نے ایک شعر بھی پڑھا۔

شب وصال ہے گل کر دوان چراغوں کو

خوشی کی بزم میں کیا کام جلنے والوں کا

ہمارے سٹاف رپورٹر نے اس خبر کی دیگر تفصیلات بھی دی ہیں جو کسی دوسرے موقع پر شائع کی جائیں گی۔

"میں اغوا نہیں فرار ہوئی تھی"
نگہت کی نانی اور دادی بھی بد چلن ہیں

لاہور (سٹاف رپورٹر) گذشتہ دنوں مبینہ طور پر اغوا ہونے والی بارہ سالہ نابالغ لڑکی نگہت نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اغوا نہیں ہوئی بلکہ وہ اپنی مرضی کے ساتھ طاہر ،اظہر ،جلیل ،بگواور مختار کے ساتھ فرار ہوئی ہے کیونکہ وہ ان سے محبت کرتی ہے۔ واضح رہے اس سے قبل ہمارے سٹاف رپورٹر کی یہ خبر شائع ہو چکی ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ ملزم نہایت شریف لوگ ہیں اور انہوں نے لڑکی کو اغوا نہیں کیا بلکہ لڑکی اپنی مرضی کے ساتھ ان سے فرار ہوئی ہے۔ نگہت کے عدالتی بیان سے ہماری اس خبر کی تصدیق ہو گئی ہے۔ ہمارے سٹاف رپورٹر نے خبر کی دیگر تفصیلات بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ نگہت بلدیاتی کونسلر ممتاز کی بہن ہے اس کے باپ کا نام حاجی افتخار ہے اور اس کی تین بہنیں اور بھی ہیں جو سب کی سب بد چلن ہیں۔ نگہت کی پھوپھی اور خالہ بھی بد کار ہیں بلکہ اس کی نانی اور دادی کے متعلق بھی معلوم ہوا ہے کہ جوانی میں ان کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ علاقے کے لوگوں نے پولیس سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ طاہر ،اظہر ،جلیل ،بگواور مختار ایسے شرفاء کو نگہت ایسی لڑکیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے مثبت اقدامات کرے تاکہ آئندہ ایسی لڑکیوں کو کسی کی عزت سے کھیلنے کی جرات نہ ہو۔

"مجھے شلجم گوشت بہت پسند ہے"
نواب مسعود علی خان سے پینل انٹرویو

لاہور (سٹاف رپورٹر) ممتاز سیاسی رہنما نواب مسعود علی خاں کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ گذشتہ شب ان کے ہاں شلجم گوشت پکائے گئے۔ نواب صاحب نے ہمارے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ انہیں شلجم گوشت بہت پسند ہیں اور گھر پر اکثر یہی ڈش بنواتے ہیں۔ گوبھی گوشت کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ گوبھی گوشت بھی رغبت سے کھاتے ہیں تاہم گوبھی بادی ہوتی ہے اس لئے وہ حتی

المقدور اس سے گریز کی کوشش کرتے ہیں۔ نواب صاحب کو ناشتے میں پراٹھا اور فرائی انڈے پسند ہیں تاہم ناشتے کے مینو میں وہ تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ نواب مسعود علی خان نے یہ انکشافات ہمارے فورم کے تحت منعقدہ ایک پینل انٹرویو میں کئے۔ اس پینل انٹرویو کی دیگر چونکا دینے والی تفصیلات جمعہ ایڈیشن میں ملاحظہ فرمائیں۔

یہ چند خبریں تو غیر مطبوعہ تھیں جو ہم نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ اب آخر میں ایک مطبوعہ خبر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ یہ مطبوعہ خبر اس قابل ہے کہ اسے غیر مطبوعہ خبروں میں شامل کیا جائے۔ جس غیر ملکی ایجنسی نے یہ رپورٹ دی ہے وہ ہمارے نصب العین کی حامی ہونے کی وجہ سے ہمارے دلی شکریے کی مستحق ہے۔ خبر ملاحظہ فرمائیں۔

شہزادی ڈیانا کو نزلہ اور زکام ہو گیا
تقریب کے دوران ناک پر مسلسل رومال رہا

لندن (فارن ڈسک) برطانوی شہزادی لیڈی ڈیانا گذشتہ روز لندن کی ایک تقریب میں نزلہ اور زکام کا شکار ہو گئیں۔ یوم شہدا کے سلسلے میں منعقد ہونے والی اس تقریب میں شہزادی ڈیانا نے اپنا رومال مسلسل ناک پر رکھا اور سوں سوں کرتی رہیں۔ بعد ازاں شاہی ترجمان نے بتایا کہ شہزادی نزلہ اور زکام میں مبتلا ہو گئی تھیں تاہم تقریب میں شرکت کے دوران رومال سے بار بار ناک صاف کرنے کی وجہ ان کے جذبات تھے جس کا اظہار انہوں نے سوگوار تقریب کے دوران کیا تھا!۔

۱۸ نومبر ۱۹۸۴ء

"کفر" سے "اسلام" تک

عالم اسلام کو نوید پہنچے کہ ممتاز جرمن سکالر پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اور ان کا نیا نام جمیلہ ہو گا۔ چونکہ انہیں پاکستان سے بھی شدید محبت ہے لہٰذا اب وہ جمیلہ پاکستانی کے نام سے پکاری جائیں گی۔ یہ خبر "نوائے وقت" کے قارئین کو اکیڈمی آف لیٹرز پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل اور سندھی کے ممتاز افسانہ نگار غلام ربانی آگرو کی وساطت سے پڑھنے کو ملی ہے۔ اگرچہ اس خوشخبری کی اشاعت کو آج پانچواں روز ہے مگر اچھی خبر اگر ایک دفعہ سے زیادہ سن لی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ ملت کو اچھی خبریں ملنا بند ہو گئی ہوں۔ چنانچہ اسی لئے قند مکرر کے طور پر ہم نے یہ خبر اپنے کالم میں دوبارہ درج کر دی ہے۔

ہمیں متعدد مرتبہ ڈاکٹر این میری شمل کا لیکچر سننے کا اتفاق ہوا اور ہم ہر مرتبہ حیران ہوئے کہ یہ خاتون اقبال اور سندھ کے صوفی شعرا' تصوف اور خود اسلام سے جتنی گہری واقفیت رکھتی ہیں اور انتہائی متاثر بھی ہیں تو پھر مسلمان کیوں نہیں ہو جاتیں؟ ان کے مسلمان ہو جانے پر اس کی توجیہہ ہمیں یہ سوجھی ہے کہ وہ اسلام سے متاثر تھیں اور مسلمانوں کے بارے میں متفکر تھیں مگر بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ محض مسلمانوں کی موجودہ حالت سے بددل ہو کر اسلام سے منہ نہیں موڑنا چاہئے۔ چنانچہ یہ سوچتے ہی انہوں نے آنکھیں بند کر کے اسلام قبول کر لیا۔

ہم اپنے قارئین کو ڈاکٹر این میری شمل کے بارے میں ایک حیرت انگیز بات بھی بتانا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ محترمہ لیکچر دیتے وقت آنکھیں بند کر لیتی ہیں اور فرض کریں کہ ان کا لیکچر اگر آدھ گھنٹے کا ہے تو وہ گھڑی دیکھے بغیر سیکنڈز کے حساب سے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد لیکچر ختم کر دیتی ہیں، بہر حال اتنی بڑی شخصیت کے مسلمان ہونے سے ضمیر جعفری کی ایک دعا جزوی طور پر قبول ہو گئی ہے۔ انہوں نے دعا مانگی تھی۔

ہمارے مسائل کو آسان کر
الٰہی برزنیف مسلمان کر

برزنیف نے تو خیر کیا مسلمان ہونا تھا۔ ڈاکٹر شمل مسلمان ہو گئی ہیں ویسے بہت عرصہ قبل ایک اور دانشور امریکی خاتون نے بھی اسلام قبول کیا تھا اور اس کا نیا نام بھی جمیلہ ہی تجویز کیا گیا تھا۔ ان کی شادی جماعت اسلامی کے مولانا یوسف سے انجام پائی جس سے مولانا کی انگریزی بہتر ہو گئی۔ بہر حال اب وہ خاتون جمیلہ یوسف کہلاتی ہیں گویا اب ہمارے پاس دو نو مسلم مغربی خواتین ہیں ایک جمیلہ یوسف اور دوسری جمیلہ پاکستانی۔ خبر کے ساتھ ڈاکٹر

شمل کی جو تصویر شائع ہوئی ہے وہ دلہنوں کے لباس میں ہے اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو' ہمیں توڈاکٹر شمل کو اس "گیٹ اپ" میں دیکھ کر بھی خوشی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر شمل کے اسلام قبول کرنے پر ہم اتنے ایکسائٹڈ ہوئے کہ بعض انتہائی اہم اور بنیادی نوعیت کی باتیں ان کہی رہ گئیں۔ دراصل یہ کچھ باتیں تھیں جو ہم ان سے پوچھنا چاہتے تھے۔ مثلاً یہ کہ آپ نے سنی مذہب قبول کیا ہے یا شیعہ مذہب؟ اگر آپ سنی ہوئی ہیں تو دیوبندی' بریلوی اور اہل حدیث میں سے آپ نے خود کو کس فرقے کے ساتھ منسلک کیا ہے؟ کیا آپ رفع یدین کو جائز سمجھتی ہیں' آمین بالجہر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے' حضورؐ نور تھے کہ بشر تھے' کیا آپ حیات النبیؐ کی قائل ہیں۔ کیا حضورؐ کو غیب کا علم تھا۔ گیارہویں شریف کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کوّا حلال ہے یا حرام ہے؟ نماز پڑھتے وقت ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا پیٹ پر' نیز اس طرح کے دوسرے تمام مسائل جن کا تعلق پیٹ سے ہے اس کے بارے میں اپنی رائے کا کھل کر اظہار کریں۔ تاکہ آپ کی نجات کے بارے میں علماء کسی حتمی نتیجے پر پہنچ سکیں۔

یہ سوال جو ہم نے ڈاکٹر شمل سے پوچھے ہیں اپنے دوست مولانا فی سبیل اللہ فسادی کے کہنے پر پوچھے ہیں۔ ورنہ ہم جیسے گنہ گار مسلمانوں کے لئے محض ڈاکٹر شمل کا قبول اسلام ہی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ویسے مولانا فی سبیل اللہ فسادی نے چند تبلیغی کتابیں ہمیں دی ہیں کہ ہم ڈاکٹر شمل تک پہنچا دیں تاکہ ان کی نجات اُخروی کے بارے میں کوئی شک نہ رہے۔ ان میں سے ایک کتاب "محاسن امرود در رو مردود" ہے' جس میں امرود کھا ۔ کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ اور مستند حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ امرود کھاتے وقت جو مردود ان ہدایات پر عمل نہیں کرتے' حشر میں ان کا انجام وہی ہو گا جو خواجہ محمد اسلام کی کتاب "مرنے کے بعد کیا ہو گا" میں بیان کیا گیا ہے۔ مولانا فی سبیل اللہ فسادی نے اپنی ایک اور تصنیف ڈاکٹر صاحب کے لئے عنایت کی ہے جس کا نام "ابطال شبیہ فی نار قبیح" ہے مولانا بہت دیر تک ہمیں اس کا موضوع سمجھاتے رہے۔ مگر اس کی نوعیت اتنی عالمانہ ہے کہ .... یہ موضوع ہماری دسترس سے باہر ہے۔ بس اتنا سمجھ میں آیا کہ اس کا تعلق تصویر کی اشاعت وغیرہ سے ہے۔ مولانا فی سبیل اللہ فسادی نے اپنی ایک اور گراں قدر تصنیف "آلہ مکبر الصوت جبل الموت" بھی ہماری معرفت ڈاکٹر صاحب کے مطالعے کے لئے پیش کی ہے آج ڈاکٹر صاحب لاہور تشریف لانے والی ہیں۔ ہم انشاء اللہ قبول اسلام کی خوشی میں مولانا کی علمی تصانیف کا یہ تحفہ ان کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔

گر قبول افتد زہے عزو شرف

ہم آخر میں ایک دفعہ پھر ڈاکٹر صاحب کو قبول اسلام پر تہہ دل سے مبارک پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ہم فرقہ پرست نہیں ہیں تاہم امید ہے کہ اب تک ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کر لیا ہو گا کہ وہ سنی ہیں یا شیعہ اور اگر سنی ہیں تو دیوبندی ہیں یا بریلوی ہیں؟

۱۲ر اکتوبر ۱۹۸۶ء

دَوڑ دُھوپ

ہمارے ایک دوست ہیں جنہیں کسی کام میں مصروف دیکھ کر ان کے انہماک کے پیش نظر یہ گمان گزرتا ہے کہ شاید وہ دنیا کی کوئی عظیم مہم سر کرنے میں لگے ہوئے ہیں' ان سے اگر پوچھیں تو وہ تاثر بھی یہی دیں گے' لیکن اگر ان سے پوچھا نہ جائے بلکہ کچھ دیر تک ان کی "سرگرمیوں" پر صرف "کڑی نظر" رکھی جائے تو پتہ چلے گا کہ موصوف بازار سے دہی خریدنے کے لئے برتن تلاش کر رہے ہیں' ایک دفعہ ہم ان کے ہاں گئے' دوپہر کا وقت تھا' بھوک بہت لگی ہوئی تھی' ہمیں دیکھ کر ان کے چہرے پر رونق آ گئی' اس کا پتہ ہمیں ان کے چہرے سے نہیں' ان کی زبان سے چلا جب انہوں نے کہا کہ "تمہیں دیکھ کر میرے چہرے پر رونق آ گئی ہے" بس اس کے بعد سے وہ نچلے نہیں بیٹھے" تم کھانا تو کھاؤ گے نا؟ ہاں کیوں نہیں کھاؤ گے بس ایک منٹ میں کھانا تمہارے سامنے ہو گا' اچھا' مگر پہلے بتاؤ کہ تم کھاؤ گے کیا؟ مرغی بھی پک سکتی ہے' مچھلی بھی تیار ہو سکتی ہے' پلاؤ بھی منٹوں میں تیار ہو جائے گا' کباب تو تمہیں اچھے لگتے ہیں نا؟ کباب بھی پانچ منٹ میں تیار ہو جائیں گے' تمہیں سلاد کون سی پسند ہے رشین سلاد میں خود بہت اچھی تیار کر لیتا ہوں' اور ہاں وہ سوپ تو میں نے پوچھا ہی نہیں' سوپ کون سا پسند کرو گے چلو وہ تم مجھ پر چھوڑ دو' مگر سب سے پہلے تو تمہیں کوئی مشروب پینا چاہئے' تمہیں کون سا جوس اچھا لگتا ہے' اورنج جوس چلے گا؟ گریپ فروٹ کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے' لیکن اگر میری مانو تو یہ سب کچھ چھوڑو' ایک ٹھنڈی ٹھار بوتل پیو' سردیوں میں فریزر میں لگی بوتل پینے کا مزا ہی کچھ اور ہے تو بس ٹھیک ہے' پہلے میں تمہارے لئے بوتل کا انتظام کرتا ہوں" اور اس کے بعد وہ بوتل کے انتظام میں کچھ اتنی تندہی سے منہمک ہوئے کہ لگتا تھا خدا جانے کس "بوتل" کا انتظام کرنے میں لگے ہوئے ہیں' "اوئے ارشد ادھر آؤ' سائیکل پکڑو' ایک تھیلا بھی ساتھ لے لو' چوک میں سے گزر کر پہلی تین دکانیں چھوڑ کر بائیں ہاتھ چوتھی دکان ہے' وہاں جاؤ' وہاں ایک موٹا سا آدمی دھوتی باندھ کر بیٹھا ہو گا' اس سے نام پوچھنا' اگر وہ ظہور ہو تو اسے میرا اسلام کہنا کہ ایک ٹھنڈی سی سیون اپ دے دیں' اور پھر یہ بوتل احتیاط سے تھیلے میں ڈال کر لے آنا' مگر دیر نہیں لگنی چاہئے' بس آنا جانا کرو' لیکن تم سست آدمی ہو' یہ کام تم سے نہیں ہو گا' تم اندر جاؤ اور سلیم کو بھیجو سلیم خاصا ہوشیار لڑکا ہے' اسے کہو بھائی جان بلا رہے ہیں سب کام چھوڑ کر جلدی سے آ جائے" ہم نے گھڑی دیکھی تو تین بج رہے تھے' ہمیں اس وقت کہیں اور پہنچنا تھا' سو ہم اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا "یار تمہارے پلاؤ' مرغ مچھلی' کباب' رشین سلاد' جوس' بوتل وغیرہ کا بہت شکریہ مگر اب تم مجھے اجازت دو' یہ سب کچھ پھر کبھی سہی"۔

ہم اس وقت اتنی جلدی میں تھے کہ رخصت ہوتے وقت اپنے اس دوست کو اس طوطے کا لطیفہ بھی نہ سنا سکے، جس کے گھر ایک دوسرا طوطا مہمان گیا' اور اس نے جاتے ہی کہا کہ یار بھوک بہت لگی ہے' ذرا جلدی سے کھانے کا بندوبست کرو' یہ سن کر میزبان طوطے نے اڈاری ماری اور ایک دوسرے درخت پر بیٹھی چڑیا کے پاس جا کر اس کے کان میں کچھ سرگوشیاں سی کرنے لگا' تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو مہمان نے پھر کہا کہ یار بھوک بہت لگی ہے' ذرا کھانے کا جلدی سے بندوبست کرو' اس پر طوطے نے ایک بار پھر اڈاری ماری اور ایک کوّے کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگا' وہاں سے اڈاری مار کر وہ ایک مینا کے پاس گیا اور چہرے پر خاصے غور و فکر کے آثار پیدا کر کے اس کے ساتھ رازدارانہ سی گفتگو کرنے لگا' جب واپس اپنی شاخ پر آیا تو مہمان نے ڈھیٹ بن کر ایک بار پھر کہا کہ یار کھانے کا کچھ کرو' بھوک بہت لگی ہے' اس پر میزبان طوطے نے ایک نظر اسے دیکھا اور کہا "یار لعنت بھیجو کھانے پر' تم میری خارجہ پالیسی دیکھو"! سو ہم بھی اپنے اس دوست کی "خارجہ پالیسی" دیکھتے رہتے ہیں' اسے اگر کبھی ٹوکیں تو یہ ناراض ہو جاتا ہے' تاہم اس کی ایک ادا ہمیں بہت پسند ہے' جس کے باعث اس کی باقی "ادائیں" ہم بھول جاتے ہیں اور وہ اس کی یہی سرگرمی دکھانے والی ادا ہے' اس سے اور کچھ نہیں دل کو ڈھارس تو بندھتی ہے کہ کوئی آپ کی دلجوئی کے لئے اتنے سارے لفظوں کا اہتمام کر رہا ہے کیونکہ کچھ لوگ تو اتنا بھی نہیں کرتے ہم جب کبھی اپنے اس دوست سے ملتے ہیں وہ بندر یاد آ جاتا ہے جو الیکشن کے نتیجے میں جنگل کی بلدیہ کا چیئرمین منتخب ہو گیا تھا' ایک دفعہ ایک گیدڑنی دوڑی دوڑی اس کے پاس آئی' اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرے پر پریشانی کے آثار تھے' بندر نے پوچھا خیریت تو ہے اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ گیدڑنی نے کہا کہ شیر میرے بچوں کو کھانے آ رہا ہے' خدا کے لئے میرے بچوں کو بچالو' بندر نے اس پر انتہائی تشویش ظاہر کی' اور پوچھا "تمہارے کتنے بچے ہیں"؟ گیدڑنی نے کہا "چار" یہ سن کر بندر چھلانگ لگا کر درخت پر چڑھ گیا اور سوچ بچار کرنے لگا' گیدڑنی نے آہ و زاری کی اور کہا "شیر تھوڑی دیر بعد میرے بچوں کو کھا جائے گا' خدا کے لئے جلدی کرو"! یہ سن کر بندر درخت سے نیچے اترا اور گدڑنی سے پوچھا "تم نے کیا بتایا تھا' تمہارے کتنے بچے ہیں"؟ گیدڑنی نے کہا "چار" یہ سن کر بندر ایک بار پھر درخت پر چڑھ گیا' اور گہرے غور و فکر میں مشغول ہو گیا' اس پر گیدڑنی نے چلا کر کہا کہ اگر کچھ کرنا ہے تو کرو' میرے بچوں کی جان خطرے میں ہے! اس پر بندر درخت سے اترا اور گیدڑنی سے پوچھا "تمہارا شوہر زندہ ہے" گیدڑنی نے کہا "ہاں وہ اس وقت بچوں ہی کے پاس ہے مگر خدا کے لئے تم کچھ جلدی کرو"! بندر نے کہا "ابھی کرتے ہیں" اور پھر درخت پر چڑھ گیا' اتنے میں گیدڑ آہ و زاری کرتا ہوا وہاں پہنچا اور اس نے بتایا کہ شیر اس کے بچوں کو کھا گیا ہے' یہ سن کر بندر درخت سے نیچے اترا' اس کے چہرے پر غم کی گہری لکیریں تھیں' وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیدڑ کے پاس پہنچا اور کہا "بھائی بہت افسوس ہوا' اللہ کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں' مگر ہم نے اپنے طور پر بہت دوڑ دھوپ کی"۔ بس ہمیں اپنے اس دوست اور حکمرانوں کی بھی یہی دوڑ دھوپ پسند ہے' باقی اللہ کے کاموں میں تو واقعی کسی کو دخل نہیں۔

۳۰ر دسمبر ۱۹۸۲ء

نفس امارہ

ان دنوں ہم قربانی دینے کے موڈ میں ہیں تاہم ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ قربانی کے لئے کون ساجانور منتخب کریں 'اس مقصد کے لئے گذشتہ روز ہم بطور خاص بازار گئے ایک دکان پر ایک بہت صحت مند شخص دیکھا جو بہت پھرتی سے کام میں مشغول تھا ہمیں بتایا گیا کہ یہ شخص انسانی جان بچانے والی ادویات جعلی طور پر تیار کرتا ہے اور یوں اب تک سینکڑوں لوگ ان ادویات کے استعمال سے جاں بحق ہو چکے ہیں ہم نے اللہ کی راہ میں قربانی کے لئے اس شخص کو پسند کیا مگر ہمیں بتایا گیا کہ قربانی انسان کی نہیں جانور کی دی جاتی ہے 'ہمیں یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ کیونکہ ہم نے اس شخص کو جانور سمجھ کر ہی قربانی کے لئے منتخب کیا تھا تاہم ممکن ہے اس جانور کا شمار حرام جانوروں میں ہوتا ہو اور یوں اس کی قربانی جائز نہ ہو 'لیکن ہمیں کہا یہ گیا کہ تم اسے خریدنے کی سکت نہیں رکھتے اس کی صحت دیکھو یہ تمہارے سمیت پورا محکمہ صحت خرید سکتا ہے یہاں سے مایوس ہو کر ہم نے باری باری ہیروئن کے سمگلر' ذخیرہ اندوز' راشی 'ایک پورے کنبے کے قاتل اور چھ سالہ بچی پر مجرمانہ حملہ کرنے والے شخص کو قربانی کے لئے پسند کیا مگر ہمیں یہاں بھی یہ کہہ کر مایوس کیا گیا کہ ایک تو قربانی انسانوں کی نہیں جانوروں کی دی جاتی ہے اور دوسرے اگر یہ جانور ہیں بھی تو تمہاری قوت خرید سے باہر ہیں پھر ہم نے بعض قومی مجرموں پر انگلی رکھی کہ اس عید قربان پر اللہ کے نام پر ہی نہیں 'انہیں ملک و قوم کے نام پر بھی قربان کر دیں مگر اس دفعہ ہمیں سختی سے جھڑک دیا گیا اور کہا گیا کہ اگر اللہ کے حضور سرخرو ہونے کا اتنا ہی شوق ہے تو بازار سے ایک بکرا خریدو اور اسے ذبح کر دو کیوں بھڑوں کے چھتے کو چھیڑتے ہو۔

جہاں تک قربانی کے بکروں کا سوال ہے تو ہماری دسترس سے وہ بھی باہر ہیں قیمتیں ہیں کہ آسمان سے باتیں کر رہی ہیں مگر ہم نے سوچا کہ آخر پوچھنے میں کیا حرج ہے؟ چنانچہ پوچھا تو جواب ملا "شت ہیار دی جوڑی" (سات ہزار کی جوڑی) حالانکہ سات ہزار پلے ہوں تو اکیلا آدمی خود"جوڑی" میں تبدیل ہو سکتا ہے' یہاں سے مایوس ہو کر ہم نے گائے میں حصہ ڈالنے کی بابت سوچا اور تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ گائے میں حصہ ڈالا تو جا سکتا ہے' مگر اپنا حصہ گھر لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں 'کیونکہ عید کے روز گائے کا گوشت فقیر بھی قبولنے کو تیار نہیں ہوتے' ہمیں گاؤ ماتا کی اس بے قدری پر بہت ملال ہوا' چنانچہ اونٹ میں حصہ ڈالنے کا ارادہ کیا' مگر پتہ چلا کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی" والا محاورہ بعد از شہادت بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا' چنانچہ اس کا گوشت ایک خاص مرض میں مبتلا لوگ کھانا پسند کرتے ہیں یا وہ لوگ جو ایک خاص مرض میں مبتلا ہونے کے خواہش مند

ہوں۔

سو اب صورت حال یہ ہے کہ اس عید قربان پر جو قربانی ہم دینا چاہتے تھے' اس قربانی کی کوئی سبیل پیدا نہیں ہو رہی۔ یعنی نہ کوئی سماجی اور قومی جانور پھٹے پر ہاتھ دھرنے دیتا ہے اور نہ بکروں کے مالکان ہمیں قریب پھٹکنے دیتے ہیں' اب لے دے کے ایک نفس امارہ رہ گیا ہے' جس کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں اپنے ایک دوست سے بات کی تو اس نے کہا کہ میاں! تم مشورہ مانگ رہے ہو کہ مشورہ دے رہے ہو؟ ہم نے پوچھا کیا مطلب' کہنے لگا تم غالباً مشورہ مانگنے کے پس پردہ کہنا یہ چاہتے ہو کہ بکروں اور دنبوں کی قربانی کا اصل مقصد اپنی نفسانی خواہشات کو خدا کی راہ میں قربان کرنا ہے۔ یہ سن کر ہم نے اپنے اس دوست کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ایسی اچھی بات ہمارے منہ میں ڈالی تاہم واضح کیا کہ ہم نے تو بوجہ مجبوری یہ بات کہی تھی ورنہ پیسے جیب میں ہوتے تو نفس امارہ کو مارنے کے چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی' سات ہزار کی جوڑی دروازے پر باندھتے' ہماری دینداری اور دریا دلی کی گواہی اس جوڑی کی "میں میں" دیتی' ان کی رانوں سے سماجی تعلقات میں اضافہ ہوتا' بچوں کی بھی دل لگی ہو جاتی اور یوں دین اور دنیا دونوں سنور جاتے' مگر ایسا چونکہ ممکن نہیں۔ لہٰذا اس برس ہم نفس امارہ کی قربانی دیں گے۔

ہمارا خیال تھا کہ ہمارا یہ دوست ہمارے اس انقلابی فیصلے کی داد دے گا مگر اس نے اپنی باتوں سے ہمیں بہت مایوس کیا کہنے لگا "یہ سب قربانی نہ کرنے کے بہانے ہیں' تم ایک مہینے میں جتنے پیسوں کے سگریٹ پی جاتے ہو' اس میں دو بکرے خریدے جا سکتے ہیں اور تم جو بلاوجہ پٹرول پھونکتے رہتے ہو' اس میں دو بکرے مزید آ سکتے ہیں۔ قربانی ایک دینی فریضہ ہے' اس کی ادائیگی میں کوئی جعلی عذر آڑے نہیں آ سکتا۔ مجھے دیکھو' تم سے زیادہ عیال دار ہوں' مگر میں نے قربانی کے لئے چھ ہزار روپے بچا کر رکھے تھے' چنانچہ کل بازار سے ہزار ہزار کے دو بکرے خرید لایا ہوں"۔

"یہ تو کل دو ہزار بنے' باقی چار ہزار کہاں خرچ ہوئے" ہم نے پوچھا۔

"ان کا فریزر لایا ہوں" دوست نے جواب دیا۔

گویا اس فریزر کی بدولت یہ بکرے "حیات جاوداں" پائیں گے' اگر ہمارے دوست نے یہ بات ہمیں شروع میں بتائی ہوتی تو شاید ہم بھی ان کی پیروی کی کوشش کرتے' مگر اب تو وقت بہت کم ہے چنانچہ اس کم وقت میں نفس امارہ ہی کی قربانی دی جا سکتی ہے۔

۱۳ اگست ۸۶ء

مثالی بیوروکریٹ

ہمارے ایک دوست بہت خاص وضع کے آدمی ہیں۔ ہم یہ کالم ان کا نام لے کر لکھ سکتے تھے' مگر اصل مسئلہ تو ان کے نام ہی کا ہے' جس کی وجہ سے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں۔ اب آپ چاہیں گے کہ اس مسئلے کی کچھ تفصیلات بیان کی جائیں تو چلئے ہم تھوڑی بہت تفصیل بھی بیان کئے دیتے ہیں۔

ایک دفعہ ہم انہیں ملنے ان کے دفتر گئے۔ ایک کمرے کے باہر تعبیر صدیقی نام کی تختی لگی تھی' ہم الجھن میں پڑ گئے کیوں کہ ان کا نام تعبیر ہے مگر وہ صدیقی نہیں ہیں' سوچا کمرے میں جھانک کر دیکھ لیتے ہیں' جھانک کر دیکھا تو موصوف کرسی پر برا جمان تھے۔ ہم نے پوچھا "برادر! یہ تعبیر صدیقی کون ہے؟" بولے "میں ہوں" ہم نے کہا "مگر تم صدیقی تو نہیں ہو!" کہنے لگے "میرا افسر تو صدیقی ہے!"

اسی طرح ایک اور دفتر میں ان کی ٹرانسفر ہونے پر ہم ملاقات کے لئے ان کے پاس گئے تو پتہ چلا ان دنوں وہ تعبیر نقوی ہیں' وجہ دریافت کرنے کی اگرچہ ضرورت نہ تھی' لیکن معلوم کیا تو وجہ وہی نکلی جس کا شبہ تھا یعنی جس افسر کے تحت وہ ان دنوں کام کر رہے تھے' وہ نقوی تھے۔

ایک دفعہ ہم نے انہیں دیکھا کہ پان کی گلوری منہ میں ہے' پاجامہ پہنا ہوا ہے اور بات بات پر "آداب آداب" کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ موصوف ان دنوں تعبیر رامپوری کہلاتے ہیں۔

کچھ دنوں بعد ملے تو بات بات پر بے تکلفی سے ہاتھ پر ہاتھ مارتے تھے' کڑھے ہوئے کرتے کے ساتھ چوخانے والی دھوتی باندھی ہوئی تھی' اردو کی بجائے پنجابی بولتے تھے یعنی موصوف ان دنوں تعبیر جالندھری تھے!

ایک زمانے میں انہوں نے خشخشی داڑھی رکھ لی' ٹخنوں سے اونچی شلوار پہننے لگے۔ چند دنوں بعد ملاقات ہوئی تو کلین شیوڈ تھے۔ تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا' ہاتھ میں پائپ تھا۔ ہم نے پوچھا "برادر آپ کی داڑھی کہاں گئی ذرا اس کی ضرورت پڑ گئی تھی" کہنے لگے "وہ تو افسر کے ساتھ گئی لیکن آپ کو اس کی ضرورت کیوں پڑ گئی خیریت تو ہے؟" ہم نے کہا "ٹیلی ویژن پر تفہیم دین پروگرام میں آپ کو بلانا تھا' پروڈیوسر سے بات بھی ہو گئی ہے" بولے "کوئی بات نہیں' مہینے پندرہ دنوں تک افسر تبدیل ہونے والا ہے" تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد گھر پر آئے تو چہرے پر ننھی منی داڑھی اور کاندھے پر رومال تھا۔ کہنے لگے "چلو ٹیلی ویژن سٹیشن چلتے ہیں" ہم نے کہا "جس پروڈیوسر سے بات ہوئی تھی' اس کا تبادلہ ہو گیا ہے!" بولے "تو پھر چلو نائی کی دکان پر چلتے ہیں!"

موصوف کا تعلق کسی زمانے میں ریڈیو سے بھی تھا۔ ایک دن ہم نے کہا تم جس طرح حکومت کے پراپیگنڈے

میں لگے ہوئے ہو، اگلی حکومت تمہیں الٹاٹانگ دے گی! بولے "ایسا نہیں ہو گا ہم اگلی حکومت سے صرف چوبیس گھنٹے کی مہلت مانگیں گے، ان سے کہیں گے کہ آپ نے جو بھی فیصلہ کرنا ہے ہمارے آئندہ چوبیس گھنٹے کے پروگرام سن کر کریں" چنانچہ یہ فیصلہ ان کے حق میں تھا۔

موصوف سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اگرچہ کسی سرکاری پارٹی سے باقاعدہ وابستہ نہیں، مگر ہر دور میں کسی نہ کسی سیاسی جماعت کے لئے کام ضرور کرتے رہے ہیں اور اسے حسن اتفاق ہی سمجھیں کہ ان کی پسندیدہ سیاسی جماعت برسراقتدار جماعت ہوتی ہے۔ ایک الیکشن کے دوران موصوف ایک سیاسی جماعت کے زبردست مخالف تھے اور مسلسل اس پر نقطہ چینی میں لگے رہتے تھے، جبکہ ان کے ایک دوست اس جماعت کے حامی تھے، نتائج والے اور یہ دونوں دوست ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے تھے، جس جماعت کے یہ مخالف تھے اس کی جیت کے آثار پیدا ہو گئے، مگر انہوں نے اپنے دوست کے کاندھوں کو مسرت سے جھنجھوڑا اور چلا کر کہا "پیارے ہم جیت رہے ہیں!"

جن دنوں ہمارے یہ دوست "روٹی کپڑا اور مکان" کے پرچارک تھے، ان دنوں اگر کبھی ان کے دفتر فون کیا جاتا تو بتایا جاتا کہ صاحب کسی کچی آبادی کے معائنے پر گئے ہوئے ہیں، ان دنوں فون کریں تو جواب ملتا ہے "صاحب نماز پڑھ رہے ہیں!"

ہمارے یہ دوست سول سروس سے وابستہ ہیں اور انہیں ایک مثالی بیوروکریٹ سمجھا جاتا ہے!

۲۵ ستمبر ۱۹۸۶ء

بودی پہلوان

بے نظیر بھٹو کا جلوس جب لاہور سے گوجرانوالہ کے لئے روانہ ہوا تو مرید کے میں بودی پہلوان بے نظیر کے ٹرک کے آگے لیٹ گیا اور اعلان کیا کہ یا تو بے نظیر یہاں تقریر کریں اگر نہیں تو پھر بڑے شوق سے ٹرک اس پر سے گزار دیں۔ یہ خبر ان کالموں میں درج کرتے ہوئے ہم نے بودی پہلوان کا تعارف نہیں کرایا کہ وہ کون ہے 'کیا ہے' کیسا ہے' کیونکہ ہر پنجابی کو پتہ ہے کہ بودی پہلوان کا حلیہ کیا ہوتا ہے 'اس کے لباس رہن سہن اور روزگار سے بھی لوگ واقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ بودی پہلوان کو دیکھے بغیر ہم اگر اس کا قلمی خاکہ کھینچنا چاہیں تو اس کے مطابق پہلوان ہوراں نے ایک لمبا کھلا کرتا پہنا ہو گا' گلے میں تعویز ہو گا' سر پر آڑھی پگڑی باندھی ہو گی جس کا پلو پیچھے کی بجائے آگے سینے پر پڑا ہو گا' بودی پہلوان نے چوخانے والی دھوتی پہنی ہو گی جسے اس نے گھٹنوں تک اوپر اٹھا کر اس سے منی سکرٹ کا کام بھی لیا ہو گا۔ بودی پہلوان کے کان مڑے ہوئے ہوں گے' توند نکلی ہوئی ہو گی اور آواز باریک سی ہو گی' بودی پہلوان اسی حلئے اور وضع قطع کے ساتھ اپنی دودھ دہی کی دکان پر ایک چوکی پر بیٹھے' گردن کو خم دیئے بغیر گڑوی میں مدانی سے لسی رڑکتا ہو گا اور کسی معزز گاہک کو اپنی دکان پر دیکھ کر "چھوٹے" کو آواز دیتا ہو گا "اوئے چھوٹے' ویخدا نئیں باؤ ہوری کھلوتے ہوئے نیں' ایناں واسطے سٹول لیا" اس کے بعد اگلا فقرہ جو وہ کہتا ہو گا وہ ہم درج نہیں کریں گے کیونکہ یہ فقرہ اس نے باؤ ہوراں دی عزت افزائی کے لئے کہا ہو گا' مگر یہ فقرہ سن کر باؤ ہوراں کے کان کی لویں سرخ ہو جاتی ہوں گی اور ان کے پسینے چھوٹ جاتے ہوں گے۔ بودی پہلوان کڑکتی سردیوں میں ململ کا کرتہ پہن کر فلم کا آخری شو بھی دیکھنے جاتا ہو گا اور شو ٹوٹنے پر جب سب لوگ گرم کپڑوں کے باوجود کپکپاتے ہوئے ہال سے باہر نکلتے ہوں گے بودی پہلوان اس ململ کے کرتے میں اس شان سے باہر نکلتا ہو گا کہ اس نے دونوں بازو اطراف میں اتنے پھیلائے ہوں گے اور بغلوں کے درمیان اتنا خلا ہو گا کہ ان میں سے ایک ایک آدمی باسانی گزر سکے' مگر جب بودی پہلوان رش میں سے گزر کر اپنے گھر کو جانے والی کسی تنگ گلی میں داخل ہوتا ہو گا' جہاں اسے کوئی دیکھنے والا نہ ہو' تو جس کپکپی پر اس نے اتنی دیر سے قابو پایا ہوا تھا وہ کپکپی اس پر طاری ہو جاتی ہو گی اور وہ کمر جھکائے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے فلم کا گانا کپکپاتی آواز میں گنگناتے' بغلوں میں دونوں ہاتھ دیئے سی سی کرتا ہوا گلی سے گزرتا ہو گا اسی دوران کسی گلی کی موڑ سے اچانک سامنے آنے والا کوئی شخص اگر پہلوان ہوراں سے پوچھتا ہو گا "پہلوان جی ٹائم کی کیتا جے" تو بودی پہلوان ایک دفعہ پھر تن کر کھڑا ہو جاتا ہو گا دونوں بازو مرغے کی طرح پھلا کر اور سی سی پر قابو پا کر کہتا ہو گا "اک وجن والا

وئی!" اور راہ گیر کے نظروں سے دور ہوتے ہی ایک دفعہ پھر وہ اصل پوزیشن میں واپس آ جاتا ہو گا!

قارئین کرام سے معذرت کہ ہم نے سارا وقت بودی پہلوان کی تصویر کشی میں گزار دیا اور خبر کے حوالے سے ابھی تک کچھ نہیں کہا' مگر ہمارا بیان ابھی ختم نہیں ہوا' ابھی تو ہم نے بودی پہلوان کے بارے میں یہ بھی بتانا ہے کہ اپنے علاقے میں موصوف کی شجاعت و بہادری کے بہت قصے مشہور ہوں گے جہاں دو دشمنوں کے درمیان پان سگریٹ کی کسی دوکان پر پرانی طرز کی بنٹوں والی سوڈے کی بوتلیں چل رہی ہوں اور کوئی کمزور آدمی اس خطرناک بلوے میں ملوث ہونا پسند نہ کرتا ہو بلکہ یہ سب شرفاء بوتلوں کی رینج سے پرے کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے ہوں' بودی پہلوان اپنے مخصوص لباس اور مرغ کی طرح بازو پھلائے تماشائیوں کا مجمع چیرتا ان دو حریفوں کے پاس پہنچے گا اور انہیں ایک ایک چپت لگا کر اور چند پیاری مغلظات سنا کر انہیں برابر برابر چھڑا دے گا جس پر بودی پہلوان کی واہ واہ ہو جائے گی۔ اگر بودی پہلوان کو براہ راست کوئی للکار بیٹھے تو بودی پہلوان کی "بڑھک" اس سے زیادہ زور دار ہو گی' لیکن اگر حریف پنجہ آزمائی پر اتر آتا ہے تو بودی پہلوان اسے کہے گا "چل پتر چل' اوئیں میرے ہتھوں ضائع ہو جائیں گا" اور اگر مخالف اس پر بھی باز نہیں آتا' بلکہ الٹا بودی پہلوان کو ضائع کرنے پر تل جاتا ہے اور خود پہلوان کو اپنے تلف ہونے کا یقین ہو جاتا ہے تو اسے مزید ریکانے کی بجائے خود ریک جاتا ہے مگر اس حکمت عملی سے کہ اس کی بہادری کی شہرت پر آنچ بھی نہیں آتی اور اگر آتی بھی ہو تو بودی پہلوان کو اس کی فکر نہیں ہوتی کیونکہ یہ فکر پہلوان کو ہوتی ہے' بودی پہلوان کو نہیں!

اور اب آئیں اس خبر کی طرف کہ بے نظیر بھٹو کا جلوس جب لاہور سے گوجرانوالہ کے لئے روانہ ہوا تو مریدکے میں بودی پہلوان بے نظیر کے ٹرک کے آگے لیٹ گیا اور اعلان کیا کہ یا تو بے نظیر یہاں تقریر کریں اور اگر نہیں تو بڑے شوق سے ٹرک اس پر سے گزار دیں' چنانچہ بے نظیر کو یہاں ایک مختصر سی تقریر کرنا پڑی جس سے جلوس مزید تاخیر سے گوجرانوالہ پہنچا۔ آگے چلنے سے پہلے ایک دفعہ پھر یہ منظر کشی ضروری ہے کہ بودی پہلوان ایک ٹانگ پر ناچتا ہوا ٹرک کے سامنے آیا ہو گا دو چار کرارے سے نعرے لگائے ہوں گے اور اس کے بعد سڑک پر چت لیٹ گیا ہو گا کہ یا تقریر کرو یا ٹرک گزار دو مگر اس دوران وہ کنکھیوں سے ٹرک کے ٹائروں کو ضرور دیکھتا رہا ہو گا کہ کہیں یہ حرکت تو نہیں کر رہے' حرکت کی صورت میں بودی پہلوان چشم زدن میں اتنا "متحرک" ہو جاتا کہ مجمع میں اسے تلاش کرنا مشکل ہو جاتا' مگر مکمل یقین کے بعد کہ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں وہ اپنی جگہ چت لیٹا رہا حتیٰ کہ بے نظیر کو تقریر کرنا پڑی اور یوں بودی پہلوان "شہید" کی بجائے "غازی" کی صورت میں اپنی جگہ سے اٹھا ہو گا اور کئی فرلانگ تک جلوس کے آگے ایک ٹانگ پر ناچتا ہوا بالآخر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو گا!

ہم معافی چاہتے ہیں کہ یہ کالم بے نظیر پر کم اور بودی پہلوان پر زیادہ ہو گیا ہے اور خود بودی پہلوان سے بھی معذرت خواہ ہیں کہ ہم نے اسے روایتی بودی پہلوان کے طور پر لیا' حالانکہ ممکن ہے بودی پہلوان اس روایتی بودی پہلوان سے بالکل مختلف ہو' جس کا نقشہ ہم نے اوپر کھینچا ہے' مگر اس سارے قصے میں ہم بات یہ کہنا چاہتے

ہیں کہ جو بودی پہلوان ٹرک کے آگے لیٹ گیا' اگر تو وہ جنوئن پہلوان تھا تو بے نظیر خوش قسمت ہیں اور اگر وہ سچ مچ "بودی پہلوان" تھا تو وہ جان لیں کہ سیاسی پارٹیوں میں شامل "بودی پہلوان" منزل تک پہنچنے میں تاخیر کا باعث بن جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ بے نظیر نے جو نیا سفر شروع کیا ہے اس میں بودی پہلوانوں کو ہم سفر بنانے سے پہلے بہت دیر تک سوچنا چاہئے کیونکہ ان کے والد محترم کے گرد بھی بے شمار "بودی پہلوان" جمع تھے جو روٹی' کپڑا' مکان کے ٹرک کے آگے لیٹ لیٹ جاتے تھے' سوا اس دوران سارا وقت تقریروں میں صرف ہوا' منزل تک پہنچنے میں نہیں اس وقت بھی پارٹی میں بہت سے "بودی پہلوان" ہیں جن کا بہت "ٹھکہ" ہے بے نظیر اگر انہیں آزمانا چاہتی ہیں تو ایک دن بغیر بریک والے ٹرک پر بیٹھ کر جلسہ گاہ کی طرف جائیں! دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔

سو فیصد مفت

گزشتہ ہفتے اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا تو ٹریفک سگنل سرخ ہونے پر ایک نوجوان دیوانہ وار خوشخبری' خوشخبری کے نعرے لگاتا ہوا ایک طرف سے نمودار ہوا اور بتی سبز ہونے کے انتظار میں رکی کاروں کی کھڑکیوں سے ایک اشتہار اندر پھینکنے لگا' ایک اشتہار مال غنیمت کے طور پر ہمارے ہاتھ بھی لگا' ہم نے بے تابی سے وہ اشتہار پڑھنا شروع کیا' اس پر ایک کلغی والے مرغ کی تصویر بنی تھی اور اس کے نیچے قوم کو یہ خوشخبری سنائی تھی کہ اگر آپ ہمارے دوکان سے مرغ خریدیں گے تو ہم مرغ ذبح کرنے اور اس کی کھال اتارنے کا فریضہ بالکل مفت انجام دیں گے۔ یہ خوشخبری پڑھ کر فرط مسرت سے ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس کے ساتھ ہی مرغ کی تصویر دیکھ کر ہماری ہنسی بھی نکل گئی۔ موصوف نے اپنی کلغی سے کج کلاہی کا کام لیتے ہوئے' پروں کو پھلا کر اذان دینے کے انداز میں تصویر اتروائی تھی اور اپنی طرف سے ایسا پوز مارا تھا جیسے یہ تصویر "ضرورت رشتہ" کے اشتہار کے لئے کھچوا رہے ہوں اور انہیں یقین ہو کہ جو مرغی بھی تصویر کو دیکھے گی' ان کے "حرم" میں شامل ہونے کے لئے دیوانہ وار کھنچی چلی آئے گی' مگر اس بے زبان کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کی تصویر خود اسی کی کھال اتارنے کے اشتہار میں استعمال ہو گی' ہمارے ایک دوست اپنے زمانہ غربت کا واقع سناتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک مہربان انہیں اپنے ساتھ لے گیا' ایک ہوٹل میں اسے کھانا کھلایا' سگریٹ کی ایک ڈبی بھی خرید کر دی اور اس کے بعد اسے ایک جگہ نوکری دلانے کے لئے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ دوست کے مطابق وہ مہربان اسے ایک صنعت کار کی کوٹھی میں لے گیا اور باہر برآمدے میں بٹھا کر خود ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا' کچھ دیر بعد وہ مہربان 'صنعتکار کے ساتھ باہر برآمدے میں آیا اور اس نے ہمارے دوست کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں نوجوان' زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے' مگر انسان کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے!" راستے میں مہربان نے بتایا کہ تمہاری نوکری کی بات ہو گئی ہے' انشاء اللہ چند روز تک تمہارا کام ہو جائے گا اور جاتی دفعہ اس مہربان نے ہمارے دوست کی جیب میں زبردستی دس روپے کا نوٹ بھی ڈال دیا۔ اگلے روز ہمارے اس دوست کا ایک دوست بہت غصے کے عالم میں اس کے گھر آیا اور کہا "مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ ایک دن تم اتنی نچلی سطح پر بھی اتر آؤ گے" ہمارے دوست نے اس خفگی کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ گزشتہ روز وہ اسی صنعتکار کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا جہاں تم اپنے مہرباں کے ساتھ آئے تھے۔ تمہارے مہربان نے صنعتکار سے کہا کہ میرے ساتھ ایک نوجوان ہے' جو نہایت غریب مگر غیور ہے' گذشتہ تین دن سے اس نے کھانا نہیں کھایا اور آج

صبح اس کی والدہ کا انتقال بھی ہو گیا ہے۔ لاش بے گور و کفن پڑی ہے اور اس بچارے کے پاس تجہیز و تکفین کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں ہے' یہ سن کر صنعتکار نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور کہا اسے چپکے سے میری طرف سے دے دو تمہارے مہربان کی "رقت انگیز" تقریر سن کر میرا دل اتنا پسیجا کہ میں نے بھی اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ تھا' نکال کر باہر لایا مگر آگے تم بیٹھے ہوئے تھے' میں تمہیں اس وقت شرمندگی سے بچانے کے لئے وہیں سے واپس ہو گیا۔ تمہیں شرم آنی چاہئے اپنے شریف ماں باپ کا نام ڈبوتے ہوئے...... آئندہ سے میرے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے...... بس کچھ اسی قسم کا ہاتھ بچارے مرغ مذکور کے ساتھ بھی ہوا' اسے جھانسہ دے کر ایک خوبصورت پوز میں اس کی تصویر بنوائی گئی اور بعد میں اس کے نیچے ذبح کروائی اور کھال کھنچوائی مفت کی عبارت لکھوا کر گلی گلی محلے محلے تقسیم کیا گیا۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

مذکورہ مرغ کے ساتھ جو ہاتھ کیا گیا اس پر ہمیں ہنسی بھی آئی اور رونا بھی آیا۔ ہنسی تو اس بات پر آئی کہ بچارا غلط فہمی میں مارا گیا اور رونا اس بات پر کہ وہ تو خیر بے زبان ہے' یہ سلوک تو خود ہمارے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ ہمارے حکمران' غیر ملکی امداد دینے والے اداروں کو ہماری حالت زار کے بارے میں بتاتے ہیں اور ہمارے نام پر اربوں روپے کی امداد وصول کر لیتے ہیں' اور پھر اسے خود ہی اللوں تللوں میں اڑا دیتے ہیں' بلکہ اس امداد کے علاوہ ہمارے نام پر بھاری قرضے بھی لئے جاتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ وہ بھی افسران بالا "بالا بالا" ہی کھا جاتے ہیں بلکہ ان پر ادا کیا جانے والا سود بھی ہماری جیبوں ہی سے وصول کیا جاتا ہے' چلیں یہ تو روپے پیسوں کی بات ہوئی' امیر ملکوں کے لوگ ہم بھوکے ننگے لوگوں کے لئے اپنے جو پرانے کپڑے ہمیں بھیجتے ہیں' وہ بھی لنڈے بازار میں فروخت کر دیئے جاتے ہیں اور ہمیں رقم خرچ کر کے وہ کپڑے خریدنا پڑتے ہیں' خود ہم نے امریکہ سے وطن واپسی کے ارادے پر اپنے کپڑوں کے دو بنڈل اپنے گھر کی نکڑ پر دھرے "گڈوِل" کے بہت بڑے ڈرم میں ڈال دیئے تھے تاہم وطن واپس پہنچ کر اپنے خاص خاص دوستوں کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ کچھ عرصے تک لنڈے بازار سے کپڑے نہ خریدیں کیونکہ ہم اپنے کپڑوں کو پہچانتے ہیں۔

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ جو سلوک مذکورہ مرغ کے مہربان نے اس کے ساتھ کیا' ویسا ہی سلوک ہمارے حکمران ہمارے ساتھ کرتے ہیں' بلکہ اگر سچ پوچھیں تو ہو بہو کرتے ہیں۔ ووٹ لینے سے پہلے یہ ہمیں کلغی ٹیڑھی کر کے' پر پھلا کر اور اذان دینے کے انداز میں تصویر اتروانے کے لئے کہتے ہیں' لیکن جب کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہمیں الٹی چھری سے ذبح کرنے لگتے ہیں اور ہماری کھالیں کھینچ لیتے ہیں بلکہ الٹا احسان بھی دھرتے ہیں کہ تم سے ذبح کرائی اور کھال اتارنے کا معاوضہ نہیں لیا گیا لیکن ہمارے ہاں الیکشن کا ایسا کون سا رواج ہے کہ روز روز اس کی نوبت آتی ہو نیز اس سارے کام میں تھوڑا بہت رکھ رکھاؤ تو بہرحال موجود ہے۔ اصل تکلیف تو اس وقت ہوتی ہے جب ذبح کرنے اور کھال اتارنے سے پہلے "مرغ گرفتار" کا کوئی ناز نخرہ بھی نہیں اٹھایا جاتا' ایک دن ایک شخص ٹریفک سنگل سرخ دیکھ کر اچانک کہیں سے ہاتھ میں چھری لہراتے ہوئے نمودار ہوتا ہے اور افراد ہی نہیں

اداروں کو بھی تہہ تیغ کرتا واپس چلا جاتا ہے۔ یہ تو ہمیں کلغی ٹیڑھی کر کے 'پر پھلا کر اذان دینے کے پوز میں تصویر اتروانے کا موقع بھی نہیں دیتا کہ کوئی پتہ نہیں اس کے بعد وہ قتل ہونے کے لئے گردن نہوڑانے کی بجائے چھری والا ہاتھ ہی پکڑ لے 'ایک سردار جی کا دانت بہت بری طرح درد کرتا تھا مگر وہ دانت گنوانے کے خوف سے ہر دفعہ تکلیف برداشت کر جاتے تھے 'ایک دفعہ دوستوں کے اصرار پر وہ بالاخر دندان ساز کے پاس جانے پر تیار ہو گئے۔ دندان ساز نے اپنے اوزار تیار کئے تو سردار جی نے جیب سے شراب کی بوتل نکالی اور کہا " دو گھونٹ پینے دیں تاکہ دانت گنوانے کا خوف ذہن سے زائل ہو جائے! " دندان ساز کا سردار جی سے اتفاق ہو گیا' سردار جی نے بوتل کو منہ سے لگایا اور آدھی بوتل پینے کے بعد جھوم کر کہنے لگے "اب تم میرے دانت کو ہاتھ لگا کر تو دیکھو! " سو ہمارے معالج اس قسم کا رسک لینے کو کبھی تیار نہیں ہوتے' وہ پہلی فرصت میں مکہ مار کر ہماری بتیسی باہر نکال دیتے ہیں۔

پسپائی

کچھ لوگ تو ایسے ہٹ دھرم ہوتے ہیں کہ کسی بات پر اڑ جائیں تو پھر ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹتے خواہ دنیا ادھر کی ادھر نہ ہو جائے' مگر خدا کا شکر ہے کہ سبھی لوگ ایسے نہیں ہوتے بلکہ کچھ لوگ ہمیں ایسے بھی ملتے ہیں جو گفتگو میں بتدریج پسپائی اختیار کرتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ بالکل دیوار کے ساتھ جا لگتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ شروع میں کوئی بات بہت حتمی انداز میں کہتے ہیں' لیکن اگر اکثریت یا کوئی اکیلا مضبوط آدمی پوری شدت سے ان کی بات سے اختلاف کرے تو وہ اپنے موقف سے ایک ایک قدم پیچھے ہٹتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کا شمار "" متفقین" میں ہونے لگتا ہے۔ اس دوست سے ہونے والی چند گفتگوؤں کی تلخیص ملاحظہ فرمائیں۔

"بلے بلے بلے' غالب بھی کیا شاعر ہے' میرا خیال ہے کہ اردو میں اس سے بڑا شاعر آج تک پیدا نہیں ہوا!"

"کیا کہا! غالب اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے' تمہار دماغ تو صحیح ہے؟"

"تو کیا میں کوئی غلط بات کہہ گیا ہوں؟"

"تو گویا تمہارا خیال ہے تم صحیح کہہ رہے ہو' تم نے اقبال کو پڑھا ہے؟"

"ہاں پڑھا ہے!"

"تو اقبال' غالب سے بڑا نہیں ہے؟"

"میرا مطلب تھا کہ غزل میں غالب کا کوئی حریف نہیں"

"اقبال غزل میں بھی کسی سے کم نہیں ہے' اس کی تو نظموں میں بھی کیسا کیسا غزل کا شعر آتا ہے!"

"میرا مطلب تھا کہ انسانی جذبوں اور نفسیات کے بیان کے حوالے سے غالب بہت بڑا ہے!"

"زندگی ایک جزو کا نہیں کل کا نام ہے اور اقبال کل کا شاعر ہے!"

"اصل میں غالب اور اقبال اردو شاعری کے دو دیو ہیں' ان کا باہمی مقابلہ مناسب ہی نہیں!"

"کیوں مناسب نہیں...... اقبال کے ہاں جو ترفع ہے' وہ پوری دنیا میں گنتی کے چند عظیم شاعروں کے ہاں ملتا ہے اور تم اس کا موازنہ غالب سے کر رہے ہو!"

"اقبال تو واقعی پوری اردو شاعری میں ایک الگ تھلگ اور انتہائی توانا آواز ہے۔ میرا مطلب تھا کہ اگر میر اور

غالب کا موازنہ کیا جائے تو بلاشبہ غالب بہت بڑا نظر آتا ہے!"

"یار تم گھاس تو نہیں چر گئے غالب کا میر سے کیا مقابلہ، غم بڑی شاعری کا سرچشمہ ہوتا ہے میر کے غم اصلی ہیں، غالب کے نقلی، تبھی تو وہ انہیں فلسفیانہ رنگ بھی دے لیتا ہے اور یوں اس میں سے غم کی کسک بھی جاتی رہتی ہے!"

"یہ تو خیر تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن میرا خیال ہے کہ غالب، ذوق سے بہر حال بڑا شاعر ہے!"

"غالب، ذوق سے بڑا ہے، لگتا ہے تم نے ذوق کو پڑھا ہی نہیں!"

"ہاں یار! ذوق کو واقعی پڑھا تو نہیں ہے، ممکن ہے ذوق واقعی غالب سے بڑا ہو، چلو مٹی ڈالو اس موضوع پر، کوئی اور بات کرتے ہیں!"

اسی دوست کے ساتھ ایک اور مکالمہ!

"پاکستان کو چاہئے کہ افغان مہاجرین کو اپنی سرزمین سے نکل جانے کا حکم دے کیونکہ اس سے پاکستان کی اپنی سالمیت خطرے میں پڑ گئی ہے!"

"پاکستان دنیا بھر میں مسلمانوں کا ملک ہے لہٰذا افغان مسلمانوں کو یہاں سے نہیں نکالا جا سکتا!"

"خواہ اس سے ملکی سالمیت ہی خطرے میں کیوں نہ پڑ جائے؟"

"یہ تم سے کس نے کہا ہے کہ افغان مہاجرین کی وجہ سے پاکستان خطرے میں ہے، روس کی اصل منزل پاکستان ہے، افغان مجاہدین اپنی جدوجہد سے اسے افغانستان سے آگے نہیں آنے دے رہے، بلکہ وہاں بھی اس کا جینا مشکل کیا ہوا ہے!"

"میرا مطلب تھا کہ افغان مہاجرین کو پناہ ضرور دینی چاہئے لیکن ان کی اتنی حمایت نہیں کرنا چاہئے کہ روس ناراض ہو کر ہم پر چڑھ دوڑے!"

"یہ تم کیسی احمقانہ باتیں کر رہے ہو، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ وغیرہ نے افغان مہاجرین کو پناہ دی تھی جو روس ان پر چڑھ دوڑا تھا! طاقتور ملک صرف کمزور ملکوں پر چڑھائی کرتے ہیں، ہمیں اگر چاہئے تو صرف یہ کہ خود کو مضبوط بنائیں!"

"ہم خواہ جتنے مرضی مضبوط ہو جائیں روس کا مقابلہ تو بہر حال نہیں کر سکتے؟"

"اگر ویت نامی امریکہ کو اور افغانی روس کو ناک چنے چبوا سکتے ہیں تو بوقت ضرورت اسی عزم اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے ہم اپنے ملک کا دفاع کیوں نہیں کر سکتے...... تم جیسے اندر سے سہمے ہوئے لوگ قوم کو حوصلہ اور توانائی دینے کی بجائے انہیں بزدل بناتے ہیں اور ڈیمارالائز کرتے ہیں! قوم اگر خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، تو اسے تیار کرنا چاہئے مگر تم اسے خطرات کے مقابلے سے پہلے ہی ہتھیار ڈالنے پر مائل کر رہے ہو!"

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے، تم تو جانتے ہی ہو میں روس کو ایک استعماری طاقت سمجھتا ہوں اور یہ استعماری طاقت

اندر سے چوہے کی طرح بزدل ہوتی ہے چنانچہ روس کو بھی بہرحال افغانستان سے نکلنا ہو گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کو افغان مجاہدین کے شانہ بہ شانہ جہاد میں حصہ لینا چاہیے!"

"خیر' یہ بھی ممکن نہیں ہے' ہم اپنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتے!"

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو افغان مجاہدین پاکستان کی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں' ہمیں پوری استقامت کے ساتھ ان کی حمایت کرنا چاہیے اور پسپائی بالکل اختیار نہیں کرنا چاہیے!"

بھلے مانس اور وضعدار

ہم کالم کے آغاز ہی میں اپنے ڈاکو بھائیوں سے معذرت خواہ ہیں اور ان پر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ان سطور سے مقصود ان کی دل آزاری یا خدانخواستہ ان کی نیک شہرت کو نقصان پہنچانا نہیں' بلکہ ماضی پرست ہونے کی وجہ سے پرانی یادوں کو تازہ کرنا اور بعض کلاسیکی روایات کی گمشدگی پر اظہار افسوس کرنا ہے۔ دراصل ایک عرصے سے روزانہ صبح اخبار ہاتھ میں تھامتے ہی دو تین ڈکیتیوں کی خبریں نظر سے گزرتی ہیں مثلاً یہ کہ چلتی فلائنگ کوچ میں مسافروں کو پستول دکھا کر لوٹ لینا' دن دہاڑے کسی گھر میں داخل ہونا اور اہل خانہ کو ڈرا دھمکا کر زیور کپڑے لے جانا' یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات اس لحاظ سے تو خوش آئند ہیں کہ پوری قوم اگرچہ بے عمل ہے' مگر کم از کم ڈاکوؤں کا طبقہ تو پوری طرح سرگرم عمل ہے اور داد شجاعت دینے میں مشغول ہے' لیکن جس دکھ کے اظہار کے لئے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں' وہ چوروں کے بالکل ناپید ہونے کے حوالے سے ہے' ڈاکو اپنی سرگرمیاں شوق سے جاری رکھیں' حکومت کی طرح ہمیں بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن معاشرے سے چوروں کا یکایک اور مکمل طور پر ناپید ہو جانا اور ان کی جگہ ڈاکوؤں کا لے لینا بہت افسوسناک بات ہے۔ یہ موضوع اگرچہ انتظار حسین کا ہے اور ہمیں امید تھی کہ وہ اس پرانے انسٹی ٹیوشن کے زوال کا نوحہ پڑھیں گے لیکن جس طرح دوسروں کا کام بسا اوقات انہیں کرنا پڑتا ہے' اسی طرح ان کا یہ کام ہمیں کرنا پڑ رہا ہے' تاہم ایک دفعہ پھر ہم ڈاکوؤں سے التماس کریں گے کہ وہ ہمارے اس کالم کو "پرسنل" نہ لے لیں کیونکہ ہمارا یہ کالم محض اصولی نوعیت کا ہے اور اگر انہیں ہمارے کسی نکتے سے اختلاف ہو تو اپنا نقطہ نظر لکھ بھیجیں جو ہم پوری دیانت داری سے شائع کر دیں گے' اپنے موقف کی وضاحت کے لئے انہیں ہمارے غریب خانے پر آنے کی ضرورت نہیں کہ جہاں ہم رہتے ہیں' ایک تو وہ جگہ شہر سے کافی دور ہے' اس کی سڑکیں بھی ٹوٹی پھوٹی ہیں اور جس مکان میں ہم رہتے ہیں' وہ قرضے سے بنا ہے' لہٰذا انہیں خواہ مخواہ زحمت ہو گی!

دراصل بات یہ ہے کہ بھلے وقتوں میں ڈاکوؤں کے علاوہ چور بھی ہوا کرتے تھے مگر ہم نے ان شریف النفس لوگوں کی قدر نہیں کی اور یوں ناقدری زمانہ سے یہ اہل فن آہستہ آہستہ ناپید ہوتے چلے گئے۔ یہ لوگ اہل فن ہی نہیں وضع دار بھی تھے' دن کے وقت شرفاء کی بستیوں کا رخ نہیں کرتے تھے' جب آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ہوتی یہ اپنی کمین گاہوں سے نکلتے اور رفع شر کے لئے کوئی چاقو وغیرہ نیفے میں اڑس لیتے تاہم ان کی رحم دلی اور خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ گھروں کے باہر بندھے ہوئے کتوں کے لئے گوشت وغیرہ ساتھ لے کر آتے۔ نیز

جس گھر میں بھی داخل ہوتے 'اس امر کا خاص خیال رکھتے کہ اہل خانہ کی نیند میں کوئی خلل نہ پڑے 'چنانچہ دبے پاؤں چور دروازے سے گھر میں داخل ہوتے اس کی بتی تک نہ جلاتے کہ دوسروں کی پرائیوسی مجروح نہ ہو' گھر کے مالک کو جگا کر اس سے سیف وغیرہ کی چابیاں تک طلب نہ کرتے کہ بچارا سارے دن کا تھکا ماندہ آرام کر رہا ہے 'چنانچہ اندھیرے میں خود ہی ٹانک ٹوئیاں مارتے 'اگر کچھ ہاتھ لگ جاتا تو ساتھ لے جاتے 'بصورت دیگر صبر شکر کرکے لوٹ جاتے۔ یہ وضع دار لوگ جنہیں ہم چور کہتے تھے 'اتنے شریف النفس تھے کہ اگر تمام تر احتیاط کے باوجود اہل خانہ کی آنکھ کھل جاتی تو اپنے اس فعل پر اس قدر نادم ہوتے کہ اہل خانہ سے آنکھیں چراتے پھرتے اور کوشش کرتے کہ جلد سے جلد اس مکان سے نکل جائیں جس کے مکینوں کی نیند میں ان کی وجہ سے خلل پڑا ہے 'بعض نازک مزاج قسم کے اہل خانہ اگر ان سے تعرض کرنے کی کوشش کرتے تو بھی ان شریف النفس لوگوں کی کوشش یہی ہوتی کہ بغیر کسی کو زک پہنچائے وہاں سے نکل جائیں 'تاہم دوسرے فریق کی ناسمجھی کی وجہ سے کبھی کبھار کوئی ناخوشگوار سی صورتحال بھی پیدا ہو جاتی 'جس کی ذمہ داری ان وضع دار لوگوں پر بہر حال عائد نہیں ہوتی تھی!

اور اب صورتحال یہ ہے کہ معاشرے سے یہ بھلا مانس طبقہ رفتہ رفتہ ناپید ہو گیا ہے اور اس کی جگہ ڈاکوؤں نے لے لی ہے۔ یہ لوگ کسی بھی سہانی شام کو کسی بھی گھر میں داخل ہوتے ہیں 'ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف ہوتی ہیں اور وہ اہل خانہ کو ہینڈز اپ کرا دیتے ہیں اور انہیں اتنا خوفزدہ کر دیتے ہیں کہ ان کا دھیان ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے ڈرامے سے ہٹ جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے دوست سرور سکھیرا کے ہاں شام سات بجے ڈاکو آئے 'وہ اپنے بچوں اور سری نگر سے آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ وی سی آر پر فلم "نصیب اپنا اپنا" دیکھ رہے تھے 'جو وہ اس کے بعد نہ دیکھ سکے اور یوں انہیں خواہ مخواہ فلم کا دس روپے کرایہ پڑ گیا۔ اسی طرح غالباً شادمان کالونی کے ایک گھر میں خواتین ایک شادی میں شرکت کے لئے زیورات پہنے گھر سے نکلنے ہی کو تھیں کہ ڈاکو گھر کے اندر داخل ہو گئے اور ان کے زیورات اتار لئے 'چنانچہ وہ بچاری شادی کی تقریب میں شرکت نہ کر سکیں اور یوں دولہا دلہن بھی اس سلامی کی رقم سے خواہ مخواہ محروم ہو گئے جو انہیں ان خواتین سے موصول ہونا تھی! تاہم ان چھوٹے موٹے نقصانات سے قطع نظر ڈاکو ہمارے معاشرے کے مفید رکن ہیں اور معاشرے میں ان کا بہت اعلیٰ مقام ہے 'ہم نے ان ڈاکوؤں کی عزت و تکریم کے جو مناظر دیکھے ہیں 'اس سے کئی دفعہ دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم لٹنے والے میں شامل ہونے کی بجائے لوٹنے والے طبقے میں شامل کیوں نہ ہو گئے۔ بہر حال یہ باتیں تو بر سبیل تذکرہ درمیاں میں آ گئیں 'ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ڈاکو ہماری سر آنکھوں پر 'مگر چوروں کا سرے سے ناپید ہو جانا ہم جیسے روایت پسند شخص کو پسند نہیں کہ اپنی چھوٹی موٹی شخصی خامیوں کے باوجود یہ لوگ بہر حال بڑے شریف النفس 'بھلے مانس اور وضع دار تھے!

پس نوشت = یہ کالم ہم یہاں ختم کر چکے تھے کہ ہمارے ایک دوست آ گئے اور انہوں نے ایک نظر کالم پر ڈال کر ناک بھوں چڑھایا اور کہا " یہ تم کن "چیپ" قسم کے مسائل پر لکھتے رہتے ہو 'اگر لکھنا ہے تو موجودہ

حکومت کے خلاف لکھو کہ ساری برائیوں کی ذمہ دار بہرحال حکومت ہوتی ہے!" مگر ہم نے صاف انکار کر دیا اور کہا "موجودہ حکومت کے خلاف لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!" یہ سن کر دوست نے خشمگیں نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور کہا "تو گویا تم بھی بک گئے ہو!" ہم نے ضبط سے کام لیتے ہوئے جواب دیا "تم جو چاہو کہو، مگر موجودہ حکومت کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ یہ ایک شریف النفس، بھلی مانس اور وضع دار حکومت ہے، چنانچہ ہم اس کے خلاف نہیں لکھیں گے کیونکہ عاقل کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کے نتیجے میں اسے بعد میں پچھتانا پڑے ۔ خدا کرے ہمارے دوست کو یہ بات سمجھ آ گئی ہو!

جامہ تلاشی

ہم جب کبھی جہاز پر سفر کرتے ہیں بس یوں سمجھیں کہ ہربار ایک احساس ندامت سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس لئے نہیں کہ جہاز پر سفر کی آسائش سب کو حاصل کیوں نہیں؟ بلکہ اس لئے کہ سکیورٹی والے تلاشی بہت لیتے ہیں۔ تلاشی سے فراغت کے بعد ہم ہربار آئینے میں اپنی شکل دیکھتے ہیں اور یقین جانیں ہم کچھ اتنے زیادہ مشکوک نہیں لگتے کہ سکیورٹی والوں کو اتنی کاوش کے ساتھ ہماری تلاشی لینے کی ضرورت محسوس ہو دوسرے ہمیں اس "میٹل ڈی ٹیکٹر" کی بھی سمجھ نہیں آتی جو سکیورٹی والوں کے ہاتھ میں ہو تو خاموش ہوتا ہے لیکن جب ہمارے جسم سے مس ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے ہم نے جیب میں توپ نصب کی ہو، ہمیں اس جاسوس آلے پر اس لئے بھی غصہ زیادہ ہے کہ اس کا سارا شور و غوغا بے بنیاد ہوتا ہے یعنی جیب میں میٹل کی کوئی چیز نہ بھی ہو تو اتنا واویلا کرتا ہے کہ کیبن کے پاس کھڑا گن مین اپنی پوزیشن سنبھال لیتا ہے۔ ایک دفعہ کچھ اسی قسم کی صورتحال میں سکیورٹی والے نے ہمیں جیب سے سب کچھ نکالنے کو کہا جبکہ جیب میں صرف ایک کاغذ تھا جس پر نوابزادہ نصراللہ کی تازہ غزل درج تھی، چنانچہ سچ پوچھیں تو ہمیں یہ میٹل ڈی ٹیکٹر اور بھارت دونوں ہمزاد لگتے ہیں جو ہر وقت خطرے کی دہائی دینے میں لگے رہتے ہیں!

چلیں اس جاسوس آلے کو تو دفعہ کریں کہ صرف شور ہی تو مچاتا ہے لیکن اس کی عدم موجودگی میں سکیورٹی والے جب ہاتھوں سے تلاشی لیتے ہیں اور پورے جسم کا کونہ کھدرا چھان مارتے ہیں اس وقت مختلف قسم کی ندامتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے مثلاً کئی دفعہ ان کے ہاتھ لگانے سے ہمیں اتنی گدگدی محسوس ہوئی کہ ہماری ہنسی روکے نہیں رکتی تھی نیز بعض صورتیں ایسی ہیں کہ کبھی ہمیں ندامت ہوتی ہے اور کبھی بیچارے سکیورٹی والے نادم ہو کر رہ جاتے ہیں یعنی۔

آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

والی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے، سکیورٹی والوں کی دوسری ندامتوں کے علاوہ ایک ندامت یہ ہے کہ وہ ہم جیسے گنہگار کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور ہمیں ندامت اپنی طبعی منکسرالمزاجی کی وجہ سے ہوتی ہے حالانکہ اب تک ہمیں اس کا عادی ہو جانا چاہئے کیونکہ صدیوں سے ہمارے بزرگوں کے گھٹنے ازراہ عقیدت چھوئے جا رہے ہیں اور یوں ہمیں سکیورٹی والوں کے اس عمل کو شک کی نگاہوں سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ سکیورٹی والے تو اپنے اس "دھندے" میں اتنے فرض شناس واقع ہوئے ہیں کہ گذشتہ دنوں انہوں نے بغرض تلاشی

مولانا شاہ احمد نورانی کی دستار اتار لی تھی جس پر مولانا بہت ناراض ہوئے کیونکہ یہ دوسرا موقع تھا جب ان کی دستار بھی اتاری گئی ویسے ممکن ہے دستار اتارتے وقت سکیورٹی والوں کا مقصد تلاشی لینا نہ ہو بلکہ ایسا کرتے وقت انہوں نے مولانا کو مخاطب کر کے بزبان حال یہ پڑھا ہو۔

آپ دستار اتاریں تو کوئی فیصلہ ہو
لوگ کہتے ہیں کہ سر ہوتے ہیں دستاروں میں

یعنی سر تو دستار کے نیچے ہوتے ہی لیکن وہ اس سر کی زیارت کرنا چاہتے ہوں جس میں اتحاد بین المسلمین کا سودا سمایا ہوا ہے۔ تاہم مولانا کی ناراضگی اپنی طور پر بجا تھی کیونکہ یہ تو خوشی کے سودے ہوتے ہیں۔ اس میں زبردستی نہیں چلتی۔ چنانچہ گذشتہ ایک ہفتے سے سول ایوی ایشن اور ایئرپورٹ سکیورٹی فورس کے درمیان اسی ایک بات پر ٹھنی ہوئی ہے' سول ایوی ایشن والے کہتے ہیں کہ ہم تلاشی نہیں دیں گے اور سکیورٹی والے کہتے ہیں کہ ہم تلاشی ضرور لیں گے اور یوں اس جھگڑے کے نتیجے میں پی آئی اے کی تین فلائٹیں فیصل آباد ایئرپورٹ پر اتر نہیں سکیں اور انہیں واپس لاہور ایئرپورٹ پر لانا پڑا۔

اوپر کی سطور سے ممکن ہے قارئین کو یہ تاثر ملا ہو کہ ہم اس جامہ تلاشی کے خلاف ہیں۔ حاشا وکلا ایسا نہیں ہے ہم مکمل طور پر اس جامہ تلاشی کے حق میں ہیں بلکہ ہمارے دوست اجمل نیازی تو اس ضمن میں ہم سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ گذشتہ روز ملتان جانے کے لئے ہم ایئرپورٹ پہنچے تو اجمل نیازی بھی ہمارے ہمراہ تھے ایک دفعہ تلاشی دینے کے بعد لاؤنج میں آئے تو سکیورٹی والوں سے اجازت لے کر دوبارہ بریفنگ ہال میں چلے گئے کہ میں اپنا بریف کیس وہاں بھول آیا ہوں۔ واپسی پر ایک بار پھر تلاشی دی' تھوڑی دیر بعد وہ پھر اجازت لے کر باہر گئے کہ ایک دوست کو باہر کھڑا کیا تھا' اسے کہہ آؤں کہ وہ واپس چلا جائے اور یوں لاؤنج میں لوٹتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر تلاشی دی لیکن جب وہ تیسری دفعہ باہر جانے لگے تو ہم نے انہیں روک لیا اور کہا "خان صاحب! یہ کیوں آپ بہانے بہانے باہر جاتے ہیں اور پھر واپس آتے ہیں"۔ کہنے لگے "سچی بات بتاؤں" ہم نے کہا "بتاؤ" بولے "تلاشی دیتے ہوئے مزا بہت آتا ہے' جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی ہے ایسے لگتا ہے کہ کوئی ہلکے ہلکے مساج کر رہا ہو!" آئندہ وہ لنگوٹ بند ہو کر ہوائی سفر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے ابھی عرض کیا کہ ہم اس جامہ تلاشی کے حق میں ہیں لیکن حق بات تو یہ ہے کہ صرف جامہ تلاشی کافی نہیں اور نیز یہ کہ جامہ تلاشی کا عمل صرف ایئرپورٹ کے مسافروں تک محدود نہیں رہنا چاہئے بلکہ اس کا دائرہ وسیع کر کے زندگی کے مختلف شعبوں تک پھیلا دینا چاہئے۔ مثلاً کوئی ایسا طریقہ کار دریافت کرنا چاہئے کہ صاحبان اقتدار کے ذہن کی "جامہ تلاشی" ہو سکے تاکہ لوگوں کو پتہ چل سکے کہ ان کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہے وہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ اسی طرح اپوزیشن کے رہنماؤں کی ذہنی جامہ تلاشی بھی بہت ضروری ہے تاکہ فرائی پین سے نکل کر چولھے میں گرنے کی نوبت نہ آئے۔ اخباروں میں چھپنے والے اداریوں' تبصروں' کالموں اور خبروں کی جامہ تلاشی بھی ہونی چاہئے' یقینی جانیں کرائے کے تخریب کار رنگے ہاتھوں پکڑے

جائیں گے۔ غرضیکہ یہ جامہ تلاشی زندگی کے ہر شعبے میں بہت ضروری ہے اس پر بہت دنگا فساد ہو گا لڑائی مار کٹائی کی نوبت بھی آ سکتی ہے لیکن اس جامہ تلاشی کا عمل مکمل ہونے کے بعد ہر طرف سکون ہی سکون ہو گا اور اس کے نتیجے میں کوئی ہائی جیکر ہمارے ملک اور ہماری قوم کو ہائی جیک نہیں کر سکے گا۔ کوئی "عامل" ایک دفعہ جامہ تلاشی کا یہ "عمل" کر کے تو دیکھے!

مایوس مریض

گذشتہ کچھ عرصے سے ہمیں اپنے بارے میں یہ شبہ سا ہو چلا ہے کہ ہم نفسیاتی عوارض کا شکار ہو رہے ہیں' دوستوں سے اس سلسلے میں بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں تمہاری اردو کمزور ہے کیونکہ جسے تم شبہ قرار دے رہے ہو' اس کے لئے اردو میں صحیح لفظ "یقین" ہے چنانچہ اب ہم اپنا درد دل ان کے سامنے بیان ہی نہیں کرتے کہ جواب میں ان سے "جگتیں" ہی سننا ہیں۔ اخبار میں کالم لکھنے کے خفیہ فوائد کے علاوہ ظاہری فائدہ یہ ہے کہ کالم نگار جب چاہے اپنے قارئین کو اپنے دکھ درد میں شریک کر سکتا ہے اور اگر خوشگوار موڈ میں ہے تو انہیں اپنی ہنسی میں بھی شریک کر لیتا ہے' یہ کالم ہم اپنی پریشانی کے اظہار کے لئے لکھ رہے ہیں اور پریشانی وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے یعنی ہم آہستہ آہستہ نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہیں' چنانچہ اب ہم باقاعدگی سے ٹیلی ویژن پر ڈاکٹر افتخار کا پروگرام دیکھتے ہیں جس میں وہ کسی مہمان ڈاکٹر سے بیماریوں کے متعلق گفتگو کرتے ہیں' ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ فقرے کی ساخت میں کچھ گڑبڑ ہو گئی کیونکہ کہنا ہم یہ چاہتے تھے کہ ٹیلی ویژن پر بیماریوں والا پروگرام ہم نے پہلے دیکھنا شروع کیا اور بیمار اس کے بعد ہوئے اور وہ اس طرح کہ اب جس بیماری کے متعلق گفتگو سنتے ہیں' اس کی علامات کچھ دنوں بعد ہم میں ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں!

ہمارے خیال میں یہ بات قدرے تفصیل طلب ہے' سو اس کی تھوڑی بہت تفصیل تو بیان کرنا ہی پڑے گی' مثلاً کچھ عرصہ پیشتر ہم نے ذیابیطس کے بارے میں ایک گفتگو سنی' ڈاکٹر صاحب بتا رہے تھے کہ ذیابیطس کے مریض کو پیاس زیادہ لگتی ہے' پیشاب کثرت سے آتا ہے اور کثیر تعداد میں آتا ہے' بھوک بہت زیادہ لگتی ہے اور پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے باوجود مریض کو کمزوری سی محسوس ہوتی ہے' جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکلتی رہتی ہیں اور ہاتھ پیر اکثر بے جان محسوس ہوتے ہیں' یہ گفتگو سن کر ہم چونکے اور ہمیں یاد آیا کہ ان میں سے کچھ علامات تو ہم میں موجود ہیں چنانچہ کئی دفعہ ہمیں بہت سخت بھوک بھی محسوس ہوئی' بسا اوقات ہم نے خود کو کمزور بھی محسوس کیا اور اس کے کچھ دنوں بعد جب باقی ماندہ علامات بھی ایک ایک کر کے ظاہر ہونا شروع ہو گئیں تو ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم ذیابیطس کے مریض ہیں۔ اس سے اگلے ہفتے ہم نے امراض قلب کے بارے میں ایک گفتگو سنی اور کچھ ہی دنوں بعد ڈاکٹر صاحب کی بیان کردہ تمام علامات ایک ایک کر کے ہم میں ظاہر ہونا شروع ہو گئیں یعنی سانس پھولنا شروع ہو گیا' دل کی جگہ درد رہنے لگا' دل نے تیزی سے دھڑکنا شروع کر دیا' ہاتھ پاؤں پر سوجن محسوس ہونے لگی جو صرف ہم ہی کو نظر آتی تھی اور یوں ہمیں اپنی دنیا اندھیر نظر آنے لگی۔ تاہم اس میں ایک چارم یہ تھا کہ یہ بیماری' بیماری کم

اور سٹیٹس سمبل زیادہ ہے۔ انہی دنوں ہم نے منیر احمد شیخ کا رپور تاژ " آپریشن بائی پاس " بھی پڑھا جس میں لندن کے ہسپتال میں آپریشن کے چند دنوں بعد مسیحا ہاتھوں سے غسل صحت دیئے جانے کا احوال تھا' سو پریشانی کے باوجود دل کو کچھ ڈھارس بھی بندھی' مگر پھر ہم نے ایک گفتگو کینسر کے بارے میں سن لی' جس میں بیان کردہ علامات کے عین مطابق ہمیں محسوس ہوا کہ ہمیں بھوک لگنا بند ہو گئی ہے اور وزن ایک دم کم ہونا شروع ہو گیا ہے سو اب صورتحال یہ ہے کہ ہم ہر ہفتے خود کو اس بیماری میں مبتلا محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں' جس کی علامات ڈاکٹر صاحب بیان کرتے ہیں چنانچہ اب ہماری عمر مختلف قسم کے ٹیسٹ کروانے میں بسر ہو رہی ہے اور یوں انسان کم اور تجربہ گاہ زیادہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہمارے دوستوں میں ایک مہربان دوست ڈاکٹر یٰسین بھی ہیں' ایک روز اتنی ساری بیماریوں کی یلغار سے گھبرا کر ہم نے ان کی طرف رجوع کیا ہم نے انہیں بتایا کہ ہم ذیابیطس عارضہ قلب اور کینسر وغیرہ میں مبتلا ہیں' بے شمار ٹیسٹ کروا چکے ہیں لیکن بیماری ایک بھی دریافت نہیں ہوئی' ڈاکٹر یٰسین ہماری بات سن کر ہنسنے لگے اور کہنے لگے "برادر! آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے' یہ آپ کا وہم ہے اور یہ ذرائع ابلاغ کا پیدا کردہ ہے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے بیماریوں کی وسیع پیمانے پر تشہیر کر کے عوام میں ایک دہشت پھیلائی جا رہی ہے' ایک مختصر سے مضمون یا پندرہ بیس منٹ کے ریڈیو ٹی وی پروگرام میں بیماری کی علامات کا ادھورا بیان ہوتا ہے جو اس علم سے غیر وابستہ لوگوں میں خوف پیدا کر سکتا ہے خصوصاً اس صورت میں جب بیماریوں کا ذکر عام ہو اور علاج کی سہولتیں نایاب ہوں اور یوں ہم لوگ ہر وقت ایک نادیدہ خطرے کے خوف سے دوچار رہتے ہیں تاہم عوام الناس کو چاہئے کہ وہ نہ تو خواہ مخواہ خوف میں مبتلا ہوں اور نہ اپنی صحت کے بارے میں لاپرواہی برتیں' کیونکہ پراپیگنڈے سے مرعوب ہو جانا یا حقیقت سے آنکھیں بند کر لینا' دونوں خطرناک چیزیں ہیں ہر بیماری کو وہم اور ہر وہم کو بیماری نہیں سمجھنا چاہئے اتنا کہہ کر انہوں نے اپنی میز پر سے اخبارات کا پلندہ اٹھایا اور ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ قومی سلامتی کے حوالے سے بھی کچھ عرصے سے ہمارے مسیحاؤں نے یہی وتیرہ اپنایا ہوا ہے' یہ اخبارات پڑھ کر دیکھیں ان میں "معالج سیاستدان چیختی چنگھاڑتی سرخیوں کے ساتھ موجود ہیں جو ملک توڑنے کی باتیں کر رہے ہیں' جس سے عوام ملک کے مستقبل کے بارے میں شدید مایوسی کا شکار ہو رہے ہیں اور اگر آپ نے اقبال کو پڑھا ہے تو آپ جانتے ہیں کہ یقین سے محروم قوم اپنے وقت سے پہلے مر جاتی ہے۔ ہم بہت انتہا پسند لوگ ہیں' ایک عرصے تک "سب ٹھیک ہے" کا نعرہ لگاتے رہے اور اب ہم مکمل طور پر مایوسی کا پرچار کر رہے ہیں' جس کے نتیجے میں پوری قوم آہستہ آہستہ نفسیاتی مریض بنتی جا رہی ہے اور اسے اپنی موت سامنے نظر آ رہی ہے۔ موت مایوسی کا نام ہے' اور زندگی یقین کا! آپ اہل قلم ہیں۔ خود بھی مایوسی سے نکلیں اور قوم کو بھی مایوسی سے نکالیں۔ آپ کے سارے ٹیسٹ ٹھیک نکلے ہیں۔ قوم بھی بہت سارے امتحانوں سے کامیابی سے گزر چکی ہے۔ اب فیصلہ آپ کے شک یا یقین نے کرنا ہے کہ آپ نے مرنا ہے یا جینا ہے کیونکہ۔

زندگی تے موت جوگی دونویں ای کوئی چیز نیں
خیال نال موت اے' خیال نال زندگی

۳۰ ستمبر ۸۶ء

ایک داخلے کا سوال ہے

ان دنوں برسات اور داخلوں کا موسم ہے' چنانچہ ایک تو پسینہ بہت آتا ہے اور دوسرے داخلے کے امیدوار بہت آتے ہیں اصولاً تو سب امیدواروں کو براہ راست متعلقہ کالجوں کے پرنسپل صاحبان کے پاس جانا چاہئے' لیکن پرنسپل صاحبان ان دنوں اپنی پرنسپلی سے بیزار بیٹھے ہیں' چنانچہ یار لوگ واقفیتیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور پھر بالآخر کسی ایسے شخص کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو ان کی مشکل آسان کر سکے۔ داخلے کے امیدوار اکیلے نہیں آتے بلکہ اپنے کسی بڑے کے ساتھ آتے ہیں اور اس "بڑے" کی باتیں دہی بڑے کی طرح مزیدار ہوتی ہیں۔ یہ گفتگو اگر نکتہ وار بیان کی جائے تو کچھ اس طرح ہوتی ہے۔

۱۔ میرا بیٹا ماشاءاللہ بہت ذہین ہے۔

۲۔ مگر پچھلے دنوں ذرا بیمار رہا ہے۔

۳۔ جس کی وجہ سے نمبر کچھ کم آئے ہیں۔

۴۔ امتحان تو آرٹس میں پاس کیا ہے۔

۵۔ مگر داخلہ میڈیکل میں لینا چاہتا ہے۔

۶۔ آپ ایک دفعہ داخل کروا دیں ساری کمی پوری کر لے گا۔

کم نمبروں والے والدین کی یہ گفتگو ہمیں اتنی اچھی طرح ازبر ہو گئی ہے کہ ہم ان والدین کی ادھوری بات مکمل کر دیتے ہیں جس سے وہ حیران ہو جاتے ہیں اور ہمیں استاد کم اور نجومی زیادہ سمجھنے لگتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ روز ایک صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے "بیٹے کو کالج میں داخل کرانا ہے" اس کے بعد ہم نے انہیں بات نہیں کرنے دی اور کہا ماشاءاللہ خاصا ذہین ہو گا کہنے لگے "بالکل بالکل" ہم نے "مگر گذشتہ دنوں ذرا بیمار شیمار رہا ہو گا؟" بولے "بالکل' مگر آپ کو کیسے پتہ چلا؟" ہم نے کہا "اس کی وجہ سے نمبر کچھ کم آئے ہوں گے؟" کہنے لگے "واللہ یہی معاملہ ہے" ہم نے کہا "امتحان آرٹس میں پاس کیا ہے۔ داخلہ میڈیکل میں لینا چاہتا ہو گا؟" اس پر حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹی پھٹی کی رہ گئیں۔ مگر ہم نے انہیں بولنے کا موقع نہ دیا اور کہا "داخلے کے بعد انشاءاللہ وہ ساری کمی پوری کر لے گا!" بس یہ سن کر انہوں نے ہمارے پاؤں چھو لئے اور کہنے لگے "آپ کو تو سب کچھ پتہ ہے۔ فرمایئے بچے کو کب بھیجوں" ہم نے کہا "بچے کو بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے ذہین بچے کے لئے تو پرنسپل صاحب کو خود چل کر آپ کے پاس آنا چاہئے۔ آپ یہ ہیرا اس طرح نہ

رولیں کیونکہ "ایہہ پتر ہٹاں تے نیئں وِکدے !" چنانچہ یہ صاحب ہمارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ان دنوں گھر پر پرنسپل صاحب کا انتظار کر رہے ہیں بلکہ انہوں نے بیٹے کو بھی سختی سے سمجھا دیا ہے کہ کہیں اپنے آپ منہ اٹھا کر داخلے کے لئے نہ چلے جانا!

مگر سارے سفارشی حضرات ان صاحب کی طرح شریف النفس نہیں ہوتے' بلکہ ان میں سے بیشتر میں تو لسوڑے کی صفات پائی جاتی ہیں۔ یہ اپنے برخودار کے کوائف بتاتے ہیں۔ جس کے جواب میں انہیں پوری تفصیل سے بتایا جاتا ہے کہ یہ بچہ اگر داخل ہو بھی گیا' تو ایف اے سے آگے نہیں جا سکے گا۔ وہ صاحب آپ کے ایک ایک نکتے سے اتفاق کرتے چلے جاتے ہیں مگر آخر میں کہتے ہیں کہ بچے کی ضد ہے پوری تو کرنی ہے اس کے بعد انہیں وہ مشکلات بیان کی جاتی ہیں جو اس ہونہار کے داخلے کے ضمن میں درپیش ہیں۔ بلکہ مناسب لفظوں میں یہ بھی سمجھا دیا جاتا ہے کہ یہ داخلہ قریباً ناممکن ہے۔ وہ صاحب یہاں بھی پوری طرح اتفاق کا اظہار کرتے ہیں مگر آخر میں کہتے یہی ہیں کہ جناب بچے کو داخل بہرحال ہونا ہے اور یہ آپ ہی نے کرانا ہے۔

ویسے یہ ساری تفصیل جو ہم نے اب تک بیان کی ہے اس لحاظ سے آؤٹ آف ڈیٹ ہے کہ کچھ عرصے سے سفارشی حضرات کو پرنسپل یا پرنسپل کے متعلقین سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے انہیں کسی وزیر' ایم پی اے' ایم این اے یا کالج یونین کے کسی عہدیدار کی سفارش ڈھونڈنا پڑتی ہے اور تو اور گذشتہ ہفتے ایک کالج کے پرنسپل ہمارے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے "میں نے اپنے بھانجے کو کالج میں داخل کرانا ہے کوئی سفارش ہے؟" ہم نے کہا "جناب آپ اپنے کالج میں داخل کر لیں!" بولے "اپنے کالج ہی میں داخل کرانا ہے' اسی کے لئے سفارش تلاش کر رہا ہوں!" ہم نے حیران ہو کر پوچھا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" کہنے لگے "صحیح کہہ رہا ہوں۔ میرے کلرک نے مجھے بتایا ہے کہ داخلے پورے ہو گئے ہیں' اب مزید کی گنجائش نہیں۔ میں نے اس سے تفصیل پوچھی تو اس نے وزراء' ایم پی ایز' ایم این ایز' یونین کے عہدیداران اور اے جی آفس سے آئے ہوئے سفارشی رقعوں کی علیحدہ علیحدہ فائلیں میرے سامنے رکھ دیں تب اندازہ ہوا کہ داخلے واقعی پورے ہو چکے ہیں تاہم مزید داخلہ ہو سکتا ہے مگر یہ انہی میں سے کسی کی سفارش سے ہو گا۔ تمہاری کوئی واقفیت ہے؟" ہم نے کہا "واقفیت بھی ڈھونڈ لیں گے' مگر آپ سے کس نے کہا ہے کہ آپ یہ سفارشیں ضرور مانیں؟" کہنے لگے "کہا تو کسی نے نہیں مگر جب اسمبلی میں میرے خلاف تحریک پیش ہو گی' یا کالج میں ہنگامہ ہو گا یا میری اور میرے اساتذہ کی تنخواہیں رک جائیں گی اس وقت مجھ سے ضرور کچھ کہا جائے گا۔ لہٰذا اب سوچ کر بتاؤ کہ تمہاری کوئی واقفیت ہے؟"۔

۲۷ اگست ۱۹۸۶ء

سارترا اور قیوم نظر

مشہور شاعر قیوم نظر صاحب کا ایک انٹرویو برادرم طاہر مسعود نے لیا ہے اور یہ پڑھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ اس انٹرویو میں قیوم نظر صاحب نے ژاںپال سارتر سے اپنی ملاقات کا احوال بیان کیا ہے اور سبحان اللہ بیسویں صدی کا یہ عظیم دانشور ہمارے قیوم نظر کے سامنے کتنا بے بس نظر آتا ہے مثلاً قیوم نظر صاف بتاتے ہیں کہ فرانس میں 'میں نے وہاں کی اکیڈمی آف لیٹرز سے کہا کہ میں سارتر سے ملنا چاہتا ہوں۔ اکیڈمی نے جواب دیا کہ سارتر کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے اس سے نہ ملنا ہی بہتر ہو گا' البتہ آپ چاہیں تو ہم آپ کو فرانس کے دوسرے ادیبوں سے ملوا دیتے ہیں' لیکن میں صرف سارتر سے ملنا چاہتا تھا۔ انہوں نے مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی کافی کوششیں کیں اور متعدد دلائل دیئے مثلاً یہ کہ سارتر صرف فرانسیسی میں بات کرتا ہے 'اس پر آج کل ہنگری کے لئے چندہ جمع کرنے کا بھوت سوار ہے وغیرہ۔ خیر سارتر سے میری ملاقات کا اہتمام ہوا' میں نے دیکھا وہ ایک چھوٹے سے قد کا ٹھگنا آدمی ہے' میں نے اس سے کہا کہ میں نے آپ کے مضامین کا ترجمہ کیا ہے لیکن کچھ الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سے گفتگو ہو تاکہ وہ دور ہو سکیں۔ سارتر کہنے لگا "دیکھو مسٹر ادب میں الجھنیں تو پیدا ہوتی ہی رہتی ہیں اور دور بھی ہوتی رہتی ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ ہنگری کے لئے کیا کر رہے ہو' یہ سن کر پہلے تو میں ششدر رہ گیا' پھر میں نے پلٹ کر اس سے کہا "یہ فرمایئے کہ آپ نے کشمیر کے لئے کیا کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس نے کشمیر کے لئے کچھ نہیں کیا' تب میں نے کہا کہ جب آپ کشمیر کے لئے کچھ نہیں کر سکتے' تو میں ہنگری کے لئے کچھ کیوں کروں؟"۔

اور یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ہوتا یوں ہے کہ بقول قیوم نظر میرے اس جواب سے سارتر ناراض ہو گیا اور غصے میں انگریزی سے فرانسیسی پر اتر آیا' میں نے اس سے کہا "مسٹر سارتر! آپ انگریزی بولیں کیونکہ مجھے فرانسیسی نہیں آتی اور اگر آپ مسلسل فرانسیسی بولتے رہے تو پھر میں اردو میں شروع ہو جاؤں گا" اس پر وہ پستہ قد آدمی نخوت سے بولا آپ بے شک شروع ہو جائیں" میں نے کہا "لیکن اردو آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی" وہ کہنے لگا "آپ کو اس سے مطلب' مجھے آئے یا نہ آئے یہ میرا مسئلہ ہے' آپ اپنا کام کئے جایئے" غرضیکہ خاصی تلخی پیدا ہو گئی۔ اس نے کہا "میں نے تمہیں نہیں پڑھا ہے!" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ "اگر تم نے مجھے نہیں پڑھا' تو تم نے پڑھا کیا ہے' اطلاعاً عرض ہے کہ یونیسکو میری نظموں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرا چکی ہے"۔

درج بالا اقتباسات پڑھ کر قارئین کو شاید شبہ گزرا ہو کہ سارتر اور قیوم نظر کے درمیان جو گفتگو ہوئی' وہ ہم نے اپنے لفظوں میں بیان کی ہے اور یوں زیب داستان کے لئے کچھ بڑھا بھی دیا ہے۔ تو قسم لے لیجئے اگر ہم نے اپنی طرف سے ایک حرف کا اضافہ بھی کیا ہو۔ یہ ساری گفتگو ہم نے لفظ بہ لفظ قیوم نظر صاحب کی زبان میں نقل کی ہے اور صرف اس لئے نقل کی ہے تاکہ ہم جو احساس کمتری کے مارے ہوئے لوگ ہیں اس احساس سے چھٹکارا پائیں اور جان لیں کہ گوہر نایاب ہمارے ہاں بھی ہیں۔ بس یہ ہے کہ وہ اس کا اعلان نہیں کرتے' اب اپنے قیوم نظر ہی کو لیں یہ سارتر سے کیا کم ہیں بس ذرا بیمار شیمار رہتے ہیں' ورنہ فرانس کا افتخار اگر ژاں پال سارتر ہے' تو یہ پاکستان کے افتخار بلکہ افتخار بٹ ہیں۔ بٹ اس لئے کہ ہماری طرح یہ بھی کشمیری ہیں۔ البتہ سارتر سے ملاقات کا جو قصہ انہوں نے بیان کیا ہے اس کی درج بالا تفصیلات انہوں نے سارتر کے انتقال کے بعد ہی بیان کی ہیں' ورنہ جب برس ہا برس پہلے سارتر سے ان کی چند سیکنڈز کی ملاقات ہوئی تو اس کی جو "تفصیل" انہوں نے خود بیان کی وہ یہ تھی کہ بڑی مشکل سے سارتر سے ملاقات کا وقت ملا۔ اس نے عالمی سیاسی مسائل کے بارے میں گفتگو کا آغاز کیا تو قیوم نظر نے کہا جناب میں تو شاعر آدمی ہوں' میرا ان مسائل سے کیا تعلق؟ جس پر سارتر نے ان سے اجازت طلب کی اور کہا میں کسی ایسے آدمی سے نہیں مل سکتا جو خود کو شاعر کہلاتا ہے اور انسانیت کو درپیش مسائل سے اس قدر لاتعلق ہو اور اس کے ساتھ یہ ملاقات ختم ہو گئی! لیکن سارتر کی موت کے بعد سارتر کا زوال اور اپنے قیوم نظر کا عروج شروع ہو گیا' جس کا واحد مگر منہ بولتا ثبوت قیوم نظر صاحب کا یہ انٹرویو ہے' جس میں سارتر ایک بونا نظر آتا ہے اور اپنے قیوم نظر ایک دیو دکھائی دیتے ہیں جو " آدم بو' آدم بو " کہتے ہوئے اس پر جھپٹ رہے ہیں۔ سارتر کے بارے میں یہ نازیبا کلمات ہم اس لئے استعمال کر رہے ہیں کہ ہم قیوم نظر صاحب کی شاعری کے پرانے مداح ہیں اور ان کی غزل کا یہ مصرعہ تو پورے اردو ادب کی آن ہے۔

گرمیٔ حسن سے پکوڑے تلیں

بلکہ ان کی پوری شاعری میں اس طرح کے زندہ جاوید مصرعے اتنی کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ برسات کے موسم میں امرود میں اتنے کیڑے نہیں ہوتے۔ اگر سارتر نے بھی ان کی شاعری پڑھی ہوتی اور ہماری طرح وہ بھی ان کا مداح ہوتا' تو وہ مرنے کے بعد کم از کم قیوم نظر کے ہاتھوں ذلیل نہ ہوتا! اس کا کیا اس کے آگے آیا ہے' ہم کیا کر سکتے ہیں!

۲۱ جولائی ۱۹۸۲ء

درجہ بدرجہ دُعا

میں صبح جب گھر سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ پانچ پانچ چھ چھ سال کے بچے ہاتھوں میں کھانے کی پوٹلیاں لئے کام کاج پر روانہ ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا یہ بچے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے سارا دن کام کریں گے۔ اور اپنے استاد سے گالیاں بھی سنیں گے اور مار بھی کھائیں گے۔ میں نے سوچا کہ ان کی مائیں (اگر ان کی مائیں ہیں) اپنے جگر گوشوں کو روزانہ خود سے کس طرح علیحدہ کرتی ہوں گی۔ میں نے دعا کی کہ اے خدا ان بچوں کے دن پھیر' ان کے ہاتھوں میں اوزاروں کی بجائے کھلونے اور کتابیں دے اور ان کے نصیب میں بھی وہ خوشیاں لکھ' جو ان کی عمر کے دوسرے بچوں کے نصیب میں لکھی ہیں۔

....

میں صبح جب گھر سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ خوش نصیب بچے جن کے گلے میں بستے ہیں اور بڑے جن کے چہروں پر پریشانیاں کھدی ہوئی ہیں بس سٹاپ پر کھڑے ہیں۔ مسافروں سے بھری بس' سٹاپ پر آ کر رکتی ہے جس کے گیٹ سے لوگ چمگادڑوں کی طرح لٹکے ہوئے ہیں۔ سٹاپ پر کھڑے ہوئے بچے' جوان' بوڑھے اور عورتیں ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے گیٹ میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں' کچھ اس میں کامیاب ہو جاتے۔ کچھ گیٹ کے ساتھ مکھیوں کی طرح چمٹ جاتے ہیں اور باقی دھوپ یا بارش میں گلنے سڑنے کے لئے دوبارہ اپنی جگہ پر واپس آ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ میں نے دعا کی کہ اے خدا! انہیں بس کے انتظار کے عذاب سے بچا' ان کی مشکلیں دور کر!

....

میں صبح جب گھر سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ بس سٹاپوں پر کھڑے لوگوں کے علاوہ کچھ خوش نصیب ایسے بھی ہیں جن کے پاس اپنے موٹر سائیکل اور سکوٹر ہیں' مگر میں نے دیکھا کہ ایک موٹر سائیکل پر پورا پورا خاندان سوار تھا۔ دو بچے موٹر سائیکل کی ٹینکی پر بیٹھے ہوئے تھے ایک بچہ اور اس کی ماں موٹر سائیکل کی سیٹ کے پچھلے حصے پر بیٹھے تھے اور خاندان کا سربراہ درمیان میں پھنسا بیٹھا موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ صرف اس خاندان کی تنگدستی کی وجہ سے پانچ جانیں خطرے میں ہیں۔ میں نے دعا کی کہ یا خدا! ان کی حفاظت کر' انہیں رزق میں وسعت دے تا کہ یہ اپنی جانیں اس طرح خطرے میں نہ ڈالیں۔

....

میں صبح جب گھر سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ پیدل چلنے والوں 'بسوں کے انتظار میں کھڑے ہونے والوں اور موٹر سائیکل پر جانے والوں کے علاوہ کچھ خوش نصیب ایسے بھی ہیں جو اپنی چھوٹی چھوٹی کاروں میں اپنے اپنے دفتروں کی طرف جا رہے ہیں مگر یہ چھوٹی کاریں ناہموار سڑکوں کی وجہ سے پھدکتی ہوئی جا رہی تھیں اور بڑی کاروں کے ہجوم میں یہ کاریں ' کاریں نہیں ہانگ کانگ کی "ڈنکیاں" لگ رہی تھیں۔ ان کے مالکوں کے چہروں پر ناخوشگوار قسم کے تاثرات تھے۔ میں نے دعا کی کہ اے خدا! اپنے ان بندوں پر بھی نظر کرم کر انہیں اگر گاڑی دی ہے تو اچھی قسم کی گاڑی دے تاکہ ان کے چہروں کی کھچاوٹ دور ہو اور یہ تیرا شکر ادا کر سکیں!

میں صبح جب گھر سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ پیدل چلنے والوں 'بسوں کے انتظار میں کھڑے ہونے والوں ' موٹر سائیکل سواروں اور چھوٹی کاروں والوں کے علاوہ کچھ خوش نصیب ایسے بھی ہیں جو نئے ماڈل کی وسیع و عریض کاروں میں تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں 'مگر ان کے چہرے بھی خوشیوں سے محروم ہیں کیونکہ یہ کار انہیں دفتر چھوڑ کر گھر واپس آتی ہے اور بچوں کو سکول چھوڑنے جاتی ہے پھر یہی کار سکول سے فراغت کے بعد بیگم صاحبہ کو بازار شاپنگ وغیرہ کے لئے لے جاتی ہے بعد ازاں یہی کار صاحب کو دفتر سے لینے کے لئے جاتی ہے اور یوں یہ کار پورے کنبے کی کماحقہ ضروریات کے لئے ناکافی ثابت ہوتی ہے 'میں نے دعا کی کہ اے خدا! کنبے کے ہر فرد کو اس طرح کی ایک ایک گاڑی دے تاکہ ان کی مشکلات آسان ہوں اور وہ تیرا شکر ادا کر سکیں!

میں صبح جب گھر سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ پیدل چلنے والوں 'بسوں کے انتظار میں کھڑے ہونے والوں ' موٹر سائیکل سواروں 'چھوٹی کاروں اور ایک ایک بڑی کار کے مالکوں کے علاوہ کچھ خوش نصیب خاندان ایسے بھی ہیں جن کے کنبے کا ہر فرد اپنی اپنی کار پر کالج ' دفتر اور شاپنگ سنٹر جا رہا ہے مگر ان کے چہرے احساس محرومی کی وجہ سے کھنچے ہوئے ہیں۔ دراصل اس ملک نے ان لوگوں کی قدر نہیں کی کیونکہ امریکہ میں ایسے ایسے گھرانے بھی موجود ہیں جن کے ہر فرد کے پاس اپنا اپنا جہاز ہے مگر یہاں ان بیچاروں کو کاروں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے دعا کی کہ اے خدا! انہیں بھی جہازوں کا فلیٹ دے تاکہ تیرے یہ مفلس بندے تیرا شکر ادا کر سکیں!

میں صبح جب گھر سے نکلا تو میں نے ایک جنازہ دیکھا جسے صرف چار غریب سے آدمی کندھا دے رہے تھے ' مرحوم کے عزیز و اقربا اپنی اپنی کاروں میں قبرستان پہنچ کر جنازے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں اس جنازے کے ساتھ قبرستان پہنچا' مرحوم کو دو فٹ چوڑی لحد میں اتارا اور قبر پر ایک مٹھی مٹی کی ڈال کر دعا کی کہ اے خدا! ہم سب اس دنیا میں تیرے مہمان ہیں 'اپنے مہمانوں میں سے کسی کو بھوکا نہ رکھ کہ تو تو اس لحد میں پلنے والے کیڑوں مکوڑوں کی میزبانی بھی ' بڑے بڑے ذیشان انسانوں کی سالم رانوں سے کرتا ہے ہم اگر اشرف المخلوقات ہیں ' تو ہماری اشرف المخلوقاتی کا بھرم رکھ ' ہم میں سے جو سچ مچ بھوکے ہیں انہیں روٹی دے جو ضرورت مند ہیں ان کی ضروریات پوری کر اور وہ جنہیں تو نے رزق میں کشادگی دی ہے انہیں قناعت بھی دے تاکہ یہ تیرا شکر ادا کر سکیں!

۲۱ فروری ۱۹۸۴ء

تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو؟

چھٹی والے دن مرغی خریدنے کے لئے قریباً ایک فرلانگ پیدل چلنے کے بعد میں ایک مرغیوں کی دکان کے سامنے کھڑا تھا۔ دوکان اور سڑک کے درمیانی "رقبے" میں تہہ در تہہ کیچڑ تھا' جو قریباً دلدل کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس دلدل کو عبور کرنے کے لئے اینٹوں کا "پل" بنایا گیا تھا' یعنی ایک ایک قدم کے فاصلے پر ایک ایک اینٹ رکھ دی گئی تھی۔ اب یہ پل عبور کرنے والے کی مہارت پر منحصر تھا کہ اس کا پاؤں اینٹ پر پڑتا ہے' یا اینٹ اس کے پاؤں پر پڑتی ہے۔ بہرحال میں نے اللہ کا نام لیا اور پوری احتیاط سے اینٹوں پر قدم دھرتے ہوئے "پل" کی دوسری طرف پہنچ گیا۔ دوسری طرف ایک پختہ عمر کے بزرگ لوہے کی کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ان کے بائیں جانب مرغیوں کے تین چار ڈربے تھے اور ان کے برابر میں خون سے لتھڑا ہوا ایک بڑا سا ڈرم تھا۔ اس بزرگ نے سفید قیمتی کپڑے کا استری شدہ کرتا اور دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ میں اس دوکان میں داخل ہونے والا غالباً پہلا گاہک تھا' کیونکہ چھٹی کے دن کی وجہ سے ابھی صبح کے ہنگامے اپنے عروج کو نہیں پہنچے تھے اور یوں بھی جب میں نے مرغی کے نرخوں پر سودے بازی کی کوشش کی تو اس بزرگ نے نرمی سے کہا "بابو جی' "بونی" کر رہا ہوں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا' میں نے آپ کو بالکل جائز نرخ بتائے ہیں" سو میں نے اس بزرگ کے کہے کو صادق مانا اور ڈربے میں سے اپنی پسند کی کوئی مرغی تلاش کرنے لگا!۔

اور بائیں ہاتھ اوپر تلے دھرے ڈربوں میں سفید پروں والی کتنی ہی مرغیاں جگہ کی تنگی کی وجہ سے ایک دوسرے میں دھنسی ہوئی تھیں۔ ان ڈربوں میں پانی کا ایک کٹورہ اور ایک کٹورے میں ان مرغیوں کے چگنے کے لئے دانہ پڑا ہوا تھا۔ مرغیوں کے اس جھرمٹ میں دو ایک مرغ بھی تھے مگر ان بچاروں نے اپنی "رعایا" کے حقوق کیا پورے کرنے تھے کہ ان ڈربوں میں تو پر پھڑپھڑانے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ یہاں بیشتر مرغیوں کی گردنوں پر سے بال غائب تھے چنانچہ گردن کے اس حصے سے ان کی چمڑی نظر آ رہی تھی یا تو یہ بال کسی بیماری کی وجہ سے جھڑ گئے تھے' یا اس ماحول میں ایک دوسرے کو چونچیں مار مار کر انہوں نے ایک دوسرے کا یہ حال کر دیا تھا اور یا پھر مشفق و مہربان دوکاندار نے یہ بال خود اکھاڑے تھے تا کہ جب ان گردنوں پر چھریاں چلیں تو ان بے زبانوں کو زیادہ تکلیف نہ ہو۔ میں نے ان میں سے ایک درمیانے سائز کی مرغی پسند کی اور بزرگ سے کہا کہ وہ اسے جلدی سے تیار کر دے۔ بزرگ نے ڈربے کا دروازہ کھولا اور اس مرغی کو پروں سے کھینچ کر باہر لے آیا۔ ڈربے میں تھوڑی دیر کے لئے ایک شور برپا ہوا' مگر پھر خاموشی چھا گئی۔ البتہ دوکاندار کے ہاتھ میں لٹکی ہوئی مرغی بے بسی سے

ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کررہی تھی' مگر دوکاندار نے اسے اسی کے پروں سے باندھ دیا تھااور لکڑی کی ایک میز پر اسے اس طرح رکھ دیا تھا جیسے وہ کوئی جامد چیز ہو۔ دودھیا کپڑوں میں ملبوس بزرگ نے اس میز کی دراز میں سے ایک چولا نکالا جو خون کے دھبوں سے بھرا ہوا تھااور اسے اپنے سفید براق ایسے کپڑوں کے اوپر پہن لیااور اس کے ساتھ ہی یہ نیک صورت سا بزرگ اب ایک بالکل دوسرے روپ میں نظر آنے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ سے مرغی کو فضا میں معلق کیااور دوسرے ہاتھ میں چھری تھامے تکبیر پڑھ کر یہ چھری مرغی کے حلق پر چلادی۔ جس کے ساتھ ہی خون کی ایک دھار اس کے چولے پر پڑی جو پہلے ہی خون کے چھینٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ مرغی کے حلق سے غوں غاں کی آواز بلند ہوئی مگر پھر یہ آواز مدھم پڑ گئی۔ البتہ اس کا جسم دوکاندار کے ہاتھوں میں پھڑکتا رہا۔ دوکاندار نے اس پھڑکتے ہوئے جسم کو قریب پڑے ہوئے ڈرم میں پھینک دیااور اس کے ٹھنڈا ہونے کے انتظار میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر حقے کے کش لگانے لگا!

وہ کرسی پر بیٹھ کر حقے کے کش لگا رہا تھااور خالی ڈرم میں مرغی پھڑک رہی تھی۔ وہ اپنا سر اور جسم ٹین کے ڈرم کے ساتھ ٹکتی اور اس سے جو ردم پیدا ہو رہا تھا' وہ غلام افریقہ کے ڈرم کی تھاپ سے ہم آہنگ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرم میں سے آنے والی آوازیں خاموش ہو گئیں مرغی نے تڑپنا پھڑکنا بند کر دیا تھا' چنانچہ دوکاندار نے جھک کر ڈرم میں ہاتھ ڈالا اور مرغی کو ٹانگ سے پکڑ کر میز پر رکھ دیااور پھر منٹوں میں اس کی کھال اتار کر اس کی بوٹیاں بنائیں اور پھر انہیں پولیتھن کے لفافے میں بند کر کے لفافہ میرے ہاتھ میں تھمادیا اور ایک کپڑے سے خون آلود چھری صاف کرنے لگا اور وہ کچھ ہی دیر میں ایک بار پھر ایک قابل احترام بزرگ کے روپ میں نظر آنے لگا کیونکہ اس نے خون آلود چھری کو کپڑے سے صاف کر دیا تھااور خون کے پرانے اور نئے دھبوں سے بھرا ہوا چولا اتار کر پرے رکھا دیا تھا۔ نیچے وہی دودھ ایسا کرتا تھا' جس پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں تھی۔ اس کا آٹھ نو سالہ پوتا اس کے لئے گھر سے ناشتہ لایا تھااور ساتھ آج کا اخبار بھی! اس نے ناشتے کی پوٹلی کھول کر کاؤنٹر پر رکھی اور اب وہ ناشتے کے ساتھ ساتھ آسام' لبنان اور افغانستان میں ہونے والے قتل عام کے بارے میں ادارتی مضمون پڑھ رہا تھا۔ میں نے اخبار سے منسلک ادبی صفحے پر ایک چھلتی ہوئی نظر ڈالی' جس میں کسی قاری نے پوچھا تھا کہ ۔

خنجر پہ کوئی چھینٹ نہ دامن پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

والا شعر کس شاعر کا ہے؟ اور پھر میں دوکان سے نکل کر اس دلدل کے قریب پہنچ گیا' جسے میں نے اینٹوں کے "پل" کے ذریعے پار کرتا تھا۔ مگر دوسری طرف سے ایک اور گاہک ہاتھ میں تھیلا پکڑے اس پل پر سے گزر کر دوکان کی طرف آرہا تھا۔ معزز بزرگ نے گاہک کو دوکان میں داخل ہوتے دیکھ کر ناشتہ درمیان میں چھوڑا' میز پر سے خون آلود چولا اٹھا کر پہنا' چھری کو سان پر تیز کیااور سہمی ہوئی مرغیوں کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا!

۱۵ مئی ۱۹۸۳ء

نئے ترقیاتی ادارے

ملک میں اگرچہ اس وقت بہت سے ترقیاتی ادارے کام کر رہے ہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک ابھی ایسے کتنے ہی امور باقی ہیں، جن کے لئے ترقیاتی ادارے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس ضمن میں تاحال کوئی کام نہیں ہوا، بلکہ جن امور کی طرف ہم اشارہ کرنے والے ہیں 'ان کی ترقی اور فروغ کی اہمیت بھی ابھی تک ہم لوگوں پر واضح نہیں ہوئی۔ بہرحال ملک و قوم کی خدمت میں چونکہ یہ فریضہ بھی بحمد اللہ ہمیں کو ادا کرنا تھا، لہٰذا ہم ذیل میں اس اہم فریضے سے عہدہ بر آ ہو رہے ہیں۔

ایل ڈی اے

ایل ڈی اے کے نام سے ایک ادارہ یعنی لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی پہلے سے ہمارے ہاں موجود ہے مگر ایل ڈی اے کے نام سے جس ادارے کی داغ بیل ہم ڈالنا چاہتے ہیں، وہ دراصل لوّ ڈویلپمنٹ اتھارٹی ( ) ہے۔ لوّ ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے دائرہ کار میں (جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے) ملک میں پیار محبت کی فضا پیدا کرنا اور اس سے متعلق دیگر امور شامل ہیں یہ ادارہ ملک میں شیعوں اور سنیوں کی تعداد گھٹائے گا۔ کیونکہ کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں شیعہ بہت زیادہ ہو گئے ہیں، سنی بہت زیادہ ہو گئے ہیں، مسلمان کم رہ گئے ہیں! اسی طرح یہ دیوبندیوں اور بریلویوں کی نفری بھی ملک میں کم کرے گا۔ تاکہ "نفری" اور "نفریں" میں حد امتیاز قائم ہو سکے۔ اسی طرح یہ ادارہ سیاسی سطح پر دائیں اور بائیں کے مسئلہ پر آئیں بائیں شائیں کو ترجیح دے گا۔ اس ادارے کی سربراہی کے لئے چونکہ کوئی معقول نام ہمارے ذہن میں نہیں آ رہا لہٰذا فی الحال ہم اس کے لئے اپنے دوست محبت علی الفت کا نام تجویز کرتے ہیں۔ لوّ ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے دائرہ کار میں کچھ ایسے امور بھی آتے ہیں جن کا تعلق حدود آرڈیننس سے ہے، محبت علی الفت اگر مناسب سمجھیں تو اس ذیلی شعبے کی نگرانی کے لئے اپنے دوستوں میں سے کسی کو بھی نامزد کر سکتے ہیں۔

سی ڈی اے

سی ڈی اے کے نام سے ایک ادارہ یعنی کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی بھی پہلے سے ہمارے ہاں موجود ہے تاہم مجوزہ سی ڈی اے سے ہماری مراد کرپشن ڈویلپمنٹ اتھارٹی (

) ہے اور اس ادارے کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کیونکہ ہم لوگوں کو آج تک کرپشن کرنا نہیں آئی، چنانچہ رشوت ستانی وغیرہ کے لئے ہم آزادی کے بعد بھی غلامی کے دور والے حربے ہی استعمال کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس ادارے کے زیر اہتمام ایک ٹریننگ سنٹر کھولا جانا چاہئے جو افسران بالا کو جدید ترین اور سائنسی رویوں کی روشنی میں کرپشن کی تربیت دے۔ اس ٹریننگ سنٹر میں کوچنگ کے لئے کسٹم، ایکسائز، فوڈ، انکم ٹیکس، پی ڈبلیو ڈی اور اس نوع کے دوسرے محکموں سے ماہرین کی خدمات مستعار لی جاسکتی ہیں متذکرہ ادارے کی سربراہی کے لئے انٹی کرپشن کے محکمے سے کسی سینئر افسر کا انتخاب کیا جائے تو مناسب ہو گا۔

ایف ڈی اے

ایف ڈی اے سے ہماری مراد فیشن ڈویلپمنٹ اتھارٹی ہے۔ اس ادارے کے فرائض میں قوم کو نت نئے فیشنوں سے بروقت آگاہ کرنا اور ان کے لئے راہ ہموار کرنا ہو گا۔ مثلاً یہ ادارہ ادیبوں اور دانشوروں کو بروقت آگاہ کرے گا کہ اس وقت فیشن ایبل نظریات کون سے ہیں تاکہ انہیں اپنے حلقوں میں شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ یہ ادارہ گاہے گاہے خواتین کی بریفنگ بھی کرے گا کہ ان دنوں فیشن ایبل کہلانے کے لئے کون سا بہروپ مناسب ہے۔ فیشن ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے فرائض میں سیاستدانوں کی تربیت کا کام بھی شامل ہو گا۔ کیونکہ ہمارے سیاستدان بھی بسا اوقات ہوا کا رخ پہچاننے میں غلطی کر جاتے ہیں جس سے خواہ مخواہ ان کی سیاست دانی پر حرف آتا ہے اس ادارے کی سربراہی کے لئے کسی بھی موقع پرست شخصیت کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔

ایم ڈی اے

نئے ترقیاتی اداروں کے قیام کے ضمن میں ایک تجویز مشاعرہ ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے قیام کی بھی ہے۔ یہ ادارہ ملک میں شاعری سے زیادہ شاعروں کے مسائل حل کرنے میں مدد دے گا۔ ہمارا ملک اس وقت شاعروں کی کثرت کے مسئلے سے دوچار ہے جبکہ سامعین دن بدن کم سے کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ملک کے مختلف ادارے اس مسئلے پر قابو پانے کے لئے حتی المقدور کوشش کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور آرٹس کونسلوں کے علاوہ اب بلدیاتی ادارے میلہ مویشیاں کے موقع پر شعرا کو بھی زحمت کلام دیتے ہیں۔ مشاعرہ ڈویلپمنٹ اتھارٹی شعرا کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوششیں تیز سے تیز تر کرے گی، چنانچہ اس کی کوشش ہوگی کہ شادی بیاہ اور بچوں کے ختنوں وغیرہ کے موقع پر بھی مشاعروں کے اہتمام کی روایت ڈالی جائے۔ اس کے علاوہ جو شعرائے کرام حکام کو بذریعہ ڈاک قصائد روانہ کرتے ہیں اور انہیں ان کی "رسید" نہیں ملتی کے لئے یہ سہولت فراہم کی جائے گی کہ وہ ادارے کی معرفت اپنے قصائد ارسال کریں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ شعرا کے مسائل حل ہوں گے۔ بلکہ حکومت اور شعرا کے مابین خیر سگالی کی ایک فضا بھی پیدا ہوگی۔ اب تک یہ کام محدود پیمانے پر رائٹر گلڈ وغیرہ کی معرفت ہوتا رہا ہے۔ تاہم اسے ٹھوس بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے مشاعرہ ڈویلپمنٹ اتھارٹی اپنے تمام وسائل بروئے کار لائے گی، کیونکہ اس کے نتیجے میں خود اس ادارے کے اپنے وسائل میں بھی

اضافہ ہو گا۔ متذکرہ ادارے کی سربراہی کے لئے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ سے کسی موزوں شخصیت کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

ایس ڈی اے

ایس ڈی اے یعنی سمائل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا کام لوگوں کو مسکراہٹ کی طرف راغب کرنا ہو گا۔ کیونکہ رفتہ رفتہ ہمارے معاشرے سے مسکراہٹ ختم ہوتی جارہی ہے۔ اس اعلیٰ قومی مقصد کے حصول کے لئے یہ ادارہ ریڈیو' ٹیلی ویژن کے سیاسی مبصروں' اخبارات کے اداریہ نگاروں اور ترقی کے اعداد و شمار پیش کرنے والے ماہرین کی خدمات حاصل کرے گا۔ کیونکہ اب لوگ کالم نگاروں کی فکاہیہ تحریریں پڑھ کر سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور متذکرہ حضرات کی سنجیدہ گفتگوؤں اور تحریروں پر مسکرانے لگتے ہیں۔ اسی طرح ایس ڈی اے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ لانے کے لئے انتخابات کے جلد انعقاد کے اعلانات کرے گی اور یہ اعلانات سمائل ڈویلپمنٹ اتھارٹی سے وابستہ ان سیاست دانوں کی طرف سے ہوں گے جن کی خدمات ادارہ نوے نوے دنوں کے کنٹریکٹ پر حاصل کرے گا۔ اس ادارے کی سربراہی کے لئے پیر پگاڑا ایسی شخصیت نہایت موزوں رہے گی۔

۲۹ اپریل ۱۹۸۳ء

چھینکنا کھانسنا کبھو نہ گیا!

یوں تو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے میں کوئی شبہ نہیں، مگر کچھ چیزوں میں بعض جانوروں کو انسانوں پر فوقیت حاصل ہے۔ ویسے یہ فوقیت کا لفظ یہاں مناسب نہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ جانور بعض معاملات میں انسانوں کی نسبت قدرے سہولت میں ہیں، مثلاً ہم نے کسی لگڑ بگڑ کو کھانستے نہیں دیکھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے زندگی میں کبھی لگڑ بگڑ نہیں دیکھا۔ دو ایک دفعہ ہمیں شبہ گذرا کہ جس سے ہم مخاطب ہیں وہ لگڑ بگڑ ہے۔ چنانچہ ہم نے اس کا اظہار کر بھی دیا۔ مگر وہ مائنڈ کر گیا۔ اسی طرح ہم نے کسی لدھڑ کو چھینکتے نہیں دیکھا۔ البتہ کئی لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ چھینکتے ہوئے لدھڑ لگتے ہیں...... انسانوں اور جانوروں میں بس اب یہی فرق ہے! ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ جانوروں کو نزلہ زکام اور کھانسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ نہیں کیونکہ ہم صرف آنکھوں دیکھی بیان کر رہے ہیں کہ ہم نے انہیں کبھی کھانستے یا چھینکتے نہیں دیکھا۔ چنانچہ اگر وہ بالفرض انسانوں ہی کی طرح چھینکتے یا کھانستے ہیں تو بھی انہیں انسانوں پر ایک برتری یہ حاصل ہے کہ وہ دو ایک چھینکیں یا کھنگورے مار کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاج کے لئے انہیں کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا پڑتا اور یہ ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے۔ یہاں ایک دفعہ پھر اس وضاحت کی ضرورت ہے کہ ممکن ہے جانوروں کو بھی ڈاکٹروں کے پاس جانا پڑتا ہو۔ مگر انہیں بہرحال مشفق و مہربان ڈنگر ڈاکٹروں کے پاس جانا ہوتا ہے۔ جب کہ بچارے انسانوں کو تو انسانوں کے ڈاکٹروں کے پاس جانا پڑتا ہے!

یہ بیٹھے بٹھائے ہم موازنہ انسان و حیوان میں یونہی نہیں پڑ گئے۔ بلکہ گذشتہ ایک ماہ میں ان افعال قبیحہ میں مبتلا رہنے کے بعد یہ سطور لکھ رہے ہیں۔ یہ چھینکنے اور کھانسنے کو افعال قبیحہ میں ہم نے یونہی شمار نہیں کیا بلکہ اس کے لئے ہمارے پاس بے شمار مثبت دلائل ہیں مثلاً چھینکنے ہی کو لیجئے۔ ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی سے اچھی خاصی معقول باتیں کرتے ہوئے اگر ایک دم بھاڑ سا منہ کھول دے اور منہ کی بجائے ناک کے رستے سے عجیب و غریب آوازیں نکالنا شروع کر دے تو بتایئے فریقین کی کیا عزت رہ جاتی ہے؟ یہ فریقین والی بات ہم نے اس لئے کی ہے کہ اس فعل کے دوران نزلہ سامنے بیٹھے ہوئے کسی "عضو ضعیف" پر گرتا ہے اور وہ بچارا صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے اسی طرح چھینکنے والا بھی "الحمد للہ" اور "ایکسکیوز می" کی درمیانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کی چھینکوں کی بقایا قسطیں بسا اوقات منصۂ شہود پر آنے سے رہ جاتی ہیں اور یہ ایک علیحدہ "ایشو" ہے۔ علیحدہ "ایشو" اس طرح کہ اس کا منہ بھی کھل جاتا ہے۔ چہرہ بھی کھنچ جاتا

ہے اور آنکھیں تارے لگ جاتی ہیں۔ مگر چھینک نہیں آتی۔ بالکل کارپوریشن کے نلکے کی طرح کہ ٹونٹی کھلی ہے مگر پانی نہیں آرہا کچھ اسی طرح کے مسائل کھانسنے والوں کے بھی ہیں سارا سارا دن کھانستے ہیں۔ ساری ساری رات کھانستے ہیں مگر بے سرے ہونے کی وجہ سے انہیں داد سخن نہیں ملتی البتہ ہمارے ایک دوست کھانسنے کے معاملے میں صاحب اسلوب واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ اس ردم سے کھانستے ہیں کہ لگتا ہے چاندی کے ورق کوٹے جا رہے ہیں 'انہیں گانے کا بھی شوق ہے۔ چنانچہ جب وہ گا رہے ہوں تو پتہ نہیں چلتا کہ کھانسی کہاں سے ختم ہوئی اور گانا کہاں سے شروع ہوا۔ گانے اور کھانسی کا حسین امتزاج ہم نے اگر کہیں دیکھا ہے۔ تو انہی کے ہاں دیکھا ہے ہمارے یہ دوست "دبستان کھانسی" کی آبرو ہیں۔

دراصل ہمارا شمار ان بدنصیبوں میں ہوتا ہے جنہیں ابھی تک چھینکنے اور کھانسنے کا سلیقہ بھی نہیں آیا میر تقی میر نے کہا تھا۔

تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

اور یہ ہماری نصف ترجمانی ہے مکمل ترجمانی تو

تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا
چھینکنا کھانسنا کبھو نہ گیا

ایسے "شعر" ہی سے ممکن تھی۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ میر صاحب کو تانکنے جھانکنے ہی سے فرصت نہ ملی۔ سو انہیں اس قومی مسئلے پر غور و فکر کا موقع ہی نہ ملا۔ گذشتہ چند ہفتوں سے ہم نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھوں میں لیا ہے۔ بلکہ سچ پوچھیں تو اس مسئلے نے ہمیں اپنے ہاتھوں میں لے رکھا ہے اور اب ہم ہیں چھینکیں ہیں اور کھانسی ہے۔ چند روز ہوئے ہم ایک ڈاکٹر کے پاس گئے۔ اس نے مٹکے میں سے مکسچر کی ایک شیشی بھر کر ہمیں بھی دی۔ ایک ٹیکہ بھی ہمیں لگایا اور ساتھ ڈھیروں کیپسولز دیں کہ دن میں چار دفعہ ان کا "پھکا" مار لیا کریں۔ سو اس وقت سے ہمیں زکام اور کھانسی کا افاقہ ہے۔ البتہ دماغ بند ہو گیا ہے۔ نیز ہونٹوں اور زبان پر کچھ چھالے نکل آئے ہیں۔

اور آج کل طبیبوں سے بس ہمیں یہی شکایت ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس کسی بیماری کا تسلی بخش علاج نہیں ہے۔ اول تو ان سے بیماری کی صحیح تشخیص ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہو جائے تو اپنے علاج سے وہ ایک بیماری رفع کر دیتے ہیں اور اس کی جگہ دوسری لگا دیتے ہیں۔ اب یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ کھانسی اور نزلے کو تو آرام آ جائے لیکن اس کے نتیجے میں دماغ بند ہو جائے۔ انسان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی جائے۔ یا زبان پر چھالے پڑ جائیں۔ اور یوں دل کی باتیں انڈر گراؤنڈ چلی جائیں' زبان پر آ ہی نہ سکیں۔ یارو ایک بیماری کا علاج دوسری بیماری تو نہیں ہوتا۔

۱۸ دسمبر ۱۹۸۱ء

چاچا مُنہ اُڈ اور بھولا ڈنگر

ابھی بلدیاتی انتخابات کے شیڈول کا اعلان نہیں کیا گیا' تاہم جو امیدوار ہیں' انہوں نے بہت دنوں سے بظاہر غیر محسوس طریقے سے ہی سہی' اپنی انتخابی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا ہے' انہی دنوں ایک ایسے ہی امیدوار کی ڈائری ہمارے ہاتھ لگی ہے' اس کے چند اوراق ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

یکم جولائی

رمضان کا مہینہ ختم ہونے میں ابھی قریباً دس دن باقی ہیں' گویا ابھی دس دن اور مسجد میں افطاری بھجوانی ہے۔ چنانچہ پانچ سو روپے کا خرچہ مزید ہے۔ پہلے صرف مغرب کی نماز پڑھنا پڑتی تھی' مگر میرے حریف ماجھے پاتھی نے باقاعدگی سے "ترابیاں" پڑھنا بھی شروع کر دی ہیں۔ میں اس کی ساری کرتوتوں سے واقف ہوں میں نے دسویں جماعت میں غالب کا ایک شعر پڑھا تھا۔

یہ مسائل تصوف یہ ترابیاں غالب

اب میں محلے والوں کو کیسے سمجھاؤں کہ یہ جو آج کل تصوف کی باتیں کرتا ہے اور رات کو ترابیاں پڑھتا ہے۔ کس قدر بلا نوش ہے' مگر مجھے غالباً اس قسم کی کوئی مہم نہیں چلانی چاہئے کہ کہیں وہ بھی میرے متعلق انٹ شنٹ باتیں نہ شروع کر دے' اس کی بجائے اسے کاؤنٹر کرنے کے لئے مجھے بھی آج سے ترابیاں پڑھنا شروع کر دینا چاہئے۔

۲ جولائی

آج میرے پاس دِلّی دروازے سے چاچا منہ اڈ آیا تھا' اس کا منہ ہر وقت کھلا رہتا ہے' چنانچہ اسے لوگ منہ اڈ کہتے ہیں اور وہ بالکل مائنڈ نہیں کرتا بلکہ گذشتہ انتخابات میں اس نے پوسٹر پر اپنا نام چاچا منہ اڈ ہی لکھا تھا اور بریکٹ میں اپنا اصل نام ۔ جو بہت کم لوگ جانتے ہیں ۔ بہت باریک سا لکھوایا تھا۔ وہ اپنے اس عوامی نام کی وجہ سے الیکشن جیت گیا تھا' تاہم اس دفعہ وہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا کیونکہ اس کے مقابلے میں بھولا ڈنگر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس بھولے ڈنگر کو پہلے اس کی پیٹھ پیچھے بھی اگر کوئی بھولا ڈنگر کہتا تھا تو وہ اس سے لڑ پڑتا تھا' آج کل لوگ

اسے بلاتے ہی اس نام سے ہیں اور وہ آگے سے ہنستا رہتا ہے۔ چاچا منہ اڈ کا کہنا تھا کہ بھولا ڈنگر اور سب کچھ ہے' بھولا بالکل نہیں ہے' وہ مجھ سے مشورہ کرنے آیا تھا کہ اس کا "مکو" کس طرح "ٹھپا" جائے کیونکہ اس کی برادری خاصی وسیع ہے اور جن رشتے داروں کے ساتھ اس کا جھگڑا تھا' ان سے بھی اس نے صلح کر لی ہے' چنانچہ اب شیدا سیٹی' اکرم واجا اور اچھو ٹیڈی بھی اس کے ساتھ مل گئے ہیں' میں بھلا اسے کیا مشورہ دیتا' مجھے تو خود سمجھ نہیں آ رہی کہ میں ماجھے پاتھی کا کیا کروں' یہ انگوٹھا لگانے والا مجھ انڈر میٹرک سے متھا لگا رہا ہے۔

۳ر جولائی

رات کو تراویاں پڑھتے ہوئے میں دو دفعہ درمیان میں سو گیا' وہ تو دونوں بار سودے پہلوان نے مجھے کہنی مار کر جگایا' ورنہ بڑی بیستی ہوتی۔ ٹانگیں ابھی تک درد کر رہی ہیں' ایک تو قاری صاحب کی سپیڈ بڑی سلو ہے' اگر بندوبست کروں گا مگر پھر غالباً اس کی ضرورت نہیں پڑے گی' بہرحال اس دفعہ تو اوکھے سوکھے ہو کر تراویاں پڑھنا ہی پڑھیں گی' اس ماجھے پاتھی کا بیڑا غرق ہو صرف مجھے زچ کرنے کے لئے تراویاں پڑھ رہا ہے' ورنہ میں اس کی سات پشتوں سے واقف ہوں۔

۴ر جولائی

آج سودے پہلوان نے بڑی زبردست افطار پارٹی کا بندوست کیا' بہت سارے لوگ جمع تھے جب لوگ کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو اس نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہمارے علاقے کی نامور سماجی شخصیت ڈاکٹر رشید علی خان ہیومیوپیتھ بھی اس وقت ہمارے درمیان موجود ہیں وہ ہمیشہ سے علاقے کی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہتے ہیں' میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ پہلے کی طرح اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر علاقے میں صفائی کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کریں' کیونکہ صفائی کی صورت حال ایک دفعہ پھر بگڑ گئی ہے اس پر میں نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر ایک مختصر سی تقریر کی اور کہا کہ میں صورت حال کو بہتر بنانے کی انشاء اللہ ہر ممکن کوشش کروں گا اور مجھے سلسلے میں کچھ نہیں چاہئے' صرف آپ کا تعاون چاہئے لوگوں پر میری باتوں کا بہت اچھا اثر ہوا' اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ انہیں یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ سب کچھ میری الیکشن کمپین کا حصہ تھا۔ اس دعوت پر زیادہ سے زیادہ ہزار روپے خرچ آئے ہوں گے' مگر سودے پہلوان نے مجھ سے ڈیڑھ ہزار روپے وصول کئے اور کہا کہ خرچہ تو ۲ ہزار روپے کا ہوا ہے' باقی پانچ سو روپے میں اپنی جیب سے ڈال لوں گا' کوئی بات نہیں' ایک دفعہ میں الیکشن جیت لوں' اس خبیث آدمی سے پائی پائی وصول کر لوں گا۔ اس نے اپنی بیٹھک میں جوا کھلانے سے کون سا باز آ جاتا ہے؟۔

۵ر جولائی

سودے پہلوان نے مجھے آج ایک بہت اچھا مشورہ دیا ہے' اس نے کہا کہ علاقے کے خاکروبوں سے ایک خفیہ ملاقات کرو اور انہیں کہو کہ میں تمہیں علاقے کے لوگوں کے سامنے ذرا ڈانٹ ڈپٹ کروں گا بلکہ ایک آدھ ہاتھ بھی جھاڑ دوں گا بس تم آگے سے سر جھکائے کھڑے رہنا اس کے عوض ہر بار تمہیں فی کس دس روپے دیئے جائیں گے سودے پہلوان کا کہنا ہے کہ اس سے علاقے میں تمہاری ساکھ میں اضافہ ہو گا اور لوگوں کو اندازہ ہو گا کہ تم ان کے مسائل میں کس قدر دلچسپی لیتے ہو' اس کا یہ مشورہ مجھے بہت اچھا لگا۔ انشاء اللہ آج خاکروبوں سے ملاقات کر کے کل سے اس پر عمل در آمد کروں گا!۔

۶ر جولائی

یہ مشورہ تو واقعی بہت کارگر ثابت ہوا' میں نے آج خاکروبوں کو بہت ڈانٹ ڈپٹ کی اور چیخ چیخ کر انہیں ڈانٹا' چنانچہ اس شور شرابے سے بہت سے لوگ جمع ہو گئے میں نے ان کی آمد پر دو تین خاکروبوں کو ایک ایک دو دو ہاتھ بھی جڑ دیئے اور وہ پروگرام کے مطابق آگے سے سر جھکائے کھڑے رہے۔ البتہ یہاں تھوڑی سی بدمزگی پیدا ہو گئی' کیونکہ ایک خاکروب آگے سے تن کر کھڑا ہو گیا اسے غالباً ذرا زور سے ہاتھ پڑ گیا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس کا نوٹ گھما کر زمین پر پھینکتے ہوئے کہا "ڈاکدار صاحب" میں تمہارے دس روپوں پر لعنت بھیجتا ہوں' انہیں سنبھالو اور خبردار اگر مجھے ہاتھ لگایا" اللہ بھلا کرے سودے پہلوان کا کہ اس نے صورت حال سنبھال لی اور دس کا نوٹ زمین سے اٹھا کر دوبارہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "ڈاکدار صاحب تمہارے باپ کی جگہ ہیں' کیا ہوا اگر انہوں نے تھوڑی سی جھاڑ جھپٹ کر لی' وہ آخر علاقے بھر کے غریبوں کی مدد بھی تو کرتے ہیں' یہ پیسے رکھو' ڈاکدار صاحب کو تو یاد نہیں ہو گا کہ انہوں نے یہ پیسے تمہیں کب دیئے تھے!" اور ہاں مجھے یاد آیا کہ کل بھی میں ایک مشکل میں پھنستے پھنستے بچا تھا ہوا یوں کہ صبح صبح کچھ لوگ میرے پاس آئے اور کہا کہ آج "یوم سیاہ" ہے۔ اپنے مکان پر کالا پرچم لہرائیں۔ بلکہ وہ یہ کالا پرچم اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں تم لوگوں کے ساتھ ہوں' مگر میں الحمد اللہ حنفی العقیدہ ہوں اپنے مکان پر کالا پرچم نہیں لہرا سکتا۔ خدا کا شکر ہے' وہ مطمئن لوٹ گئے اور مجھے بھی اطمینان حاصل رہا کیونکہ میرے ووٹروں میں اکثریت حنفی العقیدہ لوگوں کی ہے!۔

۷ر جولائی

آج پھر صبح صبح چاچا منہ اڈ میری طرف آیا۔ اس کا منہ پہلے سے بھی زیادہ کھلا ہوا تھا اور وہ خاصا پریشان لگتا

تھا' اسے پریشان دیکھ کر میں بھی پریشان ہو جاتا ہوں' کیونکہ مجھے تو دراصل میئر کا الیکشن لڑنا ہے اور دوسرے کئی امیدواروں کی طرح چاچا منہ اڈ بھی میرا کھڑا کیا ہوا امیدوار ہے۔ چنانچہ میں نے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ یہ جو بھولا ڈنگر ہے' مجھے ایک بار پھر یقین ہو گیا ہے کہ یہ نہ بھولا ہے اور نہ ڈنگر ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا؟ چاچا منہ اڈ کہنے لگا کہ کل ایک افطار پارٹی میں بھولا ڈنگر دونوں ہاتھوں سے بہت بری طرح کھانے میں مشغول تھا' مجھے اس پر چوٹ کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ میں نے ہنسی مذاق کی آڑ میں بہت سارے لوگوں کی موجودگی میں اسے کہا' اوئے بھولے' بس کر' لوگوں کے لئے بھی کچھ چھوڑ دے۔ اس پر اس نے ایک اور بڑا سا نوالا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا کہ تم کمیونسٹ کسی کو کھاتے پیتے نہیں دیکھ سکتے۔ اس پر سب لوگوں نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا بلکہ کل سے میں پورے علاقے میں کمیونسٹ مشہور ہو گیا ہوں۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟ اس کی یہ بات سن کر میں بھی پریشان ہو گیا' تاہم میں نے اسے کہا کہ تم مولوی لوٹے سے رجوع کرو' مجھے امید ہے وہ تمہیں اس مشکل سے نکال لے گا!۔

بیمار کا حال اچھا ہے؟

سامنے سے اچانک ایک کار آ جانے پر میں نے اپنے بچاؤ کے لئے موٹر سائیکل کا رخ بائیں جانب کی ایک لین (   ) کی طرف موڑ دیا' جہاں مٹی میں دبے ہوئے ایک بڑے سے پتھر کا ابھار مجھے الٹانے کے لئے غالباً پہلے سے میرا منتظر تھا' چنانچہ موٹر سائیکل نے ایک پلٹا کھایا اور میں' میری وائف اور میرا چھوٹا بیٹا علی بڑے اہتمام کے ساتھ پتھریلی سڑک پر آن گرے یہ دیکھ کر چند راہگیر آگے بڑھے' ایک نے علی کو گود میں اٹھایا دوسرے نے موٹر سائیکل کو سیدھا کر کے سٹینڈ پر کھڑا کیا اور باقی ہماری خیریت دریافت کرنے لگے کہ زیادہ چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی' علی اس اچانک حادثے کی وجہ سے گھبرا گیا تھا' چنانچہ وہ خوفزدگی کے عالم میں مسلسل روئے جا رہا تھا۔ میں نے بیگم سے اس کی خیریت دریافت کی' وہ بالکل ٹھیک تھی' میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے بھی خراش تک نہیں آئی تھی' بلکہ میرے لئے یہ امر حیرت انگیز تھا کہ پوری قوت سے زمین پر گرنے کے باوجود موٹر سائیکل بھی پوری طرح محفوظ و مامون تھا چنانچہ وہ حسب معمول آدھی کک ہی پر سٹارٹ ہو گیا میں نے قریب کی دکان سے علی کے لئے ٹافیاں خریدیں' ایک ٹافی منہ میں رکھتے ہی وہ حادثے کی سنگینی کو بھول گیا۔ اور اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔

راہگیروں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد علی کے سکول کی طرف جاتے ہوئے جب میں نے بائیں جانب کو مڑنے کے لئے "" انڈیکیٹر "" چلایا' تو مجھے پتہ چلا کہ موٹر سائیکل کے پتھریلی سڑک پر گرنے کی وجہ سے یہ "" انڈیکیٹر "" تو ٹوٹ چکا ہے' چنانچہ میں نے اپنے ہاتھ کو انڈیکیٹر کے طور پر استعمال کیا اور پیچھے سے آنے والی ٹریفک کا جائزہ لینے کے لئے ہینڈل پر لگے شیشے میں جھانکا تو معلوم ہوا کہ یہ شیشہ بھی چکنا چور ہو چکا ہے۔ اس اچانک حادثے کی وجہ سے میرے حواس پوری طرح بحال نہیں تھے' جب یہ حواس بحال ہوئے تو مجھے موٹر سائیکل کے مختلف حصوں سے اٹھنے والی عجیب و غریب آوازیں سنائی دینا شروع کیں چنانچہ میں نے سڑک کے کنارے موٹر سائیکل کھڑا کیا اور ان آوازوں کا سراغ لگانے کے لئے موٹر سائیکل کے مختلف حصوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا اس ""تفتیش' کے دوران معلوم ہوا کہ اس کے اگلے پہیے کا مڈ گارڈ ٹیڑھا ہو چکا ہے اور وہ پہیے کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ لیگ گارڈ بھی ٹوٹ چکا تھا اور اس کی کھڑکھڑاہٹ بھی موٹر سائیکل کے "غل غپاڑے" میں اضافہ کر رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی قوت سے مڈ گارڈ کو سیدھا کر کے اسے پہیے سے الگ کیا' تاکہ عارضی طور پر اس کے شور سے محفوظ ہو جاؤں اور ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے علی کو اس کے سکول چھوڑا' وائف کو رکشے میں سوار کرایا تاکہ وہ اپنے طور پر کالج پہنچ جائے۔

اور خود کسی موٹر سائیکل مکینک کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کیونکہ مجھے موٹر سائیکل کی صورتحال خاصی مخدوش لگ رہی تھی۔ مکینک کی طرف جاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ موٹر سائیکل کچھ ڈول رہا ہے۔ نیز یہ کہ میں جا کسی اور طرف رہا ہوں اور اس کا رخ کسی اور طرف ہے چنانچہ میں ایک بار پھر سڑک کے کنارے موٹر سائیکل کھڑا کیا اور اس کے اگلے پہیے کو اپنی ٹانگوں میں پھنسا کر اس کا سٹیرنگ سیدھا کرنے کی کوشش کی، جو اس حادثے کی وجہ سے ٹیڑھا ہو گیا تھا، اس دوران ایک اور انکشاف مجھ پر یہ ہوا کہ اس کی اگلی بتی ٹوٹ چکی ہے، نیز پٹرول کی ٹینکی پر خاصے "چب" پڑ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اچانک اور شدید جھٹکے کی وجہ سے اس کا ایک "شاک آبزارور" بیٹھ گیا ہے۔ بہرحال میں نے پھر موٹر سائیکل سٹارٹ کیا اور اسے لے جا کر مکینک کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مکینک نے اسے ٹٹول کر دیکھا، کک مار کر اسے سٹاف کیا اور اس میں سے برآمد ہونے والی عجیب و غریب آوازیں سنیں اور پھر اس کا انجن بند کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا اور کہا "جناب! آپ یہ میرے پاس چھوڑ جائیں۔ اس کا تو انجر پنجر ہل گیا ہے، اس کی مرمت میں خاصا وقت لگے گا!"

مکینک کی دکان سے دفتر تک جانے کے لئے میں قریبی رکشہ سٹینڈ کی طرف پیدل روانہ ہوا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے چلنے میں کافی دشواری پیش آ رہی ہے دائیں ٹانگ کی پنڈلی سے ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں میں نے شلوار کا پائنچا اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ شلوار وہاں سے پھٹی ہوئی تھی اور پنڈلی کے اس حصے سے کھال ادھڑ چکی تھی اور اب وہاں ایک گہرا زخم تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ دفتر تک پہنچتے پہنچتے میں نے محسوس کیا کہ میرے دونوں کاندھے سخت بوجھل ہو رہے ہیں۔ اور مجھے گردن ادھر ادھر موڑنے میں شدید دشواری پیش آ رہی ہے۔ میں نے جلدی جلدی اپنا کام سمیٹا اور رکشہ پکڑ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا گھنٹی بجانے پر وائف نے دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے اور وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ اس کا ٹخنا بہت بری طرح سوجا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ڈاکٹر سے دوا لے کر آئی ہے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اب تو آپ کو افاقہ ہو جائے گا مگر خدشہ ہے کہ سردیوں کے موسم میں یہ چوٹیں مزید تکلیف کا باعث بنیں گی۔ اس دوران مجھے کمرے سے علی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ شہناز نے مجھے بتایا کہ اب وہ ٹافی سے بھی چپ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسے بھی چوٹیں آئی ہیں مگر وہ یہ بتلانے سے قاصر ہے کہ اسے کہاں کہاں چوٹیں آئی ہیں تاہم ڈاکٹر صاحب نے اسے بھی دوا دے دی ہے!

اور میں نے اپنے کمرے میں جا کر سپرٹ سے اپنا زخم دھویا اس پر مرہم لگائی۔ اور پھر یہ کالم لکھنے بیٹھ گیا جو آپ نے یہاں تک پڑھ لیا ہے۔ اس کالم کی آخری سطریں یہ ہیں کہ صرف فرد ہی نہیں بلکہ جب کوئی قوم بھی کسی اچانک حادثے سے دوچار ہوتی ہے تو اس کے افراد کو فوری طور پر ان نقصانات کا اندازہ نہیں ہوتا جو اس حادثے سے انہیں پہنچتے ہیں، بلکہ وہ خود کو پوری طرح محفوظ و مامون تصور کرتے ہیں۔ مگر یہ چوٹیں آہستہ آہستہ اپنا آپ دکھاتی ہیں۔ اور سردیوں کے موسم میں ان کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ کبھی کبھار تو یہ مستقبل عارضے کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ رونے والوں کو ٹافیاں دے کر کچھ عرصے تک کو بہلایا جا سکتا ہے مگر جب ان کے درد جاگتے ہیں تو پھر وہ ٹافیوں سے خاموش نہیں ہوتے۔ حادثے کے بعد موٹر سائیکل چلاتے ہوئے میں نے

محسوس کیا تھا کہ اس کا سٹیرنگ ٹیڑھا ہو گیا ہے چنانچہ میرا رخ کسی اور طرف ہے۔ اور میں جا کسی اور طرف رہا ہوں۔ کسی اچانک حادثے کی صورت میں قوموں کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے مگر اس کا اندازہ انہیں کافی دیر بعد ہوتا ہے۔ جو قومیں اپنی سمت درست کر لیتی ہیں۔ وہ بچ جاتی ہیں اور جن قوموں کے ڈرائیور اپنی جہالت پر انحصار کرتے ہیں وہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑے حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

(۱۲ مئی ۸۳ء)

منادی

اللہ جانے کون لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہماری قوم کو وقت کی قدر نہیں' حالانکہ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ وقت کے قیمتی ہونے کا جتنا احساس ہماری قوم کے افراد کو ہے' اتنا دنیا کے کسی کونے میں بھی موجود نہیں ہے ہم لوگ تو ہزاروں جانیں ضائع کر دیتے ہیں' وقت ضائع نہیں کرتے' چنانچہ جن احباب نے لاریوں' بسوں' و یگنوں اور رکشوں میں کبھی سفر کیا ہے' وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ڈرائیور حضرات وقت ضائع کئے بغیر منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے جس برق رفتاری اور چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہیں' اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ اور یہ خصوصیت صرف ڈرائیور حضرات تک محدود نہیں ہے بلکہ ہماری قوم کا ہر فرد اس جذبے سے مالامال ہے کہ وقت ایسی قیمتی چیز کو یونہی ضائع نہیں کرنا چاہئے' چنانچہ بس یا ٹرین میں سوار ہونے کے لئے وہ قطار تک نہیں بناتے کہ اسطرح زندگی کی کتنی ہی انمول گھڑیاں خواہ مخواہ اس کار بے مصرف پر صرف ہو جاتی ہیں' صرف یہی نہیں' بلکہ بس یا ٹرین سے اترتے وقت بھی' وہ ایک دوسرے کو کہنیوں سے دھکیلتے ہوئے جلدی سے جلدی اترنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم لوگوں کو چڑھنے کی بھی جلدی ہوتی ہے اور اترنے کی بھی جلدی ہوتی ہے اور اس سرعت کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم لوگ وقت کی قدر و قیمت سے کماحقہ آگاہ ہیں!

وقت کی قدر و قیمت سے کماحقہ آگاہ ہونے کا اندازہ تو اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ٹریفک کی سرخ بتی ہمیں سخت گراں گزرتی ہے' چنانچہ بیشتر صورتوں میں تو ہم سپاہی کی آنکھ بچا کر یہ اشارہ عبور کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وقت ضائع نہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاہم اگر ایسا ممکن نہ ہو تو ہم اپنی گاڑی مسلسل حرکت میں رکھتے ہیں حتیٰ کہ رینگتے رینگتے زیبرا کراسنگ سے آگے نکل کر چوک کے عین درمیان میں پہنچ جاتے ہیں اور یہ جلد بازی صرف اس لئے ہے تاکہ اشارے کے سرخ سے سبز ہونے تک کے درمیانی عرصہ میں ہم کچھ فاصلہ طے کرلیں کہ خواہ کان آنکھ' ٹانگ ضائع ہو جائے' وقت نہیں ضائع ہونا چاہئے اپنے قیمتی وقت کو ضائع ہوتے دیکھ کر ہمیں جس قدر جھنجلاہٹ ہوتی ہے' اس کا اندازہ سینما ہال میں فلم شروع ہونے سے پہلے قومی ترانہ بجائے جانے کے مرحلے میں بھی دیکھنے میں آتا ہے' جب یہ ترانا مکمل ہونے سے پہلے وقت کی قدر و قیمت کا احساس رکھنے والے تماشبین اپنی نشستوں پر بیٹھ جاتے ہیں اب اگر دیکھا جائے تو قومی ترانے سے زیادہ تو کوئی چیز قیمتی نہیں' مگر جنہیں وقت کی قدر و قیمت کا کماحقہ احساس ہے' وہ یہاں بھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتے !

بلکہ اب اگر سچی بات پوچھیں، تو عام دکاندار وغیرہ بھی جو عموماً ناخواندہ ہوتے ہیں، ہم پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ وقت کی قدر کرتے ہیں، چنانچہ آپ دکان پر کوئی چیز لینے جائیں اور دکاندار کے بتائے ہوئے نرخوں میں کمی کرانے کی کوشش کریں تو وہ "ہش ہش" کر کے بھگا دیتا ہے، یعنی اگر مال خریدنا ہے تو منہ مانگے داموں پر خرید، خواہ مخواہ اپنا اور ہمارا وقت ضائع نہ کرو، دراصل ہمارا یہ تاجر طبقہ "آج کا کام کل پر نہ ڈالو" کے اصول پر سختی سے عمل کرتا ہے، چنانچہ وہ کل کا منافع بھی آج ہی کمانے کی کوشش کرتا ہے اور اس سے بھی ان کا مقصود پیسہ بچانا نہیں۔ وقت بچانا ہوتا ہے، ورنہ اگر پیسہ بچانا مقصود ہو تو وہ ایک کی بجائے دو دنوں میں زیادہ گاہکوں کے پاس مناسب منافع پر زیادہ چیزیں فروخت کر کے زیادہ پیسے بچا سکتے ہیں، مگر انہیں وقت کے قیمتی ہوتے کا احساس دم نہیں لینے دیتا!

اور ظاہر ہے ہماری قوم کے افراد میں اگر وقت کی قدر و قیمت کا یہ احساس اس قدر قوی ہے، تو یہ احساس ان میں اپنے آپ پیدا نہیں ہوا کیونکہ "رعایا اپنے حاکموں کے دین کی پیروکار ہوتی ہے" اور الحمدللہ ہمارے حاکم اپنی رعایا سے بھی زیادہ وقت کی اہمیت کو سمجھتے ہیں، چنانچہ اگر ہمارے حکمرانوں نے ہر دور میں انتخابات منعقد کرانے سے گریز کیا ہے، تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ جمہوریت کی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جمہوریت سے زیادہ وقت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ انتخابات کرانے میں کس قدر وقت صرف ہوتا ہے، لہٰذا وہ قوم کا قیمتی وقت اس کام پر صرف کرنے کی بجائے کرکٹ میچوں پر صرف کرتے ہیں کہ اس سے قوم میں "سپورٹس مین سپرٹ" پیدا ہوتی ہے یعنی "خود بھی کھیلو، ہمیں بھی کھیلنے دو" کے جذبے کو تقویت ملتی ہے اور راعی اور رعایا کے دلوں میں باہمی خیر سگالی کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔ انتخابات وغیرہ پر وقت ضائع نہ کرنے کی صورت میں

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

والا شعر بھی بالکل بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے، چنانچہ دلوں کو یہ خلش نہیں ستاتی کہ وقت آہستہ آہستہ ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے بلکہ اس کی بجائے دلوں کو یہ اطمینان ہوتا ہے کہ اگرچہ گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی ہے مگر "گھڑی" کا کیا ہے، وہ تو اور بھی خریدی جا سکتی ہے بلکہ "سیٹزن" کے انبار خریدے جا سکتے ہیں، اصل قیمتی چیز تو وقت ہے جس کے متعلق

؎ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

والی بات کہی گئی ہے، لہٰذا حکمرانوں کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ جو وقت ہاتھ آیا ہوا ہے، ہم نے اسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا!۔

(۲ نومبر ۱۹۸۲ء)

شریف خواتین اور غزل

شاعری میں غزل کی صنف خود ہمیں بری طرح کھٹکا کرتی تھی' کیونکہ اس میں خواتین کے حسن و جمال کے تذکرے ہوتے تھے۔ بلکہ غزل کے شاعروں نے تو پردہ دار بیبیوں تک کو نہیں بخشااور اسطرح کے شعر کہے کہ۔

داور حشر میرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

چنانچہ ہم دعا کیا کرتے تھے کہ یا خدا' کوئی ایسا بندہ خدا بھیج جوان شعراء کا "مکو" ٹھپے 'سو خدا نے ہماری سنی اور اصغر بن ابراہیم نامی ایک شخص کو یہ توفیق دی کہ وہ ساری کلاسیکی اور آج کی غزل پر جھاڑو پھیریں اور یوں شاعری کے صحن کی صفائی کریں۔ ہم نے ان صاحب کا مضمون "شریف خواتین تغزل کی غلط روش کے خلاف آواز اٹھائیں" کے عنوان سے آج ہی ایک اخبار میں پڑھا ہے۔ موصوف نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "بلاشبہ غزل دائرہ اسلام سے خارج ہے" نیز یہ کہ "یہ تغزل ہی کا نتیجہ ہے کہ عورتیں اپنی تعریف سننے کے لئے بے پردگی کی طرف مائل ہو رہی ہیں" چنانچہ اصغر بن ابراہیم صاحب نے "نیک سیرت عورتوں کا دینی فریضہ" یہ بتایا ہے کہ "وہ تغزل کی اس غلط روش کے خلاف آواز اٹھائیں" موصوف کے اس نقطہ نظر سے کسی صاحب کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ چونکہ انہیں خود شعر کہنا نہیں آتا' لہٰذا انہوں نے تمام شاعروں کے لئے اسے حرام قرار دے دیا ہے کیونکہ انہوں نے مضمون کے شروع ہی میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ وہ کبھی شعر کہا کرتے تھے مگر احسان دانش مرحوم اور جناب عبدالکریم ثمر نے انہیں "ایک خاص نصیحت فرمائی کہ فن شاعری میں اصلاح کی نسبت مجھے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اور اس بات پر زور دیتے ہوئے یہ بھی نشاندہی کی کہ اگر مطالعہ خوب ہو جائے تو مجھے شعر گوئی میں کوئی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا!" ان صاحبان فن کا اشارہ غالباً اس طرف تھا کہ وہ کلاسیکی شاعری کا مطالعہ کریں' مگر اس کی بجائے انہوں نے شاعری کے عدم جواز کے لئے شرعی دلائل ڈھونڈنے کی خاطر مطالعے کا آغاز کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگرچہ قرآن و حدیث میں شاعری کی واضح ممانعت نہیں ہے' تاہم یہ جو غزل کی صنف ہے یہ بہرحال دائرہ اسلام سے خارج ہے کیونکہ اس میں "عورتوں سے باتیں" کی جاتی ہیں' لہٰذا انہوں نے شعر گوئی ترک کی اور "شریف خواتین" سے کہا کہ وہ ان کی ہم نوائی میں تغزل کی غلط روش کے خلاف آواز اٹھائیں۔

جیسا کہ ہم نے کالم کے آغاز میں کہا کہ خود ہمیں بھی یہ غزل کی صنف زہر لگتی ہے کیونکہ اس میں صنف

نازک کے حسن و جمال کا بیان ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی آڑ میں جو گل کھلائے جاتے ہیں' وہ بھی ہمارے علم میں ہیں۔ ہمارے ایک شاعر دوست جو زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ تھے۔ ایک بار کسی خاتون کے ساتھ سینما ہال میں دیکھے گئے' چنانچہ رپورٹ ہونے پر ان کی پیشی جمعیت کی ہائی کمان کے سامنے ہوئی اور کہا گیا "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ گذشتہ روز ایک بہن کے ساتھ فلم دیکھتے پائے گئے ہیں!" ہمارے دوست نے اس کے جواب میں اپنی صفائی پیش کی اور کہا" جناب ہماری ایک عزیزہ فیصل آباد سے آئی تھیں' وہ فلم دیکھنا چاہتی تھیں' چنانچہ گھر والوں کی ہدایت پر میں انہیں فلم دکھانے چلا گیا تھا!" یہ سن کر انہوں نے کہا "ٹھیک ہے مگر جماعت کا نظم بھی کوئی چیز ہے!" اس پر ہمارے دوست نے کہا "نظم اپنی جگہ' مگر آخر غزل بھی کوئی چیز ہے" خیر یہ تو یونیورسٹی کے ایک طالب علم کی طفلانہ شوخی تھی مگر غزل کا شاعر خواہ باریش ہو اور عمر کے کسی بھی سٹیج پر ہو' حسن و جمال سے منہ نہیں موڑتا! اب اپنے مولانا حسرت موہانی ہی کو دیکھیں' برصغیر کے مسلمانوں کے چوٹی کے رہنماؤں میں سے ہیں' شرعی حلیہ' شرعی وضع قطع' پابند صوم و صلوٰۃ متقی اور پارسا' باقاعدگی سے گیارہویں شریف دینے والے مگر جب غزل کہتے تھے تو۔

وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

اور

ے دکھتی رہی جوان کی کلائی تمام شب

قسم کی غزلیں کہتے تھے' چنانچہ ایک بار مولانا سے پوچھا گیا کہ غزل میں تین رنگ ہوتے ہیں ایک فلسفیانہ ایک عاشقانہ اور ایک فاسقانہ' آپ کس انداز کی غزل کہتے ہیں؟ مولانا نے اپنی مخصوص باریک سی آواز میں جواب دیا "فاسقانہ!" اور اس رنگ سخن کی جھلک تو ہمیں کہیں کہیں مولانا ماہر القادری اور مولانا نعیم صدیقی کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے!

ہم یہ سطور یہاں تک لکھ چکے تھے کہ خیال آیا ہم کس کام میں پڑ گئے ہیں' کیونکہ ادھر تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے یعنی غزل پر کیا منحصر ہے' اردو اور فارسی کی بیشتر شاعری اصغر بن ابراہیم اور ہمارے قائم کردہ اخلاقی معیار کے لحاظ سے دریابرد کرنے کے قابل ہے اور اکیلے مولانا حسرت موہانی کا کیا ذکر' ادھر تو بڑے بڑے علماء صلحاء' صوفیاء اور اولیاء نے بھی شعروں میں ایسی ایسی باتیں کہی ہیں کہ ہمارے اور اصغر بن ابراہیم جیسے چھوٹی موٹی لوگوں کے کانوں کی لویں سرخ ہو جاتی ہیں' چنانچہ حضرت امیر خسروؒ' مولانا رومؒ اور شیخ سعدیؒ جیسے اکابر کی کئی چیزیں ان دنوں ہمیں لحاف میں چھپا کر پڑھنی پڑتی ہیں۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ بھی'

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

جیسی غزلیں اور "......... کی گود میں بلی دیکھ کر" ایسی نظمیں کہتے رہے ہیں اور یہ "سلسلہ جاریہ" ابھی تک "جاری" ہے' چنانچہ پچھلے ہفتے خانقاہ گولڑہ شریف کے صاحب زادہ نصیر الدین نصیر مدظلہ العالی غریب

خانے پر تشریف لائے تو انہوں نے ہمیں جوش کے رنگ میں کہی ہوئی اپنی ایک نظم "گلبدنی" کے چند بند سنائے اور یہ بند سن کر حسب معمول ہمارے کان کی لویں ایک بار پھر سرخ ہو گئیں، ہم اور برادرم اصغر بن ابراہیم دونوں بہت شرمیلے ہیں!

تاہم اس کالم میں مقصود خود کو شرمیلا اور دوسروں کو شرمیلا ثابت کرنا نہیں، بلکہ صرف اصغر بن ابراہیم کو اپنی حمایت کا یقین دلانا ہے اور ان کی ہمت بندھانی ہے کہ وہ غزل کے خلاف اپنی تحریک کو آگے بڑھائیں تاکہ باقی شریف خواتین بھی ان کی ہم نوائی میں تغزل کے خلاف آواز اٹھائیں۔ البتہ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی رکاوٹ یہ ہے کہ ماضی اور حال میں انتہا درجے کی شریف خواتین خود غزل کہتی رہی ہیں۔ مثلاً اورنگ زیب عالمگیر کی ایک پردہ نشین بیٹی غزل کی نہایت خوب صورت شاعرہ تھیں، میر کی صاحب زادی غزل کہتی تھیں۔ اور آج ادا جعفری جیسی نیک اور شریف بیبیاں غزل کہتی ہیں، سو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس تحریک کی مخالفت سب سے پہلے شریف بیبیوں ہی کی طرف سے ہو۔ اگر ایسا ہوا تو بھی ہم اصغر بن ابراہیم کے ساتھ ہیں کیونکہ ہم ان شاعروں سے بہت تنگ آئے ہوئے ہیں جو آج کے اس سائنسی دور میں بھی انسان اور اس کے حسن و جمال کے گیت گاتے ہیں چنانچہ اصغر بن ابراہیم کو اپنی تحریک کے سلسلے میں شریف بیبیوں کی حمایت حاصل نہ ہو، تو بھی وہ دل چھوٹا نہ کریں کیونکہ ہم ایسے مرد بہرحال ان کے ساتھ ہیں۔

(۷ دسمبر ۱۹۸۳ء)

"سودیشی" ٹیلی فون

سائنسی دور میں انسان کو جو نئی نعمتیں میسر آئی ہیں، ان میں سے ایک ٹیلی فون بھی ہے، تاہم اس کے اوریجنل موجد نے تو اسے کسی اور طرح سوچا ہو گا جب کہ ہمارے لوکل "مجتہدین" نے اس میں جو جو "اجتہاد" کئے ہیں، ان سے اس کی شان ہی کچھ اور ہو گئی ہے۔ مثلاً اصولاً تو یہ ہونا چاہئے کہ ادھر آپ ٹیلی فون ملائیں اور ادھر آپ کی بات ہو جائے، مگر ہمارے ہاں اپنی انگلیاں فگار کرنا پڑتی ہیں اور تب کہیں جا کر نمبر ملتا ہے، اور غلط ملتا ہے۔ ہم تو صوفی آدمی ہیں تاہم لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ "رانگ نمبر" بھی بسا اوقات اتنا "رانگ" نہیں ہوتا...... واللہ علم بالصواب۔ ٹیلی فون کے سلسلہ میں ہمارے ہاں ایک "اجتہاد" یہ کیا گیا ہے کہ بیک وقت تین تین چار چار آدمی ایک دوسرے سے گفتگو کر سکتے ہیں اور اس کیلئے ایک دوسرے کو جاننا بھی چنداں ضروری نہیں، چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم نے کسی دوست کا نمبر ملایا دوسری طرف سے دوست نے ٹیلی فون اٹھایا مگر اسی اثناء میں کچھ ایسی گفتگو کان میں پڑی کہ ظالم سماج کا کردار ادا کرنے کو جی نہ چاہا اور ہم نے ٹیلی فون بند کر دیا، حالانکہ "مذاکرات" میں ہماری شرکت پر محکمہ ٹیلی فون کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

اہل یورپ اس سہولت سے محروم ہیں، البتہ وہاں ایک آدھ مخصوص نمبر ایسا ہوتا ہے جہاں بہت سارے اجنبی ایک دوسرے سے گھل مل کر باتیں کر رہے ہوتے ہیں اور جو چاہے وہ نمبر ملا کر اس "پارٹی" میں شریک ہو سکتا ہے، اس قسم کی لائن کو وہاں "ہاٹ لائن" کہا جاتا ہے، ہمارے ہاں اسے "آوٹ لائن" سمجھا جاتا ہے!

ان امور کے علاوہ ایک اہم چیز اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اہل یورپ نے ٹیلی فون ایجاد کیا اور ہم نے ٹیلی فون کیلئے تالا بنایا۔ یہ تالا دکانوں پر دھرے ٹیلی فونوں پر عموماً اور گھروں میں لگے ٹیلی فونوں میں خصوصاً استعمال ہوتا ہے اور اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ کہیں خلق خدا کفار کی اس ایجاد سے مستفید ہونا نہ شروع کر دے۔ ویسے یہ خلق خدا بھی ایسی ہے کہ کرتی لوکل کال ہے اور ہوتی ٹرنک کال ہے۔ بہرحال اس "تالہ بندی" سے صارفین کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ ان کے فون کا غلط استعمال نہیں ہو رہا مگر یہ عجیب بات ہے کہ لوکل کالوں کے باوجود صارفین کو جو بل آتا ہے وہ ٹرنک کالوں جیسا ہوتا ہے۔ محکمہ ٹیلی فون کے اہلکار خود بھی اس پر بہت حیران ہوتے ہیں چنانچہ اس قسم کے بل کے خلاف اگر کوئی شکائت کرے، تو منصفی کیلئے وہ ایک "ٹربیونل" بٹھا دیتے ہیں اور اس ٹربیونل کے ارکان ان کے اپنے ہی محکمے کے اہلکار ہوتے ہیں۔ چنانچہ "ٹربیونل" کے فیصلوں میں شکائت کنندگان کو خاصی ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی ہے کہ آپ نے ناحق ہمارا وقت ضائع کیا، ٹھیک ہے آپ نے

اتنے فون نہیں کئے ہونگے، کسی اور ضرورت مند نے کئے ہونگے۔ لیکن اگر آپ کا فون خلق خدا خصوصاً ٹیلی فون آپریٹروں کے کام نہیں آسکتا تو آپ کا فون اور آپ کی شکایت بھاڑ میں جائے۔ آپ براہ کرم پورا بل ادا کریں اور اپنا دل بڑا کریں، اگر ہاتھی والوں کو مہمان بلایا جائے تو گھر کے دروازے بڑے رکھنے چاہئیں۔

ہمارے ہاں ٹیلی فون کا ایک مصرف اور بھی ہے اور اس مصرف سے بھی اہل یورپ آشنا نہیں..... وہ بہت مادہ پرست لوگ ہیں، وہ ایک کام کیلئے ایک ہی دفعہ فون کرتے ہیں۔ جب کہ مشرقی لوگوں کی وضعداری کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے محکمہ ٹیلی فون کے "مجتہدین" نے ایک "اجتہاد" یہ بھی کیا ہے کہ ٹیلی فون گفتگو کے دوران بار بار کٹ جائے تاکہ اسی بہانے لوگ ایک دوسرے کو بار بار ٹیلی فون کریں اور یوں محبت میں اضافہ ہو، ایک دفعہ ہم نے اپنے ایک دوست سے اس کے نئے گھر کا پتہ دریافت کرنا تھا۔ چنانچہ ہم نے اسے فون کیا۔ اور ہیلو کہنے کے بعد پیشتر اس کے ہم مادہ پرستی کا مظاہرہ کرتے یعنی پوری طرح خیر خیریت دریافت کئے بغیر فوراً مطلب کی بات شروع کر دیتے، محکمہ ٹیلی فون والوں کی "مشرقیت" آڑے آئی اور ٹیلی فون منقطع ہو گیا ہم نے دوسری دفعہ نمبر ملایا اور فوراً حرف مدعا زبان پر لاتے ہوئے اس سے نئے گھر کا ایڈریس پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ماڈل ٹاؤن میں داخل ہو کر پاکستانی چوک سے بائیں ہاتھ مڑ جانا ہے اور اس کے ساتھ ہی ٹیلی فون پھر کٹ گیا، ہم نے نئے سرے سے فون ملایا اور کہا "پھر؟" دوست نے کہا "پھر آگے بی بلاک کی مارکیٹ آجائے گی "ٹیلی فون پھر منقطع ہو گیا اور ہم نے ایک بار پھر نمبر ملا کر کہا "میں مارکیٹ پہنچ گیا ہوں جلدی سے بتاؤ کہ مجھے اب کہاں جانا ہے؟" دوست نے کہا کہ "اب تم دائیں ہاتھ کو مڑ جاؤ اور چند قدم چلنے کے بعد پھر ایک سڑک دائیں جانب کو مڑے گی۔ تم بھی اس طرف ہو جاؤ" اور ٹیلی فون پھر کٹ گیا۔ ہم نے ٹیلی فون پھر ملایا اور کہا "یار خدا کے لئے جلدی سے بتاؤ کہ تم کہاں رہتے ہو؟" مگر دوسری طرف سے "بدتمیز..... شرم نہیں آتی آپ کو" کی آواز آئی ہم نے ٹیلی فون بند کر دیا، ہم اپنی اس حرکت پر خاصے شرمندہ ہوئے، مگر قسم لے لیں کہ ہم نے فون نمبر نہیں ملایا تھا، یہ ٹیلیفون والوں کی "رضا کارانہ خدمات" کے سلسلے کی کڑی تھی جو "رانگ نمبر" کے نام سے مشہور ہے، اور جیسا کہ ہم نے کالم کے آغاز میں کہا کہ ہم تو صوفی آدمی ہیں لہٰذا ہمیں کیا پتہ کہ "رانگ نمبر" کیا ہوتا ہے اور صحیح نمبر کیا ہوتا ہے اگر اتنے باخبر ہوتے تو اتنی عمر گزارنے کے بعد یہ احساس ہمیں آج نہ ہوتا کہ وہ جنہیں ہم "مسیحا" سمجھتے رہے ہیں اور جن سے مکالمہ کرتے آرہے ہیں۔ وہ رانگ نمبر والے مسیحا تھے۔ ہمیں تو اگر کوئی خبر ہے تو وہ صرف یہ کہ مغربی طرز کی جمہوریت کی طرح ہمارے ہاں مغربی طرز کے ٹیلی فون کی بھی حوصلہ شکنی بلکہ دل شکنی کی جاتی ہے۔ چنانچہ جس طرح ہمارے ہاں مغربی جمہوریت کو دندان شکن جواب دینے کیلئے مشرقی طرز کی بلدیاتی جمہوریت نافذ کی گئی ہے۔ اسی طرح محکمہ ٹیلی فون نے بھی اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا ہے اور اس بدیشی آلے میں اتنی مثبت تبدیلیاں کی ہیں کہ اب یہ مکمل طور پر سودیشی ہو کر رہ گیا ہے بالکل اسی طرح جس طرح شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" تھی۔

۹ر جولائی ۱۹۸۳ء

ہنسنے پہ پابندی

فلپائن کے ایک شہر میں ایک شخص ٹیلی ویژن پر ایک مزاحیہ پروگرام دیکھتے ہوئے اتنا ہنسا کہ فوت ہو گیا۔ اس کی موت کا باعث صرف ٹیلی ویژن کا مزاحیہ پروگرام ہی نہیں بنا بلکہ اس کا ایک قریبی دوست بھی جو اس وقت اس کے قریب ہی بیٹھا تھا' اس کی موت کا باعث بنا کیونکہ یہ دوست بھی اسے چن چن کر ایسے لطیفے سنا رہا تھا' جس سے وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوتا چلا گیا حتی کہ اس نے اسی عالم میں اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی!

ہم نے اپنے دوست مظفر بخاری کے کالم میں جب سے یہ خبر پڑھی ہے ہم ہنسنے کے سلسلے میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئے ہیں بلکہ امجد سمیت اپنے ان دوستوں سے بھی قدرے دور دور رہنے لگے ہیں جو سارا دن لطیفے سنا سنا کر بظاہر ہماری بیٹری چارج کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ ہم نے تو اب ان چیزوں سے بھی پرہیز شروع کر دیا ہے' جنہیں دیکھ کر یا پڑھ کر چہرے پر ہنسی نہ سہی' مسکراہٹ بھی ابھر سکتی ہو۔ چنانچہ ان دنوں ہم نے اخبارات کے اداریے پڑھنے بند کر دیئے ہیں۔ ٹی وی کا "خبرنامہ" نہیں دیکھتے۔ پیر پگارو کے بیانات بھی نہیں پڑھتے۔ الیکشن کے امیدواروں کی انتخابی تقریریں بھی ہم نے پڑھنا چھوڑ دی ہیں بلکہ ان دنوں تو ہم اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں شائع ہونے والے ہینڈ آؤٹ بھی نہیں پڑھتے۔ ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والی تقریریں بھی نہیں سنتے۔ اسی طرح ترقی کے بارے میں شائع ہونے والے اعداد و شمار بھی ہم نے پڑھنا بند کر دیئے ہیں۔ سپر پاور کے حامل عالمی رہنماؤں کے قیام امن کے سلسلے میں شائع ہونے والے بیانات بھی اب ہم نہیں پڑھتے۔ غرضیکہ ہم نے اپنی طرف سے تو ہنسی کے تمام دروازے مقفل کر دیئے ہیں۔

مگر وہ جو نجیب احمد نے کہا ہے کہ

ہم تو سمجھے تھے کہ چاروں در مقفل ہو چکے
کیا خبر تھی ایک دروازہ کھلا رہ جائے گا

سو ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ کل صبح صبح ایک دوست تشریف لائے' ہم نے ان کیلئے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا' اندر چائے بھجوانے کو کہا اور پھر پوچھا' آج کیسے آنا ہوا؟" کہنے لگے "بس تم سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا' سو چلا آیا" ہم نے کہا "بہت مہربانی' مگر اس کے علاوہ بھی تو آنے کا کوئی مقصد ہو گا" کہنے لگے "نہیں بھئی سچ کہہ رہا ہوں' صرف تمہیں دیکھنے کیلئے آیا ہوں!" ہم نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے' دیکھ تو تم نے لیا ہے اب کام بتاؤ جس کیلئے آئے ہو!" اس پر ہمارے یہ دوست کچھ ناراض سے ہو گئے اور اسی ناراضی کے عالم میں کہنے لگے

"تمہارا مطلب یہ ہے دنیا میں خالص محبت اور دوستی کی قدریں مٹ گئی ہیں اور ہر شخص اتنا خود غرض ہو گیا ہے کہ بغیر کسی غرض کے کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا میں نے ایک وزیر سے ملنا تھا' سوچا تمہیں ساتھ لیتا جاؤں' وہ وزیر تمہارا دوست ہے' اس لحاظ سے میرا بھی دوست ہے' میرے دوست یاد رکھو' خلوص محبت' وفا یہ سب قدریں ابھی تک قائم و دائم ہیں!" یہ سن کر ہمیں ہنسی کا دورہ پڑ گیا اور یوں بڑی مشکل سے فوت ہوتے ہوتے بچے!

ہمارے ایک اور دوست ہیں جو عارضہ قلب میں مبتلا ہیں' چنانچہ ڈاکٹروں نے ان کے عزیزوں کو ہدایت کر رکھی ہے کہ انہیں انتہائی دردناک یا انتہائی دل خوش کن خبر اچانک نہ سنائی جائے بلکہ قسطوں میں سنائی جائے' چنانچہ اس دور میں پوری خبر تو ہم ایسے مضبوط دل والے لوگوں تک بھی کم کم پہنچتی ہے' ان تک پہنچتے پہنچتے تو کئی مہینے لگ جاتے ہیں۔ گذشتہ روز انہوں نے بھی یہ خبر اخبار میں پڑھ لی کہ عارضہ قلب کا مریض طنز و مزاح کی زیادتی کی وجہ سے ہنستے ہنستے فوت ہو گیا' چنانچہ آج ان سے ملاقات ہوئی' تو بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے' ہنستے تو پہلے بھی بہت کم تھے' مگر آج تو انہوں نے تبسم کی بھی "لوڈ شیڈنگ" کی ہوئی تھی اور اس کیلئے دانت پوری طرح بھینچے ہوئے تھے کہ کہیں کوئی مسکراہٹ سرزد نہ ہو جائے۔ کہنے لگے "وہ خبر پڑھ لی تھی" ہم نے پوچھا "تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟" کہنے لگے "آج اخبار میں ایک بیگم صاحبہ کی تصویر چھپی ہے جنہوں نے نادار خواتین کیلئے ایک لاکھ روپے کے عطیات جمع کئے ہیں!" ہم نے کہا "مگر اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" کہنے لگے "ہنسنے کی وجہ میری ذاتی معلومات ہیں اور وہ ذاتی معلومات یہ ہیں کہ اس ایک لاکھ روپے کے عطئے کیلئے جو مینا بازار لگایا گیا تھا' اس پر کئی لاکھ روپے صرف ہوئے ہیں!" یہ کہتے ہوئے ان کے بھینچے ہوئے دانت کھلے' بس یوں لگتا تھا کہ ابھی ہنس پڑیں گے' مگر خدا ترس آدمی ہیں' انہیں غالباً اپنی موت یاد آ گئی' چنانچہ ہنسنے کی بجائے دوبارہ ایک دم سے سیریس ہو گئے!

سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ متذکرہ خبر نے ہم کو نہیں' ہم جیسے بہت سوں کو دہلا کر رکھ دیا ہے جو بات بات پر دانت نکالنے کے عادی ہیں' بلکہ ساری عمر گزرنے کے بعد ہمیں تو

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

والے شعر کا مطلب بھی پہلی دفعہ سمجھ میں آیا ہے۔ اسی طرح پہلے اگر کسی کو ہنستے دیکھتے تھے تو خوش ہوتے تھے کہ چلو کوئی تو ایسا ہے جو ہنسنے کا حوصلہ رکھتا ہے' یا اگر کسی خوش رو کو ہنس ہنس کر باتیں کرتے پاتے تو فوراً

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
یہ تبسم' یہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو

والا شعر دل ہی دل میں دہرانے لگتے تھے اور یوں اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتے تھے' مگر اب تو ایسی صورت میں اپنی جان کے نہیں' اس کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں کہ جانتے ہیں اس تبسم نے ہمیں کیا لے کر بیٹھنا ہے' کہیں خود اس کو نہ لے کر بیٹھ جائے۔ سو دوستو یہ خبر پڑھ کر ہماری تو جان عذاب میں آ گئی ہے۔

رونے کی پہلے اجازت نہیں تھی، ہنسنے کی اب نہیں رہی۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
وہاں رونے پہ پابندی، یہاں ہنسنے پہ پابندی

۲۲؍ جنوری ۱۹۸۵ء

ڈوری سے بندھا شاہین

کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل سے نکلتے ہوئے میری نظر گیٹ پر بیٹھے ایک مفلوک الحال سے شخص پر پڑی اس نے اپنے ہاتھ پر ایک شاہین بٹھایا ہوا تھا اور اس شاہین کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی میں نے سوچا کہ اقبال کے پیرو کار ہیں شاہین کا ذکر بہت سنا ہے کیوں نہ اسے آج قریب سے دیکھ لیں چنانچہ میں اس شخص کے پاس گیا میں نے دیکھا کہ اس شخص نے مضبوط ڈوری کے ایک سرے سے شاہین کی ٹانگیں باندھی ہوئی تھیں اور دوسرا سرا اپنے ہاتھ کے گرد لپیٹا ہوا تھا علاوہ ازیں اس نے اپنے ہاتھوں پر چمڑے کے دستانے پہنے ہوئے تھے اور شاہین کے کاٹنے کی وجہ سے یہ دستانے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے شاہین کی آنکھوں پر چمڑے کی "عینک" تھی جس کی وجہ سے وہ دیکھ نہیں سکتا تھا مگر وہ مضطرب انداز میں اپنی گردن ادھر ادھر گھما رہا تھا میں نے اس شخص سے پوچھا "یہ شاہین بکنے کے لئے ہے"

"ہاں جی بکاؤ مال ہے" اس نے کہا

مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں خاصی بے اعتنائی ہے اسے اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں کہ میں نے یہ سوال شاہین خریدنے کے لئے کیا ہے یا محض وقت گزاری کر رہا ہوں تھوڑی دیر بعد ایڑیوں کے بل بیٹھے ہوئے اس شخص نے گردن موڑ کر ہوٹل کی لابی کی طرف نظر دوڑائی اور اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے شخص سے کہا "ابھی تک آیا نہیں!"

"آجائے گا!" اس کے ساتھی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیوں میاں اس کا کیا لوگے؟" میں نے اپنے ذوق تجسس کی تسکین کے لئے پوچھا۔

"ستر ہزار روپے" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا اس کی نظریں لابی کی طرف تھیں۔

"ستر ہزار روپے؟" حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا

"ہاں جی ابھی بچہ جو ہے تبھی تو قیمت کم ہے!" اس نے کہا۔

"ابھی آیا نہیں" اس نے ایک بار پھر ایڑیاں اٹھا اٹھا کر لابی کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"آجائے گا یار آجائے گا کہیں نہیں جاتا" اس کے ساتھی نے یقین سے کہا۔

"تم کس کا انتظار کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا

"ایک گاہک کا انتظار ہے"

"اگر ستر ہزار مانگو گے تو قیامت تک اس کا انتظار ہی کرتے رہو گے!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پچاس ہزار روپے مول تو وہ لگا گیا ہے میں نے اسے اسی ہزار قیمت بتائی ہے ستر تک بیچ دوں گا!" اسے میرے فُقرے ہونے کا غالبًا یقین تھا تبھی اس نے مجھ سے کاروباری پردہ داری تک ترک کر دی تھی!

"مگر وہ کون احمق ہے، جو ایک پرندے کے تمہیں ستر ہزار روپے دے گا"

"وہ احمق نہیں ہے ایک عرب شیخ ہے عرب ہمارے شاہینوں کے بڑے اچھے گاہک ہیں!"

مجھے یہ سن کر کچھ چپ سی لگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے خود کو سنبھالا اور پوچھا "اچھا یار ایک بات تو بتاؤ تم نے شاہین کی آنکھوں پر پٹی کیوں باندھی ہوئی ہے؟

"اس کی آنکھیں کھلی ہوں تو یہ اپنی نوکیلی چونچ بار بار ہاتھوں میں گاڑ دیتا ہے اور بوٹی نکال کر لے جاتا ہے ابھی ناسمجھ ہے آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا!"

مگر میرے ذہن میں ابھی تک شاہین کی قیمت پھنسی ہوئی تھی چنانچہ میں ایک دفعہ پھر واپس اپنے موضوع کی طرف آیا "ایک پرندے کے ستر ہزار بہت زیادہ ہیں اس میں ایسی کون سی خاصیت ہے بالکل چیل کی طرح تو ہے وہی آنکھیں وہی نوکیلے پنجے وہی چونچ مگر پھر مجھے خود ہی ایک دوست کی بات یاد آ گئی کہ چیل اور شاہین میں فرق صرف یہ ہے کہ چیل اپنے شکار پر جھپٹتی شاہین ہی کی طرح ہے بس اتنا ہے کہ شکار کے قریب پہنچ کر اس کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے اور یہی بے موقع ہنسی شاہین اور چیل میں امتیاز کا باعث بنتی ہے۔

"چیل اور شاہین میں بہت فرق ہے جناب!" اس نے ہنستے ہوئے کہا مجھے اس کی یہ ہنسی چیل کی طرح بے موقع لگی "شاہین کی اڑان اور اس کی دیگر خصوصیات سے تو آپ واقف ہی ہیں لیکن جو شاہین ہم بیچتے ہیں وہ سدھائے ہوئے ہوتے ہیں یہ شاہین جو اس وقت میرے ہاتھ پر بیٹھا ہے بلا کا شکاری ہے یہ بٹیر 'تیتر' مرغابی اور دوسرے پرندوں کا پیچھا کرتا ہے اور انہیں زندہ اپنے پنجوں میں دبا کر اپنے مالک کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا ہے چنانچہ اس شاہین کے قدر دان بہت ہیں"

"یہ شاہین پرندے کو شکار کر کے خود کیوں نہیں کھاتا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے آپ کو بتایا نا کہ یہ سدھایا ہوا شاہین ہے"

دوسرے لفظوں میں یہ ملازمت پیشہ شاہین ہے" میں نے ہنستے ہوئے کہا

"جی جی" اس نے اپنے میلے میلے دانت نکالتے ہوئے کہا "ویسے بھی جب اسے شکار پر چھوڑا جاتا ہے گوشت کا ایک ٹکڑا اس کی ٹانگوں کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے تاکہ اسے تسلی رہے"

"اگر برا نہ مانو تو آخر میں تم سے ایک بات پوچھوں؟" میں نے کہا

"پوچھو جناب پوچھو!"

"تم اتنا مہنگا کاروبار کرتے ہو مگر تمہاری اپنی حالت کچھ اتنی اچھی نہیں ہے؟"

"بابو جی! آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں میں اس شاہین کا مالک تھوڑے ہی ہوں میں تو اسے کمیشن پر بیچ رہا ہوں شاہین اگر بک جائے تو اس کی کمیشن میں ہمارا حصہ بھی ہوتا ہے"

شاہینوں کے کمیشن ایجنٹ نے ایک بار پھر لابی کی طرف ایڑیاں اٹھا کر دیکھا!

اس دوران کھڑے کھڑے میری طبیعت متلانے لگی تھی میں نے باہر سڑک پر نظر دوڑائی تو انسانوں کا ایک سیلاب اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں دواں تھا ان میں طالب علم بھی تھے استاد بھی صحافی بھی تھے صنعت کار بھی پولیس والے بھی تھے اور دوسرے محافظ اداروں کے افراد بھی ان میں دانشور بھی تھے اور عالم بھی سیاستدان بھی تھے اور اہل اقتدار بھی ان میں مزدور بھی تھے اور کسان بھی اور ان لمحوں میں مجھے یوں لگا جیسے ان سب کی ٹانگوں میں گوشت کا ایک ایک ٹکڑا باندھ کر انہیں شکار پر چھوڑ دیا گیا ہے اور وہ اس شکار کو اپنے پنجوں میں دبا کر اپنے آقا کے قدموں میں ڈھیر کرنے کے لئے گھروں سے نکلے ہیں آنکھوں پر بندھی پٹی اور ٹانگوں میں بندھی رسی والا شاہین مضطرب انداز میں اپنی گردن ادھر ادھر گھما رہا تھا میں نے اس شاہین کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں نے دیکھا اور کہا۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اتنے میں شاہین بیچنے والے شخص کے چہرے پر رونق سی آ گئی "وہ عرب شیخ آ گیا ہے دعا کریں بابو جی سودا ہو جائے!"

(۱۸ دسمبر ۱۹۸۳ء)

ضمیر کی تلاش

سید ضمیر جعفری کو اسلام آباد فون کرنے کے لئے میں نے نمبر گھمایا۔ دوسری طرف سے ریسور اٹھائے جانے پر میں نے کہا "ہیلو ضمیر صاحب ہیں؟"

"ضمیر؟ کون سا ضمیر؟ یہ ایک پولیس افسر کا گھر ہے" اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔

میں نے دوسری دفعہ نمبر گھمایا "ہیلو ضمیر صاحب ہیں؟"

"بھائی صاحب آپ گھاس تو نہیں چر گئے؟ یہ ایک بزنس مین کا گھر ہے یہاں کوئی ضمیر و میر نہیں ہے!"

اب کے میں نے ڈرتے ڈرتے نمبر گھمایا اور دل میں دعا کی کہ یا خدا ضمیر صاحب سے بات ہو جائے۔ اس دفعہ ایک عالم دین نے فون اٹھایا "لاحول ولا ایک تو رانگ نمبروں نے تنگ کیا ہوا ہے ارے میاں یہاں ضمیر کہاں سے آگیا؟ یہ مولوی سرکار علی کا گھر ہے!"

اگلی دفعہ نمبر ایک صحافی کے ہاں جا ملا "میں اچھی طرح جانتا ہوں یہ نمبر غلطی سے نہیں ملا آپ لوگ ضمیر ضمیر کی دہائی دے کر چاہتے ہیں کہ ہم لوگ بھوکوں مر جائیں؟ اگر آپ نے آئندہ فون کیا، تو مجھے پولیس کو رپورٹ درج کرانا پڑے گی"

میں نے گھبرا کر فون بند کر دیا۔

میں نے سوچا لائن میں خرابی ہے۔ اس طرح خواہ مخواہ پیسے ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کچھ دیر انتظار کر کے فون کرنا چاہئے۔ چنانچہ قریباً ایک گھنٹے بعد میں نے دوبارہ فون ملایا۔

"ہیلو ضمیر صاحب ہیں؟"

"جی ہاں ہیں! فرمائیے"

"جی ذرا ان سے بات کرنا چاہتا ہوں!"

"بھائی ضمیر کی باتیں اس طرح فون پر طے نہیں ہوا کرتیں۔ آپ کبھی گھر تشریف لائیے"

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں"

"سر میں کالعدم...... پارٹی کا راہنما بول رہا ہوں۔ آپ کی آواز خوب پہچانتا ہوں، آپ مارشل لاء ہیڈ کوارٹر سے بول رہے ہیں نا؟"

"جی...... جی...... " اور اس کے ساتھ ہی میں نے فون اس طرح بند کر دیا جیسے اچانک منقطع ہو گیا ہو!

اگلی دفعہ ایک صاحب اقتدار کے ہاں جا ملا

"ضمیر صاحب ہیں؟"

"آپ کو آج ضمیر کی یاد کیسے آگئی؟"

میں بہت خوش ہوا کہ اس دفعہ نمبر صحیح مل گیا ہے۔ "ہم اپنے ضمیر کو بھولے تو کبھی نہیں' البتہ اس دوران دنیاداری کے دھندوں سے فرصت نہیں ملی!"

"تو جہاں اتنے برس دنیاداری کے دھندوں میں آپ کو ضمیر یاد نہیں آیا مزید آئندہ کچھ عرصہ اس بے چارے کو زحمت نہ دیں!"

"یہ سن کر میں چونکا...... گویا دوسری طرف ضمیر صاحب نہیں ہیں" "آپ ضمیر صاحب نہیں ہیں؟"

"دیکھو میاں! یہاں کوئی ضمیر نہیں ہے۔ اگر تم کوئی سیاسی آدمی ہو تو کھل کر بات کرو' ورنہ بند کر دو' یہ رانگ نمبر ہے"

اور پھر رانگ نمبر پر میں نے انکم ٹیکس 'ایکسائز' بلدیہ' ہسپتال 'تعلیم اور اللہ جانے کن کن شعبوں کے افراد سے بات کی۔ ایک پیر صاحب سے بھی بات ہوئی مگر ہر ایک نے ضمیر کا سن کر ٹیلی فون بند کر دیا اس دوران میں نے ایک نسوانی آواز بھی سنی۔

"آپ ہم پر طنز کر رہے ہیں؟ ہم آپ لوگوں سے زیادہ باضمیر ہیں۔ ہم لوگ رشوت نہیں لیتے' چوری نہیں کرتے' سمگلنگ نہیں کرتے' یہ سب کچھ تو آپ لوگ کرتے ہیں اور پھر ہمارے پاس آتے ہیں۔ ہم تو نذر نیاز بھی دیتے ہیں۔ درگاہوں پر بھی جاتے ہیں۔ محرم کا بھی احترام کرتے ہیں۔ آپ لوگ کیا ہیں؟ ضمیر...... ضمیر؟ جب کسی کی جیب میں پیسہ نہ ہو' وہ ہمارے ساتھ ضمیر ہی کی بات کرتا ہے۔ مفت کے چسکے لیتے رہتے ہیں۔ بند کرو فون یہ گاہکی کا وقت ہے!"

اس صورت حال سے پریشان ہو کر میں نے سوچا کہ ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی بجائے اسلام آباد میں ڈاکٹر صفدر محمود کو فون کر کے کہنا چاہئے کہ وہ فون کر کے ضمیر صاحب کو میرا پیغام پہنچا دیں اور انہیں کہیں کہ اگر ہو سکے تو وہ مجھے لاہور فون کر لیں۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ساری داستان سنائی۔

"اب تم اندر کی بات بتاؤ" ڈاکٹر صفدر محمود نے آخر میں کہا

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ضمیر کی تلاش کا خیال تمہیں کیونکر آیا؟ بھولی ہوئی چیزیں انسان کو ایسے ہی یاد نہیں آیا کرتیں!" ڈاکٹر صفدر محمود نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر فون درمیان میں منقطع ہو گیا!۔

تھوڑی دیر بعد میرے فون کی گھنٹی بجی تو دوسری طرف سید ضمیر جعفری تھے صفدر محمود نے انہیں میرا پیغام دے دیا تھا میں نے انہیں بھی پوری کتھا سنائی۔ اس پر وہ ہنسے اور پھر بولے "تمہارے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہئے

تھا!"

"کیوں جی میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہونا چاہئے تھا؟"

"اس لئے کہ ہم سب لوگ ضمیر کی باتیں بہت کرتے ہیں مگر اس کے لئے کوئی قربانی نہیں دیتے۔ تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو۔ !"

"میں تو قربانی دیتا ہوں"

"ہاں بقر عید پر دیتے ہو۔ پچھلے سال تم نے ایک ران مجھے بھی اسلام آباد بھجوائی تھی!"

تب میں نے سوچا کہ یہ بزرگ تو میرے احوال سے پوری طرح واقف ہیں لہٰذا ان سے سیدھی بات کرنی چاہئے۔ چنانچہ میں نے کہا

"ضمیر کی بات تو میں ایسے ہی فیشن کے طور پر کر رہا تھا ورنہ یہ ضمیر وغیرہ سب معروضی اصطلاحات ہیں"

"ہاں! اب تم راہ راست پر آئے ہو مگر آخر میں ایک بات تو بتاؤ!"

"پوچھئے"

"یہ تم بیٹھے بیٹھائے ضمیر کے خلاف کیوں ہو گئے ہو؟"

"اس کی صرف ایک وجہ ہے" میں نے کہا "اور وہ یہ کہ ضمیر انسان کو برے کاموں سے نہیں روکتا صرف ان برے کاموں کا مزا کرا کرا کرتا ہے۔ فون پر جتنے لوگوں سے بھی میری بات ہوئی وہ پورے تواتر سے برے کام کرتے رہتے ہیں بس درمیان درمیان میں ضمیر ان کا مزا کرا کرتا رہتا ہے۔ اب رنگ میں بھنگ ڈالنے والی اس بے معنی سی چیز کے دفاع میں کیا بولا جائے؟"

(۴ نومبر ۱۹۸۴ء)

ہوئے تم دوست جس کے ....!

ایک انگریزی مقولے کے مطابق اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے اس مقولے کے درست ہونے کے بارے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کیونکہ یہ بات انگریزی میں کہی گئی ہے۔ تاہم قارئین سے التماس ہے کہ وہ ہماری صحبت سے پہچاننے کی کوشش نہ کریں اور خصوصی طور پر اس کالم کے حوالے سے ہمیں نہ پہچانیں تو ان کی مہربان ہوگی مثلاً گذشتہ دوستوں میں سے ایک دوست سرراہ ملے ہمیں ہجوم سے الگ لے گئے اور راز داری سے پوچھنے لگے مصروف نہیں ہو؟ ہم نے نفی میں جواب دیا تو سرگوشی کے انداز میں بولے "تو میرے ساتھ آجاؤ!" ہم نے غور سے ان کی طرف دیکھا تو ہم ڈر گئے اس وقت اس کے چہرے پر عجیب قسم کے تاثرات تھے انہوں نے ہماری کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے برابر میں کھڑے کوچوان کو اشارہ کیا کوچوان فوراً تانگہ لے کر آگیا یہ خاص "تماش بینوں" والا تانگہ تھا کوچوان کا حلیہ بھی بدنام قسم کے تانگوں کے کوچوانوں جیسا تھا۔ لمبی مونچھیں کاندھے پر رومال اور آنکھوں میں بے غیرتی! کوچوان نے گھوڑے کو چابک رسید کی اور شدید گرمی کی وجہ سے نسبتاً خالی سڑک پر بگٹٹ دوڑنے لگا۔ دوست نے کوچوان سے آہستگی سے پوچھا ئی جگہ ہے؟ "کہیں اس روز والی جگہ پر نہ لے جانا"

بے فکر رہیں جناب آپ اس سے پہلے وہاں کبھی نہیں گئے

"کوئی خطرہ نہیں" دوست نے پوچھا

"کیسی باتیں کرتے ہیں باؤ جی میں آپ کو ایسی ویسی جگہ پر کیوں لے جاؤں گا بالکل محفوظ جگہ ہے۔ آخر ہم عزت والے لوگ ہیں"۔

یہ سن کر ہمارے دوست کا کھنچا ہوا چہرہ کچھ نارمل ہو گیا ہم نے پوچھا "تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر خود ہی کہا "اب دوست کے ساتھ آ ہی گئے ہو تو بولنے کی ضرورت نہیں ویسے تمہیں ابھی پتہ چل جائے گا" تھوڑی دیر بعد تانگہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا ایک گلی کی نکڑ پر کھڑا ہو گیا۔

"نیچے آجائیں" کوچوان نے آہستگی سے کہا "میں اس گلی میں جا رہا ہوں آپ تھوڑی دیر بعد میرے پیچھے پیچھے آجائیں"

تین چار گلیوں کے موڑ مڑنے کے بعد کوچوان ایک خالی پلاٹ کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا۔ یہاں سیمنٹ کا

بنا ہوا ایک بڑا سارا سیوریج کا موگا پڑا تھا۔ جس کا دہانہ اتنا چوڑا تھا کہ اس میں ایک جوان آدمی صرف داخل ہی نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اس میں پوری سہولت سے بیٹھ بھی سکتا تھا۔

"یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے" ؟ ہمارے دوست نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا

"سب کچھ ہے میری سرکار سب کچھ ہے آپ مولا کے رنگ تو دیکھیں" کوچوان نے اپنے چہرے پر شیطانی سی مسکراہٹ بکھرتے ہوئے کہا اور پھر اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی دو انگلیاں ہونٹوں کے نیچے رکھ کر ہولے سے سیٹی ماری پلاٹ کے دوسرے کنارے پر بیٹھا ہوا ایک شخص جو ایک دس بارہ سال کے لڑکے کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔ سیٹی کی آواز سن کر چونکا اور پھر کوچوان کو دیکھ کر تیر کی طرح اس کی طرف آیا۔

"باؤ جی 'اپنے خاص آدمی ہیں تمہارے پاس آتے رہا کریں گے"

"کوئی بات نہیں بادشاہ ہم تمہارے نوکر ہیں" اور یہ کہہ کر وہ شخص موگے کے اندر گھس گیا تھوڑی دیر بعد وہ ایک پلیٹ میں چھ کباب اور چار سلائس ہاتھ میں پکڑے باہر نکلا اور بولا "چاہے تو آپ موگے کی دوسری طرف بیٹھ کر کھالیں اور چاہے اندر گھس جائیں کافی جگہ ہے۔ اللہ کے فضل سے پورے شہر میں رمضان المبارک کے مہینے میں کھانے پینے کیلئے اس سے محفوظ جگہ کوئی نہیں ہے۔

یہ واقعہ پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم نے کالم کے آغاز میں اپنے دوستوں کے حوالے سے جو معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا تھا تو ایسے ہی نہیں کیا تھا۔ کیونکہ ان کی وجہ سے ہمیں دن میں کئی مرتبہ شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ شرمندگی ہمیں اپنے روزہ خور دوستوں کی ہی وجہ سے نہیں اٹھانا پڑتی بلکہ ہمارے روزہ دار دوست بھی ہمارے لئے ندامت کا باعث بنتے ہیں۔ ان میں سے تو ایک ایسے ہیں کہ سحری کھانے کے فوراً بعد کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ آج روزہ بہت لگ رہا ہے دفتر آتے ہیں تو ہر ایک سے فرداً فرداً پوچھتے ہیں "تمہارا روزہ ہے ؟" اور اس کا جواب سنے بغیر کہتے ہیں "میرا تو ہے" موصوف صرف یہی نہیں کرتے بلکہ تھوڑی دیر بعد اپنی جگہ سے اٹھ کر نلکے کی طرف جاتے ہیں کلیاں کرتے ہیں زور زور سے غرارے کرتے ہیں۔ کھنگار پھینکتے ہیں اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہیں۔ اور واپسی پر ایک بار احتیاطاً فرداً فرداً سب سے پوچھتے ہیں "تمہارا روزہ ہے" ہمارے یہ دوست آگے پیچھے گفتگو کے دوران اپنے اور مخاطب کے درمیان ہمیشہ ایک "باعزت فاصلہ" رکھتے ہیں مگر رمضان کے مہینے میں بحالت روزہ اپنا منہ دوستوں کے منہ کے بالکل قریب لے جاتے ہیں۔ ہم نے ایک دفعہ ان سے کہا یہ تمہارے منہ سے بو آتی ہے ذرا فاصلے پر رہ کر گفتگو کیا کرو مگر انہوں نے یہ کہہ کر ہمیں چپ کرا دیا کہ اللہ تعالیٰ کو روزہ دار کے منہ کی بو پسند ہے اب انہیں کون بتائے کہ اللہ تعالیٰ والی بات تو ٹھیک ہے لیکن اس کے بعض نابکار بندوں کو یہ بو پسند نہیں لہٰذا ان گناہ گار بندوں کو اور گناہ گار کرتے ہو۔ مگر ان کا دبدبہ اتنا ہے کہ ہم یہ بات ان سے کہہ نہیں پاتے خصوصاً بحالت روزہ تو وہ چھانپڑ بھی رسید کر دیتے ہیں۔ اگر اگلے روز گھر پہنچ جاتے ہیں اور ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کے "یار معاف کر دو کل مجھ سے زیادتی ہو گئی میں دراصل روزے سے تھا تمہارا روزہ ہے ؟"

بخدمت جناب لیڈر صاحب

ہم آپ کے ممنون ہیں کہ ہم طلبہ کی درخواست پر آج آپ ہمارے ہاں تشریف لائے جناب والا! آج آپ کو اپنے درمیان موجود پاکر ہمارے جو جذبات ہیں ہم ان کی شدت لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے۔ اگرچہ آپ نے ہمیں کسی بھی موقع پر تنہا نہیں محسوس ہونے دیا اور ہر نازک موقع پر دامے درمے سخنے ہماری مدد فرمائی اور یوں روحانی طور پر آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے لیکن آج آپ کی جسمانی موجودگی نے ہمیں نیا حوصلہ اور نیا ولولہ دیا ہے جس کیلئے ہم آپ کے تہہ دل سے ممنون ہیں!

جناب والا! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم طلبہ گوناگوں مسائل سے دوچار ہیں اور اگرچہ ان مسائل کے حل میں آپ نے ہمیشہ ہماری مدد فرمائی ہے، لیکن اس کے باوجود کچھ مسئلے ایسے ہیں جو ابھی تک حل طلب ہیں، جن میں سے سرفہرست اسلحے کے حصول کا مسئلہ ہے۔ جناب والا! اسلحہ آج کے طالب علم کی بنیادی ضرورت ہے، چنانچہ جس قوم کے طلبہ اسلحہ کی دولت سے مالا مال نہ ہوں، وہ قوم کبھی ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بہ شانہ کھڑی نہیں ہو سکتی، جب کہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ آپ کے تعاون سے اسلحہ کیلئے موصول ہونے والی رقم اپنے طور پر گرانقدر ہونے کے باوجود موجودہ مہنگائی کے حوالے سے اس قدر کم ہے کہ اس میں چند کلاشنکوف ہی آسکتی ہیں چنانچہ ہماری کم مائیگی کا یہ عالم ہے کہ پانچ طلبہ میں سے ایک کے پاس صرف کلاشنکوف ہے، جب کہ باقی خود کار رائفلوں وغیرہ پر گزارا کر رہے ہیں۔ جناب والا آپ کے دشمنوں سے نپٹنے کیلئے جس جدید اسلحہ کی ضرورت ہے اس کی اہمیت سے آپ بخوبی واقف ہیں کیونکہ اس وقت ملک جس نازک دور سے گزر رہا ہے، اس معاملے میں ہماری ذرا سی غفلت ہمارے اور آپ کے لئے شدید نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔

جناب والا! اس وقت ہمارا بنیادی مسئلہ اسلحے کی کمی ہی نہیں بارود کے محدود ذخائر بھی ہیں جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہمیں نشانہ پکانے کیلئے روزانہ ہزاروں فائر کرنا پڑتے ہیں شام کو ہوسٹلوں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر ہم گھنٹوں نشانہ بازی کرتے ہیں جس سے نشانے میں مہارت کے علاوہ دشمنوں پر ہیبت طاری کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مگر چند ہی دنوں میں ہمارے بارود کے ذخائر ختم ہو جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ ارد گرد کی بستیوں میں رہنے والے لوگوں کو بھی شکایت کا موقع ملتا ہے کیونکہ اگر کسی روز ہم چاندماری کا ناغہ کریں تو وہ ذہنی طور پر کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہتے چنانچہ نہ انہیں نیند آتی ہے نہ پڑھا جاتا ہے نہ

لکھا جاتا ہے حتی کہ ہمسائے میں اگر کوئی مریض ہے تو اس کے لواحقین ہمارے پاس آکر درخواست کرتے ہیں کہ براہ کرم کہیں سے چار چھ کارتوس ادھار مانگ کر فائرنگ کروادیں تاکہ مریض کو نیند آجائے جناب والا! ایسے مواقع پر ہمیں سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا جناب والا سے درخواست ہے کہ ہمارے بارود کے ذخائر میں اضافہ کیلئے مثبت اور فوری اقدام کریں اور اگر ممکن ہے تو اس ایجنسی سے ہماری براہ راست بات کروادیں جو اس ضمن میں آپ سے تعاون کرتی ہے۔

جناب والا! ہم ایک اور شکائت آپ کے نوٹس میں لانا چاہتے ہیں اور وہ پولیس کے رویئے کے بارے میں ہے جناب والا! طلبہ بھی اسی معاشرے کے فرد ہیں اور انہیں بھی روزگار کے بہتر وسائل تلاش کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا اس ملک میں رہنے والے دوسرے شہریوں کا ہے۔ لیکن جناب والا! اگر کوئی طالب علم اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر رات کو تلاش رزق میں نکلتا ہے تو پولیس والے اسے اس کے حق سے محروم کر کے ڈاکہ زنی وغیرہ کے الزام میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ اور پھر اخبارات کے ذریعے اس کی پبلسٹی بھی کرتے ہیں اسی طرح بسوں اور ویگنوں کے مالکان جس طرح لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے شریف شہریوں کی جان جس طرح عذاب میں ہے آپ اس سے بھی واقف ہیں۔ لیکن طلبہ ان کی ہوس زر کو روکنے کے لئے اگر ان پر جرمانہ کرتے ہیں تو اس پر بھی واویلہ کیا جاتا ہے اور اسے جگا ٹیکس کا نام دیا جاتا ہے۔ جناب والا! آپ سے درخوست ہے کہ اپنے بے پایاں اثرورسوخ سے کام لیتے ہوئے طلبہ کی کردار کشی کی یہ مہم ختم کروائیں۔

جناب والا! آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ ہماری شکایات کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ مگر ہم کیا کریں ہمارا سینہ داغ ہے ہمارے ساتھیوں پر قتل کے جھوٹے مقدمے بنائے گئے ہیں۔ اگرچہ جناب کی طرف سے اس ضمن میں تمام اخراجات برداشت کئے جارہے ہیں۔ مگر ان مقدموں کی وجہ سے جو ذہنی پریشانی ہوتی ہے اس سے بہت سے دوسرے مثبت کام متاثر ہوتے ہیں کیونکہ جناب والا! ایسے کاموں کے لئے مکمل ذہنی یکسوئی بہت ضروری ہے۔ تاہم اس وقت ملک میں معرکہ حق باطن گرم ہے۔ ہم طلبہ آپ کی رہنمائی میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں گے۔ تاوقتیکہ جب کہ حق وباطل دونوں نیست ونابود ہو جائیں کیونکہ اس کی وجہ سے پوری انسانیت ایک عذاب میں مبتلا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ نام نہاد محب الوطن ہماری سرگرمیوں کو شک و شبہے کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مگر جناب والا! اس سے کیا فرق پڑتا ہے انسان کو پریشان کرنے والی اصل چیز تو ضمیر ہوتی ہے اور ہم اور آپ دونوں جانتے ہیں کہ ضمیر ایک بوگس طرز احساس کا نام ہے، جو ہمیشہ افراد کی ترقی میں حائل ہوتا ہے۔